تزکیۂ نفس
کامل
حصہ اول
تالیف:
مولانا امین احسن اصلاحی
urdukutabkhanapk.blogspot

تزکیۂ نفس

حصہ اوّل

مفسرِ قرآن

از :۔ مولانا امین احسن اصلاحی

واحد تقسیم کار

کشمیر بکڈپو چنیوٹ بازار فیصل آباد

فون نمبر:۔ 640320

ملک سنز تاجران کتب کارخانہ بازار فیصل آباد

فون نمبر:۔ 644375

قیمت:۔ ۱۰۵ روپے

آفسٹ ایڈیشن ۱۹۹۴ء

قیمت ——— -/۱۰۵ روپیے

مطبع ——— المطبعة العربیة
۳۰ - [illegible]

ناشر ——— کشمیر بکڈپو چنیوٹ بازار
فیصل آباد

تزکیۂ عمل ۲۱۷

نماز اور آفاتِ نماز ۲۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

میری اس کتاب کا حصہ اول ۱۹۵۷ء میں چھپا تھا لیکن وہ اتنی محدود تعداد میں چھپا کر کتاب کے قدردانوں کی طلب اس سے کسی طرح پوری نہ ہو سکی۔ بعد میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ نہ تو اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی کوئی خاطر خواہ شکل پیدا ہو سکی اور نہ میں اس کے بقیہ دو حصوں کی جن کا میں نے وعدہ کیا تھا تکمیل کے لیے وقت نکال سکا۔ اب خدا خدا کر کے اس کے دوسرے حصہ کی تکمیل کی نوبت آئی ہے تو ان دونوں حصوں کی یکجا اشاعت کا اہتمام کیا اور کتاب کے اس کے قدردانوں تک پہنچنے کی شکل پیدا ہوئی۔

یہ کتاب میرے تربیتی لیکچروں کا مجموعہ ہے لیکن یہ لیکچر ایک تصنیف کا خاکہ سامنے رکھ کر دیئے گئے اس وجہ سے ان میں پوری تصنیفی ترتیب موجود ہے۔ فکری اعتبار سے یہ کتاب میرے دینی فکر کا لبِ لباب ہے۔ برسوں کے فکر و مطالعہ سے دین و شریعت کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے اس کا ایک حصہ میں نے ان اوراق میں الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا بقیہ حصہ میرے دل و دماغ کے اندر محفوظ ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ اس کے پیش کرنے کی نوبت کبھی آتی ہے یا نہیں۔ اس کے پہلے حصہ میں میں نے تزکیۂ علم سے بحث کی ہے اور دوسرے حصہ میں تزکیۂ عمل سے۔ تزکیہ معاملات و تعلقات کے مباحث ابھی قلمبند نہیں ہو سکے۔

میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تزکیۂ نفس کے وہ اصول و مبادی ان شاء اللہ سامنے آجائیں گے

جو کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں اور ساتھ ہی وہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی جو غلط قسم کے تصوف کی راہ سے ہمارے اندر پھیلی ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع وہی ہے جو تصوف کا موضوع ہے اس وجہ سے مجھے جگہ جگہ اس میں مروجہ تصوف پر تنقید بھی کرنی پڑی ہے۔ ممکن ہے یہ تنقید ان لوگوں کو کچھ ناگوار ہو جو اپنے اپنائے ہوئے کسی طریقہ پر کسی تنقید کے برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں لیکن ایک غیر جانبدار قاری ان شاء اللہ میری کسی تنقید کو بھی تحقیقِ حق اور حمایت کتاب و سنت کے جذبہ اور کوشش سے خالی نہیں پائے گا۔ اگر تحقیقِ حق کی اس کوشش میں کہیں میرا قلم حق سے منحرف ہو گیا ہے تو مجھ سے زیادہ اس کی اصلاح کا خواہشمند کوئی اور نہیں ہو گا۔ جو صاحب علم بھی میری اس طرح کی کسی لغزش سے آگاہ فرمائیں گے میں ان کا دل سے ممنون ہوں گا اور کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر دوں گا۔ اس کتاب کے بعض مباحث پر اب تک بعض لوگوں نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ میں نے توجہ سے پڑھ لیے ہیں ان میں کوئی بات مجھے ایسی نہیں ملی جو قابلِ لحاظ ہو۔ بعض لوگ تصوف کی حمایت میں تو بڑے سرگرم ہیں لیکن ان کو نہ تصوف کی خوبیوں کا پتہ ہے، نہ اس کی کمزوریوں کا۔ اس طرح کی بے خبرانہ تنقیدوں سے تحقیقِ حق کے مقصد میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اس کتاب کو پڑھتے وقت ہر شخص کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ایک کتاب زیادہ سے زیادہ جو خدمت انجام دے سکتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے موضوع پر قاری کے لیے ذہنی و فکری غذا فراہم کر دے۔ یہ کتاب اگر کسی حد تک بھی یہ خدمت انجام دے سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ رہا اس کے پیش کردہ نقشہ کے مطابق زندگی کو تبدیل کرنا تو یہ آدمی کے اپنے ارادہ اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ جو لوگ اس کتاب کو صرف پڑھ لینے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیں بلکہ اپنی زندگیوں کو سنوارنا بھی چاہیں انہیں تین باتوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

پہلی چیز اصلاح اور تبدیلی کا سچا اور پکا ارادہ ہے۔ آدمی کا ارادہ اگر مضبوط نہ ہو اور وہ اس ارادہ سے کام نہ لے تو دنیا کی بہتر سے بہتر رہنمائی بھی اس کے لیے بالکل بے سود ہے۔ قرآن سے بہتر کتاب دنیا میں اور کیا ہو سکتی ہے لیکن اس کا نفع بھی انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے عزم بالجزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان لوگوں کو اس سے کوئی نفع بھی نہیں

ں کی فصاحت و بلاغت کی تعریف میں بہت رطب اللسان رہتے ہیں لیکن اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا ارادہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ تصوف کی اصطلاح میں جس کو مرید کہا جاتا ہے، میرے نزدیک اس سے بھی مراد درحقیقت وہی شخص ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اس راہ میں ہر صعوبت خوش دلی کے ساتھ جھیلنے، ہر قربانی پیش کرنے اور جان و مال کی بازی کھیل جانے کے لیے ذہناً مستعد ہے جس مرید میں اس طرح کا ارادہ نہ پایا جاتا ہو وہ فی الحقیقت مرید ہی نہیں ہے۔

یہاں اس حقیقت کو خوب ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ارادہ اور خواہش میں بڑا فرق ہے بعض لوگ خواہش ہی کا نام ارادہ رکھ لیتے ہیں اور اس سے وہی کچھ امیدیں باندھتے ہیں جو صرف ارادہ ہی سے باندھی جانی چاہئیں اور جو ارادہ ہی کی قوت سے پوری ہوتی ہیں۔ خواہش تمنّا تو ہر مطلوب چیز کی کرتی ہے لیکن چوٹ کھانے کے لیے کسی چیز کے واسطے بھی تیار نہیں ہوتی لیکن ارادہ جس چیز کا طلب گار ہوتا ہے اس کی راہ میں ہر بوجھ برداشت کرنے اور ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو کر اس کا طلب گار بنتا ہے۔

دوسری چیز جو ضروری ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ہر آن استعانت ہے جو شخص خدا کی بندگی کے ارادہ کے ساتھ اٹھتا ہے اس کی ہر قدم پر آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس ارادہ میں مخلص ہے یا ریاکار۔ ان آزمائشوں سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق حاصل ہو۔ اگر خدا کی راہ پر چلنے کے لیے نکلے وہ ہر قدم پر اس کی مدد کے لیے دعا کرتا رہے۔ سورۂ فاتحہ میں ایاک نعبد کے ساتھ ایاک نستعین جو آیا ہے اس میں بھی یہی نکتہ ہے کہ خدا کی بندگی کا ارادہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل نہ ہو۔

تیسری چیز جس کا اہتمام ضروری ہے وہ صحبت ہے۔ صحبت سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب اس راہ پر چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اسے اپنے ہم سفر تلاش کرنے چاہئیں۔ ساتھیوں اور رفیقوں سے آدمی کی قوت و ہمت میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔

ہم سفر قوی بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی لیکن ان کی قوت اور کمزوری دونوں ہی آدمی کے لیے سہارا بنتی ہے۔ جب کبھی وہ ہمت ہارنے لگتا ہے تو قوی کی عزیمت اس کی ہمت بندھاتی

ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اپنی خستگی اور توانائی کو دیکھ کر وہ مایوس ہونے لگتا ہے تو دوسرے خستگانِ راہ کو دیکھ کر اسے تسلی ہو جاتی ہے کہ تنہا وہی اس راہ کی صعوبتوں سے دوچار نہیں ہے بلکہ کچھ درماندگانِ راہ اور بھی ہیں اور اسی طرح وہ بھی کبھی کسی کی قوت اور کبھی کسی کی کمزوری سے سہارا لیتا ہے اور دوسروں کو سہارا دیتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔

یہ رفاقت استاذ اور مرشد سے بھی حاصل ہوتی ہے اور ہم مسلک و ہم مشرب ساتھیوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ حاضر بھی اس معاملہ میں دستگیری کرتا ہے اور ماضی بھی آدمی کو سہارا دیتا ہے۔ زندوں اور مردوں میں جن کو بھی وہ اپنا دردآشنا پائے، ان کی معیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

جن کو عملاً ساتھ لینا یا جن کے ساتھ چلنا ممکن ہو اُن کو عملاً اپنے ساتھ لگائے یا اُن کے ساتھ چلے اور جن کے صرف کارناموں اور سرگذشتوں سے روحانی غذا حاصل کرنا ممکن ہو اُن سے ذہنی و روحانی ربط بڑھائے، اس طرح وہ کبھی تنہائی یا دل شکستگی نہیں محسوس کرے گا۔

یہ رفاقت و معیت اتنی ضروری چیز ہے کہ بسا اوقات اس کے لیے آدمی کو اپنوں سے کٹنا اور غیروں سے جڑنا بھی پڑتا ہے۔ یہ مرحلہ نفس پر بڑا شاق ہوتا ہے لیکن تزکیۂ نفس کے جہاد میں کسی نہ کسی درجہ میں یہ ہجرت بھی ناگزیر ہے۔ کتاب کے دوسرے حصہ کے مباحث جب سامنے آئیں گے تو یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گی کہ تعلقات کے تزکیہ میں اس ہجرت کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور کس طرح یہ ہجرت ہر طالبِ تزکیہ کے لیے آج بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح کبھی پہلے تھی۔

اس کتاب میں ایک خاص چیز جو ہر پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں محسوس کرے گا وہ یہ ہے کہ میں نے تزکیہ کو زندگی کے تمام اطراف پر حاوی کر دیا ہے۔ تصوف میں تزکیہ زندگی کے ایک نہایت محدود گوشہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن کتاب و سنت میں جس تزکیہ کا بیان ہے وہ ہماری زندگی کے ہر گوشہ سے بحث کرتا ہے، اس سے میری مراد صرف انفرادی زندگی ہی کا ہر گوشہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے نفس کے تزکیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ خدا کے ساتھ اس کا تعلق چند متعین اساسات پر قائم ہو

جب تک ان اساسات پر اس کا تعلق خدا کے ساتھ نہ ہو اس کا تزکیہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح ایک شخص کے نفس کے تزکیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ، حکومت اور بنی نوع انسان کے ساتھ بھی اس کے تعلقات چند متعین اساسات پر قائم ہوں، بغیر اس کے اُس کے نفس کا تزکیہ ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی شخص کے صاحب تزکیہ ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ ذاکر و شاغل اور زاہد و مرتاض ہو بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے میرے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرہ کا ایک خدمت گزار فرد اور اپنی ریاست کا اسلامی مفہوم میں ایک فرض شناس شہری بھی ہو۔

بعض لوگوں کو یہ باتیں ابتداءً کچھ انوکھی سی معلوم ہوں گی لیکن مجھے توقع ہے کہ اگر وہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو ان کا سارا تعجب رفع ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کے مؤلف کو بھی اپنے نفس کی اصلاح کی توفیق حاصل ہو، اور دوسرے پڑھنے والوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچے اور اگر اس میں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے تو اس کے ضرر سے اس کے مؤلف کو بھی محفوظ رکھے اور اس کے ناظرین کو بھی۔

امین احسن اصلاحی

لاہور۔ ۱۸ / جنوری ۱۹۶۱

دین میں تزکیۂ نفس کی اہمیّت
اور
اُس کی عمُومی ضرورت

انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد؟ اگر یہ سوال کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا حقیقی مقصود کیا ہے ؟ وہ کیا غرض ہے جس کے لیے اس نے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا اور شریعت اور کتابیں نازل فرمائیں ؟ تو اس کا صحیح جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ــــــ نفوسِ انسانی کا تزکیہ ــــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے جو دعا فرمائی، اس میں آپ کی بعثت کی اصلی غایت یہی بیان فرمائی ہے کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کریں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔	اور اے ہمارے رب! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

(بقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے مطابق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے آپ کی بعثت اور اس کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا :

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا	چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں
عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ	سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم	اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب
مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝	و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ
(بقرہ ۱۵۱)	باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اسی طرح سورۂ جمعہ میں آپ کی بعثت اور اس کے اغراض و مقاصد کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل پر ان الفاظ میں احسان جتایا ہے :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا	وہی خدا ہے جس نے امیوں (بنی اسمٰعیل)
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ	میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان
يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور
وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي	ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور
ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝	حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک اس
	سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں جہاں تزکیہ کا ذکر آیا ہے وہیں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت کا بھی ذکر آیا ہے تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد صرف تزکیہ ہی کو کیسے قرار دے دیا؟ آخر دوسری چیزیں بھی تو اسی اہمیت کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں وہ کیوں اصل مقصد قرار پانے کی مستحق نہیں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے اسلوب بیان نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مذکورہ آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مقصد بعثت کی حیثیت سے جس چیز کا ذکر ہوا ہے وہ تزکیہ ہے۔ باقی اس کے ساتھ دوسری چیزیں — تلاوت آیات اور تعلیم کتاب و حکمت — جو مذکور ہوئی ہیں تو وہ اصل مقصد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اصل مقصد کے وسائل و ذرائع کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا دونوں

آیتوں میں سے ایک آیت (آیت - ۱۲۹) میں تزکیہ کا لفظ سب سے آخر میں آیا ہے اور دوسری آیت (آیت - ۱۵۱) میں سب کے شروع میں آیا ہے - ایک غور کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہی بات کے بیان کرنے میں اسلوب کا یہ ردوبدل کم از کم قرآن مجید میں بلا وجہ نہیں ہو سکتا اب غور کیجیے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ؟ ہماری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس تقدیم و تاخیر سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نبیؐ کی تمام جدوجہد اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصود دراصل تزکیہ ہی ہے۔ کیوں کہ اصل مقصد ہی کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ شروع میں بھی ایک کام کرنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی ــــ وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بھی ہوتا ہے اور وہی نقطۂ اختتام بھی ــــ وہیں سے وہ اپنا سفر شروع بھی کرتا ہے اور وہیں اس کو ختم بھی کرتا ہے۔

کسی اسکیم کے اندر جو چیز مقصدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ عمل میں اگرچہ مؤخر ہوتی ہے لیکن ارادہ اور خیال میں مقدم ہوتی ہے - آپ ایک مکان کی تعمیر سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سکونت کی راحت ہے اور یہ چیز عین اس وقت بھی آپ کے سامنے ہوتی ہے جب کہ آپ ایک مکان کا نقشہ ابھی کاغذ کے صفحہ پر بنا رہے ہوتے ہیں - حالاں کہ عملاً یہ چیز حاصل اس وقت ہوتی ہے جب مکان بن چکتا ہے اس پہلو سے دیکھیے تو مکان کی تعمیر سے جو اصل مقصد ہے (یعنی سکونت کی راحت) وہ شروع میں بھی آپ کے پیشِ نظر ہے اور آخر میں بھی پیش نظر ہے - فرق صرف یہ ہے کہ شروع میں آپ نے اس کو فکراً اور ارادتاً سامنے رکھا ہے اور آخر میں نتیجتاً اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ایک مکان کی تعمیر کے لیے پہلی اینٹ زمین پر جماتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس سے سکونت کی لذت و راحت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت بھی کہہ سکتے ہیں جب کہ تمام مراحل تعمیر سے گزر کر اس کے کوٹنے کی آخری اینٹ بھی رکھی جا چکی ہو کیوں کہ درحقیقت یہی چیز ہے جو آپ کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں شروع سے آخر تک پیش نظر رہی ہے - ظاہر میں آپ نے پھاوڑے بھی چلائے، اینٹیں بھی پکائیں آرے بھی چلائے، چونا اور گارا بھی فراہم کیا، دیواریں بھی چنیں اور چھتیں بھی پاٹیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہٖ آپ کا مقصود نہیں رہی ہے - اس تمام کھکیڑے سے اصل مقصد درحقیقت

آپ کا یہ تھا کہ آپ کو سکونت کی آسائش حاصل ہو۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر آپ اگر انبیاء کی بعثت کے مقصد کو سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد تو لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی ہوتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ اپنی تمام دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کرتے ہیں لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو اس مقصد کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں، اس کے لیے وہ حکمت کا درس دیتے ہیں۔ مگر مقصود ان سارے کاموں سے صرف تزکیہ ہوتا ہے جو شروع میں بھی ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی وہی ان کی تمام جدوجہد کی غایت بنتا ہے چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے مذکورہ بالا آیات میں سے ایک آیت میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سرگرمیوں کے نقطۂ آغاز کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے اور دوسری آیت میں اس کی غایت اور منتہا کی حیثیت سے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں اس بات کی بھی صاف تصریح موجود ہے کہ تزکیہ ہی وہ اصل کام ہے جس کے لیے لوگوں کو نبی سے رجوع کرنا چاہیے اور نبیؐ کا فرض ہے کہ جو لوگ اس غرض کے لیے اس سے رجوع کریں، ان کو وہ ہرگز مایوس نہ کرے، چنانچہ ایک موقع پر بعض اسباب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طالبِ تزکیہ کے معاملے میں تھوڑی سی غفلت ہو گئی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مندرجہ ذیل الفاظ میں تنبیہ فرمائی گئی:

عَبَسَ وَتَوَلّٰى ، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى	اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ اس
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى	کے پاس نابینا آیا، اور تمہیں کیا خبر،
(عبس)	شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو۔

اس آیت سے بالکل صاف واضح ہو رہا ہے کہ نبی، خلقِ خدا کی جس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ ان کے نفوس کا تزکیہ ہے، اس وجہ سے لوگوں کو یہ حق ہے کہ اس غرض کے لیے اس سے رجوع کریں اور نبیؐ کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرے۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ قرار دیا

گیا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا بھی اصلی مقصد اسی چیز کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:۔

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی فَقُلْ ھَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی۔ (۱۷-۱۸- نازعات)

فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس سے کہو کہ ہے تیرے اندر کچھ رغبت کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔

پھر یہ حقیقت بھی قرآن مجید سے ثابت ہے کہ تزکیہ ہر شخص کی فلاح و نجاتِ آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ تزکیہ کی یہ اہمیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ یہی چیز انبیاء کی بعثت کی غایت اور ان کی تمام سرگرمیوں کا محور و مقصد قرار پائے، چنانچہ قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات و فلاح منحصر ہے تمام تر اس بات پر کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ فرمایا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔ (شمس)

اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرے اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کی گندگیوں پر پردہ ڈالا۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی۔ (الاعلیٰ)

اس نے فلاح پائی جس نے تزکیہ حاصل کیا۔

ظاہر ہے کہ جب آخرت میں انسان کی نجات و فلاح تزکیہ حاصل کرنے پر منحصر ہوئی تو انبیاء علیہم السلام کا، جو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اصلی کام یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں اور ان کو تزکیہ حاصل کرنے کے طریقے بتائیں۔

اوپر کے مباحث سے تین باتیں واضح ہوئیں:۔

ایک یہ کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور تمام انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصود ہے، دین میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے وہ اہمیت دوسری کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہے۔

دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ چیز غایت و مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سرگرمیاں، خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو رکھتی ہوں لیکن باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرہ کے تزکیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا سرچشمہ اور اس کا منبع و مصدر کتاب اللہ ہے، اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اسی کے اسرار و حقائق ہیں جو نبی صلی اللہ کے ذریعہ سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی نکتہ ہے کہ سورہ بقرہ اور سورہ جمعہ کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں، ان میں تزکیہ کو تلاوتِ آیات کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا ہے کہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ تزکیہ درحقیقت تلاوتِ آیات ہی کے ثمرات و نتائج میں سے ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ — تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ — ان کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ تزکیہ کا عمل انسانی معاشرہ کے کسی خاص گروہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام افراد اور تمام گروہوں بلکہ پورے معاشرہ سے یکساں طور پر ہے، کوئی شخص بھی اس کے بغیر آخرت میں نجات اور فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی حیثیت دین میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہ نجات اور فلاحِ آخرت کے لیے ایک ضروری شرط ہے جس کو پورا کیے بغیر کوئی شخص جنّت میں نہیں داخل ہو سکتا۔

تزکیہ کا علم نہ راز ہو سکتا ہے نہ نامکمّل:

اگر یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر ثابت ہیں (اور کوئی شخص بھی ان کے ثابت ہونے سے انکار نہیں کر سکتا) تو ان سے دو نتیجے لازمی طور پر نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تزکیہ کے علم کو نامکمل چھوڑ کر دنیا سے تشریف نہیں لے جا سکتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیہ کو آپ کے مقاصدِ بعثت میں محض ایک ضمنی جگہ حاصل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا، اصل مقصدِ بعثت یہی ہے۔ پھر جو چیز اصل مقصدِ بعثت ہو، اس کو پیغمبر ناتمام اور ناقص چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ تزکیہ کی اس اہمیت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح شریعت کے تمام اُصول کتاب وسنت کے اندر منضبط کر دیے گئے ہیں، اسی طرح تزکیہ کے تمام اصول بھی کتاب وسنت کے اندر منضبط ہوں، جس طرح شریعت کے اندر کسی بے راہ روی کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی کسی بے راہ روی کی گنجائش باقی نہ رہے، جس طرح شریعت کے اندر ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود کسی شخص کو اس بات کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے ذوق یا ذاتی رجحانات یا اپنے شخصی تجربات کو اس کے اندر گھسا دے اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی ایک خاص دائرہ میں اجتہاد کی آزادی کے باوجود ایسی حد بندیاں ہونی چاہئیں کہ اشخاص و افراد کے اپنے میلانات و رجحانات کی دراندازیوں کے لیے کوئی منفذ باقی نہ رہے۔ جس طرح شریعت کے اندر ہر مجتہد اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کتاب وسنت ہی کے اشارات کی کسوٹی پر پرکھتا اور پرکھواتا ہے اور اس کے بغیر اس کا اجتہاد بھی لائقِ قبول نہیں ٹھہرتا، اسی طرح تزکیہ کے اندر بھی اگر کوئی شخص کوئی بات اپنے اجتہاد سے کہے تو اس کے لیے ناگزیر ہو کہ وہ کتاب وسنت کے اشارات اور نبی ﷺ اور صحابہؓ کے طرزِ عمل سے کوئی دلیل لائے۔ محض اپنے ذوق و وجدان کا حوالہ نہ دے ورنہ اس کے اجتہاد کا کوئی وزن نہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تزکیہ کا علم کوئی راز نہیں ہو سکتا جو صرف خاص خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو اور انہی سے سینہ بسینہ وہ دوسروں کو منتقل ہو۔ تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے، ہر شخص آخرت کی نجات و فلاح کے لیے اس کا محتاج ہے۔ انبیاءؑ آئے ہی اس لیے ہیں کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی تزکیہ کریں۔ پھر جو چیز اس قدر عمومی ضرورت کی ہو، اس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص، ہر علم کا اہل نہیں ہوا کرتا، اس وجہ سے اگر ایک شخص اس علم کا

ذوق رکھنے والا نہ ہوگا تو وہ اس سے محروم رہے گا، علی ہذا القیاس اہلِ علم میں فرقِ مراتب بھی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجہ کے نہیں ہو سکتے، لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی "پراسرار" علم ہے جس کے جاننے والے صحابہؓ کے زمانہ میں بھی چند ہی افراد تھے اور بعد میں بھی خال خال افراد ہی ہوئے۔ جو چیز ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے لیے ضروری ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہونے پائے اور یہ دو ایک آدمی بھی اس کو عام کرنے کی بجائے، اس کو راز بنا کر رکھ چھوڑیں اور صرف انہی اشخاص پر اس راز کو کھولیں جو ان کے محرمِ راز بن جائیں۔ علمِ کیمیا کی تعلیم میں تو یہ رازداری چل سکتی ہے لیکن تزکیہ اگر عام ضرورت کی چیز ہے (اور اس کی عام ضرورت کی چیز ہونے سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے) تو اس میں اس رازداری کا چلنا نہ ممکن ہے اور نہ قرینِ مصلحت۔

ہمارے حنفی علمائے عام ضرورت کی چیزوں میں عموماً خبرِ احاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کا تعلق عام ضرورت سے ہے اس کے بارہ میں ایک دو طریقوں سے روایت کے کیا معنی؟ لیکن یہی حضرات جب تصوّف کے کوچے میں آتے ہیں تو تزکیہ کے علم کو ایک راز ثابت کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ان باتوں کو اہلِ ظاہر کیا جانیں یہ "اسرار و مواجید" ہیں۔ وہ اس فخر کے نشہ میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر تصوف کا منشا تزکیۂ نفس ہے تو تزکیۂ نفس تو ایک عام ضرورت کی چیز ہے پھر ایک عام ضرورت کا تقاضا ایک ایسے علم سے کیسے پورا ہو سکتا ہے جو صرف چند سینوں کا ایک راز ہو۔

بعض احادیث سے غلط استدلال

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس سے وہ نتائج نہایت بدیہی طور پر نکلتے ہیں جو ہم نے نکالے ہیں اور عقلِ عام بھی انہی کی تائید کرتی ہے لیکن ہمارے اہلِ تصوف حضرات اس علم کو ایک پُراسرار علم ثابت کرنے پر نہایت مُصر ہیں، وہ اپنے اس دعوے پر

جہاں بہت سے مشائخ تصوف کے اقوال سے دلیل لاتے ہیں وہاں بعض احادیث اور بعض آثار بھی پیش کرتے ہیں۔ مشائخ تصوف کے اقوال واشارات سے تو یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن جن احادیث و آثار سے انہوں نے استدلال کیا ہے، ان کی حقیقت واضح کرنا ہمارے لیے ضروری ہے ورنہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹک باقی ہی رہے گی۔

ان حضرات کا سب سے بڑا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت سے ہے جو بخاری شریف میں مندرجہ ذیل الفاظ میں وارد ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فاما احدھما فبثثتہ فیکم فاما الاخر فلو بثثتہ لقطع ھذا البلعوم (بخاری)	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو ظرف اکٹھے کیے تھے، ایک ظرف کا علم تو میں نے تمہارے اندر پھیلا دیا رہا دوسرا ظرف تو اگر اس کے علم کو میں تمہارے اندر پھیلاؤں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔

اس حدیث سے یہ حضرات ثابت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ ایک ایسا ذخیرۂ علم بھی تھا جس کی حیثیت بالکل ایک سر مخفی کی تھی، جس کے حقائق اور باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہ تھا بلکہ صرف خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ علم ان حضرات کے خیال کے مطابق جمہور کے فہم اور ان کے مذاق و رجحان سے اس قدر مختلف بلکہ اس کے مخالف تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ ڈرتے تھے کہ اگر اس علم سے وہ پردہ اٹھا دیں تو لوگ ان کو جیتا نہ چھوڑیں۔

یہ نتائج نکال کر ان سے جو اثر یہ حضرات پیدا کرتے ہیں وہ ان نتائج سے بھی زیادہ اہم اور دور رس ہے جن کی آڑ لے کر یہ حضرات تصوف اور آئمہ تصوف کی ان ساری باتوں کو عین دین ثابت کرنا چاہتے ہیں جن کا کتاب و سنت سے کوئی جوڑ نہیں لگتا اور

جن پر اہل حق ہمیشہ نکیر کرتے رہے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اہلِ تصوف کے اسرار و کشوف کے لیے دین میں بڑی گنجائش نکل آتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ علمِ دین صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا قرآن و حدیث میں نظر آتا ہے بلکہ علمِ دین کا بہت بڑا حصہ عوام کے اندیشوں سے خواص کے سینوں ہی میں محفوظ رہا اور اگر ان سے منتقل ہوا بھی تو صرف خواص ہی تک محدود رہا۔ عام اہلِ علم کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے پائی، عام اہلِ علم جنہوں نے قرآن و حدیث کے الفاظ و کلمات کے واسطہ سے دین کو سیکھا ہے وہ تو صرف علم بالاحکام کے وارث ہوئے ہیں۔ اصلی علم تو علم باللہ ہے اور اس کی وراثت صرف ان لوگوں کو منتقل ہوئی ہے۔ جنہوں نے اس علمِ سینہ میں سے کوئی حصہ پایا ہے۔

یہاں سے یہ حضرات ایک قدم اور آگے بڑھا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اہل حقیقت اور اہل ظاہر کے معیارات بالکل الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک کی باتوں کو دوسرے کی کسوٹیوں پر جانچنا اصولی طور پر غلط ہے، اہل ظاہر جو کچھ کہتے ہیں وہ الفاظ کو دیکھ کر کہتے ہیں اور اہلِ حقیقت کی نگاہیں معانی کی راز داں ہوتی ہیں ؎

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ اثرات جو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خاصے سنگین ہیں اور ان کی زد ہماری پوری شریعت پر پڑتی ہے، اس وجہ سے نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کا صحیح مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ کے اس قول کے تین پہلو ہو سکتے ہیں:

ایک پہلو تو یہ ہو سکتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو جب یہ باتیں بتائی ہوں تو ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہو کہ یہ دوسروں کو بتانے کی نہیں ہیں بلکہ پوشیدہ رکھنے کی ہیں، اگر تم نے ان کو ظاہر کیا تو یہ اندیشہ ہے کہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔

---

[1] اس کی مثالیں مناسب مواقع پر ہماری اس کتاب میں آئیں گی۔

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں بطور راز کے تو نہ بتائی ہوں بلکہ تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے بتائی ہوں لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی ہی میں ماحول اس قدر بدل چکا ہو کہ وہ باتیں لوگوں کے لیے بالکل اوپری بن کے رہ گئی ہوں اور ان کو پیش کرنا پیش کرنے والے کے لیے خطرے سے خالی نہ رہ گیا ہو۔

تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی ہوں جن کے بیان و اظہار میں وقت کے ارباب اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔ اس وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ باتیں وہ بیان کرنی شروع کر دیں تو وقت کے ارباب اقتدار کے ہاتھوں ان کی جان کی خیر نہ رہے۔

اب عقل و نقل اور روایت و درایت سے ان تینوں پہلوؤں کو جانچیئے اور پرکھیئے کہ ان میں سے کون سا پہلو واضح نظر آتا ہے۔

۱۔ ان میں سے پہلی صورت تو بداہتہً غلط معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ اس طرح کی پُراسرار باتوں کا کوئی ذخیرہ اگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ کرنا ہی ہوتا تو اس امانت کے لیے موزوں ترین سینہ اُن فقہا صحابہؓ میں سے کسی کا ہو سکتا تھا جو فہم و فقاہت اور راز داری دین ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہ میں ممتاز تھے۔ اس کے لیے موزوں شخص حضرت ابو بکرؓ ہو سکتے ہیں، حضرت عمرؓ ہو سکتے تھے، حضرت عثمانؓ ہو سکتے تھے، حضرت علیؓ ہو سکتے تھے، حضرت زید بن ثابتؓ ہو سکتے تھے، حضرت معاذ بن جبلؓ ہو سکتے تھے، حضرت ابو الدرداءؓ ہو سکتے تھے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ہو سکتی تھیں یہ لوگ صحابہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے اور دین و شریعت کی باریکیوں کے سمجھنے اور مختلف چیزوں کے مدارج و مراتب کے امتیاز میں نمایاں درجہ رکھتے تھے اس وجہ سے بجا طور پر اس علم کے حامل اور امین ہونے کے زیادہ اہل تھے جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ع

بردار تواں گفت　　　　بہ منبر نتواں گفت

حضرت ابوہریرہؓ کا ایک محدّث اور کثیر الروایۃ صحابی ہونے کے لحاظ سے جو درجہ ہے اس سے کسی کو مجال انکار نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی باریکیاں سمجھنے میں ان کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو طبقہ اوّل کے صحابہؓ کا ہے اور اس حقیقت کو نبی صلعم سے زیادہ جاننے پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے ؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جو تعلیم و تلقین بھی فرمائی وہ چھپانے اور راز رکھنے کے لیے نہیں بلکہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے ہی فرمائی ہمیں قرآن یا حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے آنحضرت صلعم کی زندگی میں یا دوسرے انبیاء کی زندگی میں اس قسم کی صوفیانہ رازداری کا پتہ چلتا ہو خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بار بار صحابہؓ کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ وہ جو کچھ آپؐ کی صحبت میں سنیں اور دیکھیں، اُس کو دُوسروں کو بتائیں، آپ نے فرمایا ؛ " میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو" آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ " میرے منہ سے جو کچھ سنو اس کو محفوظ کر لو کیوں کہ میرے منہ سے کوئی بات غلط نہیں نکلا کرتی " آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سامعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ موجود ہیں، وہ اُن لوگوں کو یہ ساری باتیں بتائیں جو موجود نہیں ہیں کیوں کہ بہت سے لوگ دوسروں سے سُن کر براہِ راست سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ حق بات جانتے ہوئے دوسروں کو اس کے بتانے سے گریز کریں گے قیامت کے دن اُن کے مُنہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

اس طرح کی متعدد تاکیدات مختلف پہلوؤں سے ہمیں احادیث میں آپؐ کی طرف سے ملتی ہیں لیکن کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ آپؐ نے کسی ایک صحابیؓ سے بھی کوئی بات فرمائی ہو اور پھر یہ تاکید کی ہو کہ اس کو اپنے ہی تک راز رکھنا، دوسروں پہ اس کو نہ کھولنا، ورنہ لوگ تمہاری جان کے دشمن بن جائیں گے۔ اس کے برخلاف بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ آپؐ نے کوئی بات بتائی ہے

اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اس کو بتانا اور کہنا اگرچہ اس کے سبب سے لوگ تمہارے دشمن ہی بن جائیں اور تمہیں نقصان ہی پہنچائیں۔ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے انبیاء اور اُن کے صحابہ کی زندگیوں میں بھی ہمیں اس طرح کی ہدایات وتاکیدات کم وبیش انہی الفاظ میں ملتی ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کو کچھ ہدایات دیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "لوگ ان باتوں کے سبب سے تمہیں بازاروں میں کوڑے لگائیں گے اور عدالتوں میں مجرم ٹھیرائیں گے مگر تم ان باتوں کی پروا نہ کرنا، تمہارا آسمانی باپ تمہارے ساتھ ہے۔"

۲۔ اب دوسری صورت کو لیجیے، یعنی اس بات کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں حضرت ابوہریرہؓ کو سکھائی اور بتائی تو ہوں تبلیغ وتعلیم کے عام مقصد ہی کے تحت لیکن حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں لوگوں کے حالات اس قدر متغیر ہو چکے ہوں کہ ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی ہی میں زمانہ کے حالات بہت کچھ بدل چکے تھے، اُن کی وفات خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد بنی اُمیّہ کی حکومت کے زمانہ میں ہوئی ہے جب کہ مسلمانوں کے اندر طلبِ دین کا جوش سرد پڑ رہا تھا اور طلبِ دنیا کی سرگرمیاں اس کی جگہ پر غالب آنی شروع ہو گئی تھیں لیکن اس انقلابِ حال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی امیہ کے دور میں (کم از کم شروع میں) عوام کا مزاج اس قدر نہیں بگڑا تھا کہ لوگ دین کی باتوں سے اس درجہ نامانوس اور اور بیگانہ ہو جائیں کہ ان کو پیغمبرؐ کی حدیثیں سنانا بھی ایک پرخطر کام بن جائے اس دور میں جلیل القدر صحابہؓ کا ایک گروہ موجود تھا، ان کے شاگرد لوگ ہر جگہ موجود تھے، ان کا اعزاز واحترام بھی اچھا خاصا لوگوں میں پایا جاتا تھا، احادیث کے نقل وروایت کی گرماگرمی بھی ہر جگہ موجود تھی، بہت سی خرابیوں کے پیدا ہونے کے باوجود، فضا ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ دین کی باتوں کو

بنانا اور سیکھنا دشوار ہو جائے اس دور میں عجمی تمدن اور عجمی علوم کا گھن بھی طبائع کو نہیں لگا تھا کہ لوگ اس فطری سادگی اور دلکشی سے بالکل ہی نامانوس ہو جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات واقوال میں پائی جاتی تھی، ذہنی اغتبار سے کچھ لوگ متغیر ضرور ہو گئے تھے لیکن اتنے پست نہیں ہو گئے تھے کہ ان میں اسلامی باتوں کے سمجھنے یا اسلامی اقتدار کے احترام کی صلاحیت ہی سرے سے باقی نہ رہ گئی ہو، مسلمانوں کے ہر طبقہ میں دین کی سادہ اور عام تعلیمات کے سمجھنے والے موجود تھے اور دین کی گہری باتیں سمجھنے والے بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔

یہ اور بات ہے کہ دین کی گہری باتوں کو سمجھنے کے اہل جس طرح ہر دور میں تھوڑے ہی پائے گئے ہیں، اسی طرح اس دور میں بھی ان کی تعداد تھوڑی تھی پس یہ بات کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے محض عوام کے فسادِ مذاق کے سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دبے ہوئے علم کو ظاہر کرنے سے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کیا ہو۔

۳۔ اب رہ گئی تیسری صورت، یعنی حضرت ابوہریرہؓ کا یہ ذخیرۂ علم ایسی حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے نقل و روایت اور جن کے پھیلنے میں وقت کے اربابِ اقتدار اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

ہم کو یہی بات قرینِ قیاس اور عقل و نقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بنو امیہ کا دور اور مروان اور امرائے مروان کا جور دیکھا تھا اُن کی وفات ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ہوئی ہے جب کہ مسلمان بنو امیہ کے جبر و استبداد کے شکنجے میں اچھی طرح کسے جا چکے تھے اور بنو امیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہلِ حق کے دبا لینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد اور ان کی سیاسی و اجتماعی بدعتوں کے خلاف آواز اُٹھا رہے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے ذخیرۂ علم میں ایسی بہت سی حدیثیں تھیں جن میں اسلامی امراء و حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنو امیہ کے دور کے فتنوں ان کے "ملک عضوض"

(استبداد) اور ان کے "چھوکروں" کی ستم رانیوں اور ان کے ہاتھوں دین اور اہل دین کی بربادی کی بابت حضورؐ نے پیش گوئیاں فرمائی تھیں، حضرت ابوہریرہؓ نے اس قسم کی روایات کے ذخیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میں روزہ ونماز اور حج وزکوٰۃ کی حدیثوں کی طرح اجتماعی وسیاسی معاملات سے متعلق حدیثیں بھی کھلم کھلا بیان کرنا شروع کردوں تو مستبدین وقت مجھے جیتا نہ چھوڑیں[1]۔

حضرت ابوہریرہؓ کے قول کا یہ مطلب عقل ونقل اور روایت ودرایت کے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے اور صرف میں نے ہی اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا ہے بلکہ دوسرے شارحین حدیث بھی اس مطلب کی طرف گئے ہیں، چنانچہ لمعات میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے:

وقیل اراد به اخبار الفتن	اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے حضرت
وفساد الدین علی ید اغیلمة	ابوہریرہؓ کا اشارہ ان احادیث کی طرف
من قریش وکان ابوهريرة	ہے جو فتنوں سے متعلق ہیں اور جن میں
یکنی عن بعض ولا یصرح به	قریش (بنوامیہ) کے چھوکروں کے ہاتھوں

[1] حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کا مطلب تو بلاشبہ یہی ہے لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح جان کے اندیشہ سے صحابہؓ نے رسولؐ کے دیے ہوئے علم کے ایک بڑے حصہ کو ضائع کردیا اور وہ امت کی طرف منتقل ہونے ہی سے رہ گیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان روایات کو سرے سے بیان ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ان چیزوں کے بیان کرنے میں محتاط ہوگئے ہیں، ان کو آزادی کے ساتھ اپنے اہل اور لائق شاگردوں ہی سے بیان کرتے تھے، ان ہی کے ذریعہ سے ان کا علم بعد والوں کو منتقل ہوا، یہی وجہ ہے کہ بہت سی حدیثوں کی شہرت پہلے دور میں نہیں ہوئی بلکہ دوسرے یا تیسرے دور میں ہوئی لیکن بہرحال علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ضائع نہیں ہوا بلکہ اسلاف سے اخلاف تک منتقل ہوگیا اور یہی ہمارے سنتِ صالحین کی ذمہ داری تھی۔

خوفاً علی نفسہ کقولہ اعوذ باللہ من امارۃ الصبیان یشیر الی امارۃ یزید بن معاویۃ۔

دین کی بربادی کی پیشین گوئیاں ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ ان میں سے بعض کی طرف اپنے اقوال اور دعاؤں میں اشارہ بھی کرتے تھے لیکن اندیشہ جان کے سبب سے نام لے کر ان کا ذکر نہیں کرتے تھے مثلاً وہ کہا کرتے تھے "میں چھوکروں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں" اور اس سے ان کا اشارہ یزید بن معاویہ کی امارت کی طرف ہوتا تھا۔

دوسری حدیث جس سے یہ حضرات اپنے باطنی علم کی تائید میں استدلال کرتے ہیں وہ عبداللہ بن مسعود سے ان الفاظ میں مروی ہے:

عن ابن مسعود قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انزل القرآن علی سبعۃ احرف لکل آیۃ منہا ظھر وبطن۔ (الحدیث)

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ قرآن سات قراتوں پر نازل ہوا ہے اور ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔

اسی حدیث کے ہم معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک قول بھی ہے جس میں انہوں نے قرآن کے ایک دریائے معانی ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن ایک دریائے معانی ہے، قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے، قرآن میں تمام علم اولین اور تمام علمِ آخرین ہے، قرآن کی تازگی پر کبھی باسی پن نہیں آئے گا، قرآن سے اہل علم کبھی آسودہ نہیں ہوں گے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں اور ان لوگوں سے منقول ہیں جو قرآن کے رازداں رہے ہیں، لیکن اس مضمون کی احادیث و آثار اور اس کے ہم معنی اقوال و اشارات سے یہ استدلال

کرنا کہ قرآن نے ایک ایسا علم باطن بھی دیا ہے جس کے حامل ہر دور میں صرف چند نفوسِ قدسیہ ہی رہے ہیں اور انہی کے ذریعہ سے یہ علم ہر دور کے مخصوص حاملین کو سینہ بسینہ منتقل ہوا ہے، ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے لیکن اس کا کوئی باطن نہیں ہے جس کی راہنمائی خود اس کا ظاہر نہ کرتا ہو، قرآن کے اندر اسرارِ حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن کے ہی الفاظ و اشارات ہیں، قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے۔ ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبّر کرتے ہیں وہ بقدرِ استعداد اس سے فیض پاتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔ اس معاملہ میں مجرد ذوق یا کشف یا مشاہدہ کو دلیل راہ نہیں بناتے۔ ایک فقیہہ جس طرح قرآنِ حکیم سے ایک فقہی حکم مستنبط کرتا ہے، اور اس پر قرآن کے الفاظ یا اشارات سے کوئی دلیل پیش کرتا ہے اور اگر وہ اس طرح کی دلیل نہ پیش کرے تو اس کی بات بالکل بے وزن ہو کے رہ جاتی ہے، اسی طرح ایک "صاحبِ اسرار" کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر تدبّر جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرآن سے سمجھا ہے، قرآن سے دلیل لائے اور اگر وہ قرآن سے دلیل نہ لا سکے تو اس کے اس نکتہ کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے یہ نکتہ خانہ کعبہ کے اندر قرآن کی روحانیت کی طرف توجہ کے ذریعے سے حاصل کیا ہے۔ [۱]

پس جہاں تک قرآن کے اندر اسرار و حِکَم کے موجود ہونے کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہے لیکن اسرار و حِکَم کے اس خزانہ پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے اس خزانہ میں سے بقدرِ صلاحیت و استعداد وہ لوگ حصہ پاتے ہیں جو کتابِ الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لیے مقرر ہیں حضرات صوفیائے کرام نے جو اسرار و معارف دریافت کیے ہیں ان کا وہ حصہ بے شک صحیح ہے جو

---

[۱] اس قسم کے اسرار کی دلچسپ مثالیں ہم آگے مناسب مواقع سے پیش کریں گے۔

انھوں نے قرآن کے تدبر کے ذریعے سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ قرآن سے کوئی دلیل رکھتے ہیں مگر مجرد اس بنا پر کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے، علمِ باطن کا ایک پورا نظام کھڑا کر دینا اور اس کی حمایت میں مذکورہ بالا حدیثوں سے دلیل لانا صریح زیادتی ہے۔

باطن نماز کا بھی ہے، باطن روزہ کا بھی ہے، باطن حج کا بھی ہے، باطن زکوٰۃ کا بھی ہے اور قرآن نے صاف صاف اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں سے ہر چیز کا ایک باطن ہے اور وہی باطن مقصودِ حقیقی ہے لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کوئی شخص اٹھ کر ان عبادات کی ساری صورت و ہیئت بالکل بدل ڈالے اور جب کوئی شخص اس پر اعتراض کرے تو وہ جواب دے کہ "یہ باتیں باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، ان کو اہلِ ظاہر کیا جانیں"۔ قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ وہیں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ فلاں ظاہر کا باطن یہ ہے تاکہ کسی بے راہ روی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

تزکیہ کا لغوی مفہوم، اُس کا مقصد
اور
اُس کی وُسعت

عربی زبان میں تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشو و نما دینا، اور اُس کو پروان چڑھانا ہے۔

تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر ظاہر میں تو مختلف شکلوں میں نمایاں ہو گا، مادی چیزوں پر یہ عمل کسی اور شکل میں نمایاں ہو گا اور معنوی چیزوں پر کسی اور صورت میں۔ لیکن یہ فرق محض ایک ظاہری فرق ہو گا، حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی فرق نہیں ہو گا، نفظ کے اندر صاف ستھرا بنانے، نشو و نما دینے اور پروان چڑھانے کی جو رُوح ہے وہ اس کے عمل میں ہر جگہ نمایاں رہے گی۔

اس بات کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ تزکیہ کا عمل زمین کے ایک ٹکڑے پر بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک انسان کے نفس پر بھی کیا جا سکتا ہے اگرچہ ان دونوں چیزوں پر اس عمل کی صورت ظاہر میں مختلف ہو گی اس لیے کہ میدانِ عمل الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت اور مقصد کے لحاظ سے دونوں عملوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہو گا، زمین کا تزکیہ یہ ہو گا کہ اس کو پہلے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا جائے، اس کی ناہمواریوں کو ہموار کیا جائے پھر اس پر ہل چلا کر اس کو نرم بنایا جائے۔ پھر کھاد اور پانی دے کر اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی صالح بیج کو نشو و نما دے سکے اور اس سے پھل اور پھول حاصل ہو سکیں۔

نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں، ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں، جاہلی عادات و اخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں، ان کو درست اور ہموار کیا جائے، تقلیدوں اور رسموں کی پرستش نے اس کو بے حسی اور جمود کے جو روگ لگا رکھے ہیں ان کو دور کیا جائے۔ فانی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے اس کا علاج کیا جائے تاکہ اس کی آنکھیں کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس بلند مرتبہ تک پہنچ سکے جس مرتبہ تک پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے۔

تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم: اسی مفہوم سے ملتا جلتا تزکیہ کا اصطلاحی مفہوم بھی ہے۔ اس کا لغوی مفہوم جیسا کہ اوپر بیان ہوا کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا اور اس کو پروان چڑھانا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خدا رسی کے راستہ پر ڈال دینا اور اس کو درجۂ کمال پر پہنچنے کے لائق بنانا ہے۔

تزکیہ کا یہ اصطلاحی مفہوم خود قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا	اور شاہد ہے نفس اور جیسا اس کو بنایا
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، قَدْ اَفْلَحَ	پس اس کو سجھ دی نیکی اور بدی کی،
مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ	کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا، اور
مَنْ دَسّٰىهَا	ناکام ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔

اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات ودیعت کر دیے ہیں۔ اور اس کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان امتیاز کر سکے، پھر انسان کے لیے فلاح و کامرانی کا راستہ یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ نیکی اور بدی کی اس کشمکش میں نیکی کا ساتھ دے

اور اس کو بدی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔

صحیح شعور کے ساتھ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو مغلوب کرنے کا یہ جہاد قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔

علم تزکیہ کی وسعت

تزکیہ کے اس مقصد و مفہوم کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو علوم ہمارے نفس سے براہِ راست بحث کرنے والے ہیں ان میں علم طب ہی ایک ایسا علم ہے جو تزکیہ کے علم سے کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ علمِ طب ہمارے جسم کی بیماریوں اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے اور علم تزکیہ ہماری روح کے امراض اور ان کے علاج سے بحث کرتا ہے لیکن اس مشابہت کے باوجود دونوں میں بہت بڑا فرق بھی ہے، علمِ طب کا دائرہ بحث نہایت محدود ہے وہ صرف ہمارے نفس کے ایک پہلو یعنی جسم اور اس کے امراض سے بحث کرتا ہے، اس کے برعکس علمِ تزکیہ ہمارے نفس کے تمام ظاہری و باطنی گوشوں سے بحث کرتا ہے ہمارا نفس جن جن قوتوں اور قابلیتوں سے بھی مرکب ہے، یہ ان سب پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے اور ان سب کی تربیت کرتا ہے۔ ہمارے اندر جتنے احساسات و جذبات پائے جاتے ہیں، یہ سب کو زیرِ بحث لاتا ہے اور ان سب کی اصلاح کرتا ہے۔ ہمارا نفس جن گوناگوں اور مختلف النوع روابط و تعلقات کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے یہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے اور سب کو ایک خاص اصول و ضابطہ کے تحت منظم کرتا ہے، ہمارے دل کے خیالات، ہمارے ذہن کے وسوسے، ہماری طبیعت کے میلانات اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہمارا کھانا پینا، ہمارے مشاغل اور ہماری دلچسپیاں، ہمارے روز و شب کے معمولات غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس سے یہ بحث نہ کرتا ہو۔

علم تزکیہ کا اصلی کام

پھر صرف یہی نہیں کہ یہ ہمارے نفس کے ہر پہلو سے بحث کرتا ہے، یا ان کی خرابیوں کو دور کر کے ان کی جگہ پر جو کچھ صحیح ہے اس کو پیش کرتا ہے، بلکہ اس کا اصلی کام اس بحث و تحقیق اور اس تعلیم و تلقین سے آگے ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے نفس کی ہر پہلو سے ایسی تربیت

بھی کرتا ہے جس سے ہمارا نفس "نفسِ مطمئنہ" بن جائے۔

نفسِ مطمئنہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد ایسے مضبوط یقین پر قائم ہو جائے کہ رنج و راحت اور دکھ اور سکھ کی کوئی حالت بھی خدا کے بارے میں ہمارے اعتماد اور ہمارے حسنِ ظن کو بدل نہ سکے بلکہ ہر حالت میں ہم خدا سے راضی اور مطمئن رہیں، اسی طرح ہمارے عمل کی بنیاد ایک ایسی مستحکم بصیرت پر قائم ہو جائے کہ تنگی و فراخی اور خوف و طمع کی کوئی آزمائش بھی ہم کو اس مقام سے نہ ہٹا سکے جہاں اللہ کی شریعت نے ہمیں کھڑا کیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو کچھ چاہا ہے، ہم اس کو پورا کر کے اس کے پسندیدہ بندے بن سکیں، یہی نفسِ مطمئنہ تزکیہ کا اصل مقصود ہے، قرآن میں اس نفسِ مطمئنہ کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:

یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً	اے ٹھکانے کے نفس، تو لوٹ اپنے خداوند کی طرف، تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

خوب سے خوب تر کی جستجو

اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ تزکیہ میں ایک آرٹ کی شان بھی پائی جاتی ہے کیونکہ تزکیہ کا مطمحِ نظر صرف اسی قدر نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارا نفس کسی نہ کسی شکل میں راہ پر لگ جائے بلکہ تزکیہ اس سے آگے بڑھ کر نفس کو خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ تزکیہ صرف اتنا ہی نہیں چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی شریعت کا کچھ علم حاصل ہو جائے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر یہ بھی چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کی صفات کی سچی اور پکی معرفت حاصل ہو جائے۔ تزکیہ صرف یہی نہیں پیشِ نظر نہیں رکھتا ہے کہ ہماری عادتیں کسی حد تک سنور جائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم تمام مکارمِ اخلاق کے پیکرِ مجسم بن جائیں تزکیہ صرف اتنے پر ہی قناعت نہیں کرتا کہ ہمارے جذبات میں ایک ہم آہنگی اور ربط پیدا ہو جائے بلکہ وہ اس پر مزید ہمارے جذبات کے اندر رقت و لطافت اور سوز و گداز کی گھلاوٹ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ تزکیہ کا مطالبہ صرف اسی قدر نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی نہ کسی طرح ہمارا نفس، احکامِ شریعت

کے تحت آجائے بلکہ اس کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ ہمارا نفس خدا اور اس کے رسول کے ہر حکم کو اس طرح بجالائے جس طرح اس کے بجالانے کا حق ہے۔ اس کا مطالبہ ہم سے صرف خدا کی بندگی ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس بات کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم خدا کی اس طرح بندگی کریں گویا ہم اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے خدا کو اس کی تمام صفتوں کے ساتھ مانیں، پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اس کے تمام احکام کی زندگی کے ہر گوشہ میں اطاعت کریں اور پھر اس کا مطالبہ ہم سے یہ بھی ہے کہ یہ ماننا اور اطاعت کرنا محض رسمی اور ظاہری طریقہ پر نہ ہو بلکہ پورے شعور اور گہری للّٰہیت کے ساتھ ہو جس میں ہمارے اعضاء و جوارح کے ساتھ ہمارا دل بھی پورا پورا شریک ہو۔

اس چیز نے تزکیہ کو ایک مستمر جدوجہد اور ایک مسلسل تگ و دو کی چیز بنا دیا ہے اس میں کوئی وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں ہے، اس سفر میں کوئی موڑ یا مقام ایسا نہیں آتا ہے جہاں پہنچ کر آدمی یہ سمجھ سکے کہ بس اب یہ آخری منزل آگئی ہے، یہاں پہنچ کے ذرا سستا لینا چاہیے یا پیٹیں کھول دینی چاہییں۔ یہ ایک خوب سے خوب تر کی جستجو ہے، اس خوب سے خوب تر کی جستجو میں نگاہ کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی جس رفتار سے اعمال و اخلاق اور ظاہر و باطن میں جلا پیدا ہوتا جاتا ہے، اسی رفتار سے مذاق کی لطافت، حس کی ذکاوت اور آنکھوں کی بصارت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دامن کے پچھلے دھبے دھو کے ابھی فارغ نہیں ہوئے کہ نگاہ کچھ اور ڈھونڈ کے سامنے رکھ دیتی ہے کہ اب انہیں دھوئیے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں؟

عمل تزکیہ کی اس فطرت نے اس کو نہایت مشکل اور دشوار کام بنا دیا ہے۔ اگر ایک شخص اس کی وسعتوں کو دیکھ کر بالفرض نہ بھی گھبرائے تو بھی ڈر رہتا ہے کہ مبادا یہ تسلسل اس کی کمر ہمت توڑ کے رکھ دے لیکن اگر یہ عمل فطری طریقہ پر اس تدریج و ترتیب کے ساتھ

کیا جاتا رہے جو اس کے لیے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بتایا گیا ہے تو اس وسعت اور اس لامتناہیت کے باوجود ایک طالب حق کے لیے اس سے زیادہ لذیذ اور پرکشش کام کوئی دوسرا نہیں ہے، اس کی وسعتوں کو دیکھ کر دل پر ہراس ضرور طاری ہوتا ہے لیکن اس راہ میں ہر قدم پر غیب سے جو راہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ راہنمائی اس قدر تسلی بخش ہوتی ہے کہ ہمت برابر بندھی رہتی ہے اور دل کبھی بے حوصلہ نہیں ہونے پاتا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ — جو ہماری طلب میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں

اس طرح اس راہ کے تسلسل سفر سے جو تکان لاحق ہوتی ہے اس کا ازالہ ان نئے نئے حقائق و لطائف کے انکشاف سے ہوتا رہتا ہے جو برابر تازہ زندگی بخشتے رہتے ہیں۔

ہر زماں از غیب جانے دیگر است۔

جدوجہد کے تسلسل کے ساتھ اگر تازہ بتازہ فتوحات برابر حاصل ہوتی رہیں اور ہر نئی کامیابی پچھلی تمام کامیابیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو تو محنت کی یکسانی اور اس کے تسلسل کے باوجود طبیعت کند نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر نیا مرحلہ نئے ذوق و شوق کے ساتھ شروع کرنے کا حوصلہ برابر از خود پیدا ہوتا رہتا ہے۔

تزکیہ کا اصل موضوع

اوپر کی تفصیل سے اگرچہ عمل تزکیہ کی فطرت اور اس کی وسعتوں اور مشکلوں کا اندازہ ایک حد تک کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے سارے پہلوؤں کو نگاہ کے سامنے لانے کے لیے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ تزکیہ کے اصل موضوع کو سامنے رکھ کر اس کے سارے اطراف کو احاطہ میں لینے کی کوشش کی جائے کیوں کہ جتنے پہلو اس موضوع کے ہوں گے، لازماً اتنے ہی پہلو اس تزکیہ کے بھی ہوں گے لباس ہمیشہ قامت کو سامنے رکھ کر تراشا جاتا ہے، اس وجہ سے اگر قامت کا اندازہ ہو جائے تو لباس کے طول و عرض کا اندازہ آپ سے آپ ہو جائے گا۔

تزکیہ کا موضوع ظاہر ہے کہ نفس انسانی ہے لیکن خود نفس کیا ہے؟ یہ ایک بڑا

اہم سوال ہے ، اس سوال کو اسلام کے فلسفہ میں بھی اہمیت دی گئی ہے اور جاہلیت کے فلسفہ میں بھی اس کو خاص اہمیت دی گئی ہے ۔ ایتھنز کے معبد کے دروازہ پر سقراط کا یہ مقولہ کندہ تھا کہ "اے انسان تو اپنے آپ کو پہچان !" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی حکمت میں معرفتِ نفس کو حصولِ تزکیہ کی راہ میں بنیادی چیز خیال کیا گیا ہے ۔ ہمارے ہاں بھی یہ مقولہ مشہور ہے :

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ   جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا ۔

اس وجہ سے ضروری ہے کہ خود نفس کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ کن صفات اور کن تقاضوں سے مرکب ہے ، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا تزکیہ کن کن باتوں کا متقاضی ہو گا ۔

نفس کے تجزیہ سے ہمارا مطلب یہاں اس طرح کا تجزیہ نہیں ہے جس طرح کا تجزیہ فلسفی لوگ کسی چیز کی ماہیت و حقیقت معلوم کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں ۔ ہمارے نزدیک نہ تو نفس کی حقیقت و ماہیت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ ہمارے مقصد کے لیے اس کی ماہیت و حقیقت کا معلوم ہونا کچھ ضروری ہے ۔ ہم صرف نفس کے صفات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اس کے صرف ان عقلی و اخلاقی پہلوؤں کو سامنے لائیں گے جو علم تزکیہ میں زیر بحث آتے ہیں یا آنے چاہئیں ۔

نفس انسانی کے مختلف پہلو

اب آئیے غور کیجیے کہ ہمارے نفس کے (جس کو ہم عربی میں "انا" اور اُردو میں "میں" سے تعبیر کرتے ہیں) کیا کیا پہلو ہیں جن پر تزکیہ کا عمل واقع ہو سکتا ہے اور جن کے تزکیہ کے بغیر اس کا اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھنا ناممکن ہے ۔

ہم اپنے نفس پر جب غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو بدیہی طور پر عمل تزکیہ کے تحت آتے ہیں وہ دو ہیں ۔

ایک یہ کہ ہمارا نفس ادراک کرتا ہے ۔

دوسرا یہ کہ ہمارا نفس عمل کرتا ہے ۔

ادراک ہمارے نفس کا اصل جوہر ہے، یہ نہ ہو تو انسان اینٹ پتھر سے زیادہ وقعت دیئے جانے کے لائق نہیں ہے پھر یہ ادراک جیسا کہ ظاہر ہے صرف جزئیات ہی کا ادراک نہیں ہے بلکہ کلیات اور حقائق کا ادراک بھی ہے اور ہمارے نفس کی یہی وہ صفت ہے جو درحقیقت اس کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے ورنہ وہ ایک جانور سے زیادہ اہمیت دیئے جانے کا مستحق نہ قرار پاتا، یہ کلیات کا ادراک اس کے لیے تعقل و تفکر کی وسیع راہیں کھولتا ہے، اسی سے اس کے تمام علوم و افکار اور تمام عقائد و نظریات وجود میں آتے ہیں، اسی کی مدد سے وہ ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچتا ہے، اسی کی راہنمائی میں وہ مخلوق سے خالق اور مصنوع سے صانع تک رسائی حاصل کرتا ہے، اسی کی روشنی میں وہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کی صفتوں اور اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ کرتا ہے اور پھر اسی کی مدد سے وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے لیے زندگی کی صحیح روش کیا ہے؛ اور اس پر بحیثیت ایک انسان کے کیا فرائض اور کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو اسے کس احساسِ مسئولیت اور کس مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

اندازہ کیجیے کہ ہمارے نفس کا یہ پہلو کس قدر اہم ہے۔ بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ نفس کے دوسرے تمام پہلو اسی کے تابع ہیں، اگر اس کی اصلاح ہو تو پورے نفس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اگر اس کے اندر کوئی ادنیٰ خرابی بھی موجود رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ یہ انسان کی فکر ہی ہے جو اس کو گمراہ یا راہ یاب بناتی ہے اگر فکر کا ایک قدم بھی غلط اٹھ جائے تو سارا فلسفہ ہی غلط ہو کے رہ جائے اور نتائج نکالنے میں کوئی معمولی فروگذاشت بھی ہو جائے تو علم کی ساری عمارت ہی دھڑام سے زمین پر آرہے اور پھر اس خرابی کے نتیجہ کے طور پر لازماً زندگی کے ہر گوشہ میں فساد پھیل جائے۔

تزکیۂ علم و ادراک

علم و ادراک کی اس اہمیت کے سبب سے تزکیہ میں علم و ادراک کے تزکیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس میں مقدم شے یہ ہے کہ پہلے وہ بنیادی سوالات طے کر دیے جائیں جو فکر و نظر کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً یہ کہ ہم کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟

ہم خالق ہیں یا مخلوق ؟ مختار ہیں یا مجبور ؟ غیر مسئول ہیں یا کسی کے آگے جواب دہ ؟ اگر کسی کے آگے جواب دہ ہیں تو اس کی صفات کیا ہیں ؟ ہماری زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے ؟ وہ کیا پسند کرتا ہے، کیا ناپسند کرتا ہے ؟ اگر کسی روش کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے اختیار کرنے والے کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے ؟ ان سارے سوالوں کا نہایت قطعی اور حتمی جواب نفس کو علمی کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کے لیے ناگزیر ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سوالوں کے جو صحیح اور قطعی جوابات مہیا کیے جائیں ان پر تقلید وجمود اور غفلت و نسیان کا گرد و غبار نہ جمنے پائے اور اگر خدانخواستہ کسی گوشہ میں زنگ لگتا ہوا نظر آئے تو اس کو مانجھ کر برابر صاف کیا جاتا رہے۔

تزکیۂ عمل

اسی طرح دوسرے پہلو یعنی عمل کو لیجیے، یہ پہلو بھی علم ہی کی طرح وسیع ہے، انسان کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا ہے جس میں وہ کوئی نہ کوئی عمل نہ کرتا ہو، اور اس کا یہ عمل اس کے نفس پر کوئی بُرا یا بھلا چھاپ نہ چھوڑتا ہو۔

ان اعمال کے متعلق صرف جائز اور ناجائز کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جائز و ناجائز سے زیادہ اہمیت رکھنے والا سوال ان کے محرکات سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے اعمال کی محرک کوئی ایک ہی شئے نہیں ہوتی، بلکہ مختلف محرکات ہیں جو اس کو عمل کے لیے اکساتے ہیں اور ان سے ہر محرک کا عمل کے مزاج پر براہ راست اثر پڑتا ہے، ایک ہی عمل ایک محرک کے تحت نیکی کا عمل بنتا ہے اور وہی عمل دوسرے محرک کے تحت بدی کا عمل بن جاتا ہے۔

پھر ہمارے اندر جتنے بھی محرکات ہیں، ان کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کن پر اعتماد کیا جائے ؟ کون ہیں جن کی ترغیب و تحریک قبول کی جائے اور کون ہیں جن کی ترغیب و تحریک آنکھ بند کر کے قبول کرنے میں اندیشے اور خطرے ہیں۔

کبھی ہم کوئی عمل کسی ضرورت کی تحریک سے کرتے ہیں مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں، پیاس لگتی ہے تو پانی پیتے ہیں، تکان محسوس ہوتی ہے تو آرام کرتے ہیں۔

اسی طرح ہم بہت سے عمل خواہشوں کی تحریک سے کرتے ہیں مثلاً شہرت و ناموری کے حصول کے لیے بہادری کے کام کرتے ہیں، ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے رفاہِ عام کے کارنامے

انجام دیتے ہیں۔ دولت مند بننے کے لیے صنعت و حرفت اور تجارت کے کاروبار پھیلاتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس ہمارے بہت سے کام جذبات کے تحت ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی سے محبت اور کسی سے نفرت کرتے ہیں کسی پر حسد اور کسی پر مہربانی کرتے ہیں۔ کسی پر احسان کرتے ہیں اور کسی سے انتقام لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہم گہرے تجزیۂ نفس سے یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بہت سے اعمال ایسے بھی ہیں جن کا محرک مذکورہ تمام محرکات سے بالاتر ہوتا ہے، اس کے تحت ہمارے تعقل و تفکر اور ایثار و بے غرضی کے وہ سارے کام آتے ہیں جن کے اندر اپنے باریک ترین تجزیہ سے بھی ہم کسی نفسانی شائبہ کا سراغ نہیں پاتے ہیں۔ اس محرک کو ہم رُوحِ ملکوتی یا نفسِ ناطقہ کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

یہ چاروں قسم کے محرکات ہمارے اندر کبھی الگ الگ کام کرتے ہیں اور کبھی ملے جُلے ہوئے ہوتے ہیں۔ نیز یہ اپنے فعل میں افراط و تفریط کے بھی مرتکب ہوتے ہیں، اس وجہ سے ہر عمل میں ان کا تجزیہ کرتے رہنا اور ان کی افراط و تفریط پر ان کا محاسبہ کرتے رہنا اور ان کو ان کے فطری و شرعی حدود کا پابند بنانا ایک بڑا طویل سلسلہ ہے۔ اس سارے سلسلہ کو ایک خاص نظم کے تحت منظم کرنا بھی تزکیہ کے فرائض میں داخل ہے۔

تزکیۂ تعلقات و معاملات

علم و عمل اور جذبات و محرکات کے بعد ہمارے نفس کا دوسرا پہلو اس کے تعلقات و معاملات کا ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ بھی اپنی وسعت میں کسی طرح مذکورہ پہلوؤں سے کم نہیں ہے بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

نفس کے تعلقات میں سب سے پہلے جو تعلقات زیرِ بحث آتے ہیں وہ نفس کا تعلق خدا کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو خالق نہیں بلکہ مخلوق تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خالق کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ بالکل صحیح بنیادوں پر کس طرح قائم ہوسکتے ہیں؟

اس کے بعد دوسرے درجہ میں خود اپنے نفس کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے، ہم جس

چیز کو "انا" یا "میں" سے تعبیر کرتے ہیں وہ بدیہی طور پر بہت سی چیزوں کا مالک یا امین ہے اس کے قبضہ میں ایک جسم ہے، دل و دماغ ہیں، قوتیں اور قابلیتیں ہیں، احساسات اور جذبات ہیں، آخر وہ ان ساری چیزوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرے گا؟ کیا وہ ان ساری چیزوں کا مالک ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے یا وہ ان چیزوں کا امین ہے اور ان کو وہ صرف ان حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتا ہے جو امانت رکھنے والے کی طرف سے ان کے استعمال کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں؟ اگر دوسری شکل ہے تو پھر یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ وہ حدود کیا ہیں؟ جن کی نگہداشت اس سلسلہ میں لازمی ہے اور پھر انہی کے ساتھ ان ظاہری اور باطنی صفات کا جاننا بھی ناگزیر ہو گا جو اس نگہداشت کے فرض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔

خدا اور اپنی ذات کے بعد نفس کا تعلق اپنے ماحول سے جُڑتا ہے، انسان کے متعلق یہ حقیقت محتاج بحث نہیں ہے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے، وہ جب بھی پایا جاتا ہے اور جہاں کہیں بھی پایا جاتا ہے، کسی خاندان کے فرد، کسی معاشرہ کے رکن، کسی ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ ایک بیل جس طرح اپنے پھیلنے، اپنے پروان چڑھنے اور اپنے پھلنے پھولنے کے لیے لازماً کچھ سہاروں کی محتاج ہوتی ہے، اسی طرح انسان بھی اپنے نشوونما اور اپنی ترقی اور کمال کے حصُول کے لیے ان سہاروں کا محتاج ہے، ان سہاروں سے الگ ہو کر اوّل تو اس کا وجود پایا ہی نہیں جاتا اور اگر پایا جاتا بھی ہے تو اس طرح کہ اس کی ساری صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر کے رہ جاتی ہیں۔ اس وجہ سے تزکیہ ہمارے نفس کے سارے تعلقات کا جائزہ لے کر ان کو صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے تاکہ وہ اس معراجِ کمال تک پہنچ سکے جہاں تک وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے پہنچ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تزکیہ کوئی مفرد اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے اطراف دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں، ہمارے نفس کا ہر گوشہ اور ہماری زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، عقلی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا اجتماعی و سیاسی، اس کے تحت آتا ہے۔ ہمارے نفس کے تزکیہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ اس کے کسی ایک گوشہ میں اُجالا ہو گیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر گوشہ میں روشنی پھیل گئی، ہمارا علم بھی جگمگا اٹھا، ہمارا

عمل بھی پاکیزہ ہو گیا، ہمارے تعلقات و معاملات بھی درست ہو گئے۔

اب ہم تزکیہ کی ان تینوں قسموں۔ تزکیہ علم اور تزکیہ تعلقات پر الگ الگ ابواب میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

تزکیۂ علم

علمِ حقیقی کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے

علم کے تزکیہ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصراً یہ بتائیں کہ حقیقی علم کیا ہے اور اس علم کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا ہیں۔

علم خواہ کسی معمولی سے معمولی بات کا بھی ہو، بہر حال علم ہے اور جہل کے مقابل میں وہ انسان کو فطرتاً عزیز و مرغوب ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس علم کی پیاس انسان کے اندر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے، جس علم کو وہ سب سے پہلے ڈھونڈھتا ہے اور جس علم کو وہ دوسرے تمام علموں پر ترجیح دیتا ہے یہ علم محض اس کائنات کے چند طبیعی قوانین و ضوابط کے جان لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم چند مابعد الطبیعی سوالات کے اطمینان بخش حل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوالات اگرچہ مابعد الطبیعی ہیں، اگرچہ ان سوالات کا تعلق انسان کے بالکل قریبی ماحول سے براہِ راست نہیں ہے اور اگرچہ ان کے حل ہونے سے بظاہر انسان کی کوئی مادی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تاہم ہر معقول انسان کے فکر و ذہن پر ان کا اس قدر غلبہ ہوا کرتا ہے کہ آدمی اپنے بالکل پاس کے سارے سوالات کو چھوڑ کر سب سے پہلے انہی مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

بادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اگر گہری نگاہ سے انسان

کا ذہنی وفکری تجزیہ کیا جائے تو اس واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اسباب خواہ کچھ ہی ہوں لیکن انسان اسی ترتیب سے سوچتا ہے اور اسی ترتیب سے وہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے سوالات کو حل کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے پہلے یہ سوال نہیں آتا کہ اس کا جو جسم ہے وہ کن اجزا سے بنا ہوا ہے ؛ بلکہ پہلے وہ اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کو پیدا کس نے کیا ہے ؛ اسی طرح اس کے ذہن میں پہلے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پانی وہ پی رہا ہے، اس میں کن کن اجزاء کی کتنی کتنی مقدار شامل ہے اور جو غذا وہ کھا رہا ہے وہ کن کن وٹامنی جوہروں پر مشتمل ہے بلکہ ان سوالات کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذات کون ہے جس نے اس کے لیے بلا کسی استحقاق کے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے اور اس ذات کی صفتیں کیا ہیں اور اس کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے ؛ علیٰ ہٰذا القیاس اس کے ذہن کو پہلے اس تحقیق کی خواہش پریشان نہیں کرتی کہ جس زمین پر وہ چل پھر رہا ہے وہ گول ہے یا چپٹی ساکن ہے یا متحرک، بلکہ سب سے پہلے اس کے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس وسیع زمین کو اتنے عجائب کے ساتھ وجود میں کون لایا ہے ؛ اور وہ اس کو وجود میں لا کر خود کہاں چھپ کے بیٹھا ہوا ہے ؛ وہ اپنے اوپر اس سقفِ نیلگوں کو، اور اس کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں ستاروں اور چاند اور سورج کو دیکھ کر نہ تو اس بات کے دریافت کرنے کے درپے ہوتا ہے کہ یہ جو ایک چھت سی نظر آرہی ہے فی الواقع یہ چھت ہی ہے یا یہ محض ایک خلائے لامتناہی ہے؛ وہ دوربین لے کر نہ چاند کے اندر نظر آنے والے دھبوں کی تحقیقات کے لیے دوڑتا ہے، نہ سورج اور زمین کے درمیان کے فاصلہ کی پیمائش کی فکر میں سرگرداں ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے اگر اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے حل کے لیے بے چین ہوتا ہے تو وہ یہ سوال ہے کہ وہ کون ہے جو اتنی حیرت انگیز چیزوں کو وجود میں لایا ہے اور ان چیزوں کے وجود میں لانے سے اس کا مقصد کیا ہے[1] ؟

---

[1] ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ موجودہ زمانے کے ماہرینِ سائنس کی ساری توجہ تو اس وقت انہی سوالات پر مرکوز ہے جو اس کائنات کے ظواہر سے متعلق ہیں، خالقِ کائنات کے سوال پر غور کرنے والے تو ان میں بہت کم ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صورتِ واقعہ یہی ہے لیکن اس سے ہمارا دعویٰ باطل نہیں ہوتا، جہاں تک سوال پیدا ہونے کا (باقی صفحہ ۴۸ پر)

انسان کے سوچنے کا یہ انداز اس کے وہمی پن کا یا محض اس کی ذہنی اپج کا نتیجہ نہیں ہے، وہ ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اس کو پاس کی چیزیں چھوڑ کر دُور کی کوڑی لانے کا کچھ شوق ہے۔ بلکہ فی الواقع سوچنے کی صحیح ترتیب ہی یہی ہے۔ یہی سوال درحقیقت وہ سوال ہے جس کے حل ہونے سے اس کی رُوح اور اس کی عقل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سُلجھ سکتا ہے اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سر مارتا رہے لیکن وہ کسی ایک گرہ کو بھی نہیں کھول سکتا اور اگر کوئی گرہ کھولتا بھی ہے تو پھر اس گرہ کے اندر سے ہزاروں گرہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سوال کو حل کیے بغیر اس دنیا میں انسان ہوائی جہازوں پر اڑتے اور ایٹمی آلات جیسی خطرناک چیزیں ایجاد کرنے کے باوجود بھی اس کائنات کے متعلق بالکل اندھیرے ہی میں رہتا ہے وہ ایک گھر کے اندر ہے لیکن اس کو کچھ پتہ نہیں کہ یہ گھر کس کا ہے؟ وہ اس گھر کی مختلف چیزوں کو توڑ پھوڑ رہا ہے، ان کو الٹ پلٹ رہا ہے، ان کو اپنے استعمال میں لا رہا ہے، لیکن اس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کے یہ سارے تصرفات اس گھر والے کی مرضی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کی بے شمار نعمتوں سے آزادانہ متمتع ہو رہا ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں کہ ان تمام نعمتوں کے جواب میں اس گھر والے کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عاید کی گئی ہیں یا نہیں؟ وہ اس گھر کے ہر حصے میں دندنا رہا ہے لیکن اسے کچھ علم نہیں کہ اس گھر والے کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس گھر کو، گھر والے نے اس کو ہمیشہ کے لیے سونپ دیا ہے یا اس میں صرف اس کو چند دنوں کی عارضی سکونت کی اجازت دی ہے؟ اگر عارضی سکونت کی اجازت دی ہے تو اس کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ہیں یا یہ حقِ تصرف بالکل بے قید و شرط ہے؟ اگر کچھ شرطیں ہیں، تو وہ شرطیں

(بقیہ صفحہ ۴۶) تعلق ہے، پیدا تو آج بھی سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ اور اس کی صفتیں کیا ہیں؟ لیکن موجودہ زمانہ کے فلسفی اس سوال پر غور کرنے اور اس کو حل کرنے کی بجائے اس سے فرار اختیار کرنے میں سلامتی سمجھتے ہیں وہ کہنے کو تو بظاہر یہ کہتے ہیں کہ یہ سوال حل نہیں ہو سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا حل چونکہ ان کی خواہشوں کے خلاف ان پر بہت سی ذمہ داریاں عاید کرتا ہے، اس وجہ سے وہ اس کو حل کرنے اور اس کی ذمہ داریوں سے دوچار ہونے کے بجائے یا تو اس کے مقابلے میں شتر مرغ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں یا اس کے کسی غلط حل پر ہی قانع ہو جاتے ہیں۔

کیا ہیں؟ اور اگر شرطیں پوری نہ ہوسکیں تو گھر والا ان کے متعلق کوئی باز پرس بھی کرے گا یا نہیں؟
غور کیجیے کہ کیا کسی کو دن سے کو دن آدمی کی نسبت بھی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی عالیشان اور آراستہ و پیراستہ محل کے اندر جا تے گا، اس کی ہر چیز سے بے تکلف فائدہ اٹھانا شروع کر دے گا، اس کے ایک گوشے اور ایک ایک کرنے کی تحقیق و تفتیش شروع کر دے گا، اس کے مخفی خزانوں، اور پوشیدہ دفینوں تک کی چھان بین کو نے لگ جائے گا اور یہ سب کچھ کرنے سے پہلے وہ یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرے گا کہ اس محل کا مالک کون ہے؟ وہ اس کو اپنے محل میں گھسنے دینے کا روادار بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر بالفرض وہ اس کو اس میں کچھ تصرف کرنے کی اجازت بھی دے رہا ہے تو اس پر اس نے کچھ پابندیاں اور شرطیں بھی عاید کی ہیں یا بغیر کسی پابندی اور بغیر کسی شرط ہی کے اس نے اپنا پورا محل اس کے حوالے کر دیا ہے؟ ایک چور اور ایک نقب زن تو بلاشبہ کسی تحقیق و تفتیش کے چکر میں پڑے بغیر اس طرح کے کسی محل میں جا گھسے گا اور اس میں من مانے تصرفات بھی شروع کر دے گا، لیکن کسی شریف آدمی کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی اس قسم کی جسارت کر سکے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عاقل آدمی کے اندر سب سے پہلے اس کائنات کے متعلق یہ مابعد الطبیعی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں وہ عین اس کی فطرت کی جڑ سے پیدا ہوتے ہیں، یہی سوالات ہیں جو پیدا ہونے چاہئیں اور انہی کے صحیح جواب سے دراصل اس کے روح و دل کو حقیقی طمانینت و مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور انہی سے علم حقیقی کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔

جب آدمی کو اس کائنات کے خالق و مالک کا سراغ مل گیا تو اس کو گویا وہ کلید مل گئی جس سے علم حقیقی کے تمام دروازے کھولے جا سکتے ہیں، اس کے بعد اس کے فکر کے لیے وہ نقطۂ آغاز مل جاتا ہے جہاں سے تحقیق و تفتیش کا صحیح قدم اٹھایا جا سکتا ہے، اس کے بعد انسان یہ سوال طے کر سکتا ہے کہ یہ دنیا کہاں سے آگئی ہے۔ اس کے بعد وہ خود اپنی حیثیت اور اپنے مرتبہ کو بھی متعین کر سکتا ہے، اس کے بعد وہ آفاق و انفس کے مطالعہ سے اس خالق و مالک کی صفتوں کا بھی علم حاصل کر سکتا ہے اور ان صفتوں کو خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے کسوٹی بھی بنا سکتا ہے، اس کے بعد اس کے لیے یہ سوال حل کر لینا بھی

کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس کے لیے زندگی بسر کرنے کی پسندیدہ روشن کیا ہے اور ناپسندیدہ روشن کیا ہے؛ بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی سعادت و شقاوت اور قوموں کے عروج و زوال سے متعلق کیا اصول جاری ہیں؛

انسان کی انفرادی و اجتماعی سعادت سے متعلق یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو سب سے پہلے حل ہونے چاہییں۔ ان کے حل ہو جانے کے بعد جہاں تک انسان کی عقلی و روحانی طمانیت کا تعلق ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ رہی اس کی مادی و جسمانی آسائش تو وہ اپنی سعی و کوشش اور اپنے تجربی علم کے ذریعے سے قدرت کے قوانین کے دریافت کرتے اور ان کو اپنے معاشی و تمدنی مصالح کی ترقی میں استعمال کرنے کا سلیقہ جس قدر بڑھاتا جائے گا، اسی قدر اپنی معاشی خوشحالیوں میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم

اس تفصیل سے ایک حد تک یہ بات تو واضح ہو گئی کہ حقیقی علم جس سے انسان کی رُوح اور اس کے دل کو طمانیت و تسلی حاصل ہوتی ہے۔ اس کا سرچشمہ خدا کی معرفت ہے، لیکن یہاں ہمیں مختصراً یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی معرفت کا صحیح مفہوم کیا ہے؛ اس مسئلہ کی وضاحت خاص طور پر اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ ہمارے اربابِ تصوّف کے یہاں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے معاً آدمی کا ذہن خدا کی ذات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن ہم اس لفظ سے ہرگز اس قسم کی کوئی چیز مراد نہیں لے رہے ہیں، ہمارے نزدیک اس سے خدا کے متعلق صرف ان باتوں کا جاننا مُراد ہے جن کو انسان جان سکتا ہے اور جن کو جان لینے کے بعد اس کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ معرفتِ الٰہی سے متعلق جس حد تک اس کے حیطۂ ادراک میں ہے وہ یہی ہے اس سے آگے نہ اس کی رسائی ہے اور نہ اس سے آگے کا علم اُس کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً:

الف: تفصیلی دلائل کے ساتھ اس بات کا علم کہ خدا ہے۔

ب: پُوری وضاحت کے ساتھ خدا کی صفات کا علم۔

ج: اس بات کا علم کہ فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو وہ پسند کرتا ہے اور فلاں فلاں باتوں اور کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔

۵: اس بات کا علم کہ وہ افراد اور جماعتوں کے ساتھ فلاں فلاں قوانین کے تحت معاملہ کرتا ہے۔

۶: اس بات کا علم کہ مرنے کے بعد بھی اسی سے سابقہ پڑنے والا ہے، اور وہ اپنے نیک اور بد بندوں کے ساتھ اس اس طرح کا معاملہ کرنے والا ہے۔

خدا کے متعلق اگر مذکورہ بالا باتیں ایسے دلائل کے ساتھ معلوم ہو جائیں جو دل کے اندر اطمینان پیدا کردیں تو پھر اس کی معرفت کے لیے کسی اور بات کے جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور اگر یہ باتیں ایک شخص کو معلوم نہ ہوں تو اگرچہ وہ اپنے خیال میں ہر آن تجلیات و انوار کا مشاہدہ ہی کر رہا ہو، لیکن درحقیقت وہ خدا سے بالکل بے خبر ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس معرفت کے مدارج ہوا کرتے ہیں، اس میں بھی شبہ نہیں کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف عارفین کی معرفت میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معرفت کسی شخص کے لیے محض قال ہوا کرتی ہے اور کسی کے لیے حال بھی بن جایا کرتی ہے۔ لیکن معرفت کی دسترس میں بہرحال وہی چیزیں آتی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ان سے آگے بڑھ کر اگر انسان خدا کی ذات کا مشاہدہ یا اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہے یا ذاتِ بحت کی تجلیات اور اس کے انوار دیکھنا چاہے تو یہ چیز اس کے امکان سے باہر ہے۔ انسان کو جو عقل ملی ہوئی ہے اس کی رسائی صرف خدا کی صفات ہی تک ہے خدا کی ذات کا وہ کوئی تصور کر ہی نہیں سکتی، اسی طرح انسان کو جو حواس عطا ہوئے ہیں وہ صرف خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں ہی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، خدا کی تجلیات اور اس کے انوار کا مشاہدہ ان کی قوتِ برداشت اور ان کے تحمل سے باہر ہے۔ قرآن مجید میں یہود کے متعلق بیان ہوا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک وہ ان کو ذاتِ الٰہی کا کھلم کھلا مشاہدہ نہیں کرائیں گے، اس وقت تک وہ ان کی یہ بات ہرگز باور نہیں کریں گے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبہ کو پسند کرنے اور اس کو قبول کرنے کی بجائے اس کو ان کی سرکشی اور حماقت کا نتیجہ قرار دیا اور بجائے اس کے کہ ان کی یہ خواہش معرفت الٰہی کی جستجو کا درجہ پاتی اور اس کے جواب میں ان کے لیے تجلیات و انوار کے دروازے

کھلنے ان کی یہ خواہش گستاخی قرار پائی اور اس کی سزا میں وہ جلالِ خداوندی کی ڈانٹ سے بے ہوش کر دیے گئے

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ	اور یاد کرو جب کہ تم نے موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم
حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ	تمہاری بات نہیں ماننے کے جب تک کہ ہم خود خدا
ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝	کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں ۔ تو تم کو کڑک نے آدبوچا
ثُمَّ بَعَثْنَٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ	اور تم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ۔ پھر ہم نے تم کو
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝	تمہاری بے ہوشی کے بعد اٹھایا تاکہ تم شکر گزار ہو

(بقرہ ۔ ۵۵ ۔ ۵۶)

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ انسان کے لیے خدا کی ذات کا مشاہدہ بالکل محال ہے وہ خدا کو صرف اس کی نشانیوں اور اس کے کرشموں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتا ہے ۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انہوں نے بھی خدا کی ذات کا مشاہدہ کرنے کی تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ تم میری ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے ۔ میری تجلیٔ ذات کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لا سکتا تو تم کس طرح لا سکو گے ؟ تم صرف میری نشانیوں کا اور میری صفات کے مظاہر کا مشاہدہ کر سکتے ہو ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ظاہر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے ۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوسَىٰ لِمِيقَٰتِنَا	اور جب موسیٰؑ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر
وَكَلَّمَهُۥ رَبُّهُۥ قَالَ رَبِّ	ہوا اور اس کے خداوند نے اس سے کلام کیا تو اس نے
أَرِنِىٓ أَنظُرْ إِلَيْكَ ۚ قَالَ لَن	درخواست کی کہ اے میرے خداوند ! مجھے موقع دے
تَرَىٰنِى وَلَٰكِنِ ٱنظُرْ إِلَى ٱلْجَبَلِ	کہ میں تجھے دیکھ لوں ، اس نے جواب دیا تم مجھے ہرگز
فَإِنِ ٱسْتَقَرَّ مَكَانَهُۥ فَسَوْفَ	نہ دیکھ سکو گے ، ہاں پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی
تَرَىٰنِى ۚ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُۥ لِلْجَبَلِ	جگہ پر ٹکا رہ جائے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے تو جب
جَعَلَهُۥ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ	اس کے خداوند نے پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر کی تو اس کو

صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (اعراف - ۱۴۳)

پاش پاش کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے ، پھر جب ہوش میں آئے تو بولے کہ تو پاک ہے میں نے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں پہلے ایمان لانے والا بنتا ہوں ۔

یہی بات احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے ۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

حجابه النور لو كشفه لاحرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه

اس کا نور حجاب ہے ، اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس کے چہرہ کے انوار سے وہ ساری مخلوق جل کے رہ جائے جہاں تک اس کی نظر پہنچے ۔

(مسلم)

اِس سے معلوم ہوا کہ ذاتِ الٰہی اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کی تاب حضرات انبیائے کرام بھی نہ لا سکے ، چہ جائیکہ عام لوگ ۔ اس وجہ سے جو لوگ خدا کی ذات اور اس کی تجلیات کے مشاہدہ کے درپے ہوتے ہیں اور اس غرض کے لیے مجاہدے اور مراقبے کرتے ہیں ، ہمارے نزدیک وہ ایک سعی لاحاصل میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے بارہ میں یہ کہنا بھی کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہ لوگ درحقیقت اسی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں جس گستاخی کے مرتکب بنی اسرائیل ہوئے ۔

بعینہٖ یہی حقیقت مختلف طریقوں سے حدیثوں میں بھی سمجھائی گئی ہے کہ اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور کرنے کی چھوٹ آدمی اسی وقت تک دے جب تک وہ اس کی صفات و آیات اور اس کی شانوں اور اس کے کرشموں پر غور کرے ۔ جب وہ حد سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات سے متعلق سوالات اٹھانے شروع کر دے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ وہیں رُک جائے ، اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگے ، کیوں کہ یہ سوالات اس کے ذہن میں شیطان کی وسوسہ اندازی ہی کے سبب سے پیدا ہو رہے ہیں اور اس کا نتیجہ حیرانی و درماندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے ۔ شیطان اس چکر میں اس کو صرف اس لیے ڈال رہا ہے کہ اس طرح اس کو کفر اور الحاد میں مبتلا کر دے ۔ اسی حقیقت کو مندرجہ ذیل حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

یاتی الشیطان احدکم فیقول من خلق کذا من خلق کذا حتی یقول من خلق ربک فاذا بلغہ فلیستعذ باللہ فلینتہ۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ)

ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور یہ سوال شروع کرتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی، فلاں چیز کس نے بنائی، یہاں تک کہ یہ سوال کرنے لگتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا، جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو اس کو چاہیے کہ شیطان کے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگے اور آگے سوچنا بند کر دے۔

معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ

معرفتِ الٰہی کی اہمیت اور اس کا اصلی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معرفت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب اس مسئلہ پر غور کرنے والے مختلف گروہوں نے مختلف دیا ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف تین گروہوں سے بحث کریں گے، ایک فلاسفہ، دوسرے متکلمین، تیسرے صوفیہ۔ ان گروہوں کے اندر بھی اس سوال کے جواب میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کے سبب سے ان میں سے ہر گروہ مختلف فرقوں میں بٹ گیا ہے۔ ہم ان اختلافات سے قطع نظر کرکے اس بارہ میں عام فلاسفہ، عام متکلمین اور عام صوفیہ، کی جو رائے ہے وہ اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

فلاسفہ کی رائے

فلاسفہ خواہ قدیم ہوں یا جدید، ان میں سے جو کسی نوعیت سے بھی خدا کے قائل ہیں (اور انہی سے یہاں بحث ہے) وہ خدا کی معرفت کے لیے انسان کی فطرت اور اس کی عقل کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیدا کرنے والے نے انسان کو عقل اور فطرت کی راہ نمائی دے کر اس کو کسی مزید غیبی راہنمائی کی ضرورت اور اس کی مداخلت سے بالکل مستغنی کر دیا ہے۔ عقل کا چراغ ہر تاریکی میں اجالا کرنے کے لیے اُن کے نزدیک کافی ہے۔ اس اندرونی ہادی کی راہنمائی حاصل ہو جانے کے بعد کسی معاملہ میں بھی انسان ان کے خیال میں اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے اپنے سے کسی

خارج رہنما کی طرف متوجہ ہو، ان کے نزدیک عقل انسان کے سارے طبیعی اور مابعد الطبیعی سوالات حل کر سکتی ہے اور اگر وہ نہیں حل کر سکتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری عقل ان سوالات کو حل کرنے کے قابل ہی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ابھی وہ ترقی کے اس درجہ پر نہیں پہنچی ہے کہ ان سوالات کو حل کر سکے۔ عقل کی راہنمائی پر یہ اعتماد صرف انہی فلسفیوں نے نہیں ظاہر کیا ہے جو رسالت اور نبوت کے سلسلہ کے منکر ہیں، بلکہ سلسلۂ نبوت و رسالت کے قائل فلسفیوں نے بھی عقل پر یہی اعتماد ظاہر کیا ہے۔ وہ بھی فلسفہ کے زیر اثر عقل کے ساتھ اس قدر حُسنِ ظن رکھتے ہیں کہ اس کو انسان کی راہنمائی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اگر مذہب کے زیر اثر دبی زبان سے کسی حد تک نبی اور رسول کی راہنمائی کی ضرورت تسلیم کرتے بھی ہیں تو محض عوام کالانعام کے لیے، فلاسفہ اور حکماء کو انبیاء کی راہنمائی کی ضرورت سے مستغنی کر دیتے ہیں۔

متکلمین کی رائے

اس کے بالکل برعکس نظریہ ہمارے متکلمین کی اکثریت (بالخصوص اشاعرہ) کا ہے۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور فطرت کو ان مابعد الطبیعی سوالات کے حل کے لیے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بالکل ناکارہ سمجھتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک عقل صرف انہی سوالات کا کچھ الٹا سیدھا حل معلوم کر سکتی ہے جن کا تعلق اس عالم محسوس سے ہے۔ اس عالم محسوس سے ماوراء حقائق تک پہنچنے کے لیے ان کے نزدیک عقل کے پاس کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے ان معاملات میں انسان ایک عاقل مخلوق ہونے کے باوجود ان لوگوں کے نزدیک بالکل ایک مادر زاد اندھے سے مشابہ ہے جو چند قدم چلنے کے لیے بھی کسی عصاکش کا محتاج ہوا کرتا ہے اور اگر عصاکش نہ ہو تو ہر قدم پر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے، چنانچہ عام فلاسفہ انسان کو کسی مافوق عقل راہنمائی سے جس شدت کے ساتھ بالکل مستغنی ثابت کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان سارے سوالات کو، جو انسان کی زندگی سے حقیقی تعلق رکھنے والے ہیں، صرف خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی حل کر سکتے ہیں، عقل سے یہ لوگ اس قدر بدگمان ہیں کہ عقل نہ صرف یہ کہ ان سوالات کا کوئی حل دریافت نہیں کر سکتی بلکہ ان سوالات کے جو حل انبیاء بتاتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک عقل ان کی قدر و قیمت بھی نہیں بتا سکتی۔ واضح تر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں میں عقل کو سرے سے کوئی دخل ہے ہی نہیں، یہاں تک کہ خود نبی کے

پہچاننے کے لیے بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی عقلی کسوٹی موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ نبی کو صرف اس کے معجزات کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں، اُس کی تعلیم، اس کی حکمت، اس کے کارناموں اور اس کے اخلاق کو اس کے پہچاننے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلّم اخلاقی اصولوں کے بارہ میں بھی عقل اور انسان کی فطرت کو کوئی فیصلہ کن معیار تسلیم نہیں کرتے، ان کے نظریہ کے لحاظ سے جھوٹ کی بُرائی اور سچ کی اچھائی بھی کوئی عقلی اور وجدانی شے نہیں ہے۔ انبیاء نے سچ کو اچھا کہا، اس وجہ سے وہ اچھا ہے، اور جھوٹ کو بُرا کہا اس وجہ سے وہ بُرا ہے۔ اگر وہ اس کے بالکل برعکس فیصلہ دے جاتے تو عقلی حیثیت سے جھوٹ کے اچھے ہونے اور سچ کے بُرے ہونے میں بھی کوئی قباحت اُن کے خیال میں نہیں تھی۔

صُوفیہ کی رائے

صوفیہ کے نزدیک خدا کی معرفت حاصل کرنے کا اصلی ذریعہ وجدان، کشف اور مشاہدہ ہے۔ ان لوگوں نے معرفت کا معیار جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس قدر اونچا رکھا ہے کہ وہاں تک عقلی اور استدلالی علم کے پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جس علم کی بنیاد استدلال پر ہو وہ ان حضرات کے نزدیک ایک پائے چوبیں ہے اور اس پائے چوبیں کے ذریعے سے معرفت کی منزل نہیں طے کی جاسکتی۔ ع

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں عقل کی نارسائیوں پر جو کچھ لکھا ہے اور جس زور سے لکھا ہے یہ ان کے اکیلے کی آواز نہیں ہے بلکہ انہوں نے درحقیقت صوفیہ کے ہر طبقہ کی ترجمانی کر دی ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کی یہ رائے صرف فلاسفہ اور حکماء ہی کے علم کے بارہ میں نہیں ہے کہ وہ معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے ناکارہ ہے اور اس کی حیثیت ایک پائے چوبیں کی ہے بلکہ وہ علم شریعت بھی جس کی بنیاد وحی پر ہے، ان حضرات کے نزدیک حقیقی معرفت کے مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اکابر صوفیہ کھلم کھلا

شریعت کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ بہرحال اس کی حیثیت ان کی نظر میں محض "علم ظاہر" کی ہے اور یہ علم ظاہر "ان کے نزدیک اس "علم باطن" کے برابر نہیں ہے جس کو وہ علم حقیقی سمجھتے ہیں اور جس کے متعلق انکا دعویٰ ہے کہ وہ شریعت سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیوں نے ترنگ میں آکر علم شریعت کے بارہ میں ایسے الفاظ استعمال کر دیے جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے "علم باطن" کے مقابلہ میں اس کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتے۔

مثلاً، ایک شیخ تصوف کا ارشاد ہے کہ:

"ہم اپنا علم ایک ایسی ذات سے حاصل کر رہے ہیں جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والی نہیں اور تم اپنا علم ایسے زندہ سے حاصل کر رہے ہو جسے ایک دن بہرحال مرجانا ہے۔"

ایک دوسرے بزرگ سے کہا گیا کہ:

"آپ عبدالرزاق سے حدیث حاصل کرنے کے لیے کیوں سفر نہیں کرتے؟" جواب میں ارشاد فرمایا:

"جو خود خلاق سے حاصل کر رہا ہو وہ عبدالرزاق سے کیا حاصل کرے گا۔"

ایک اور شیخ کا ارشاد ہے کہ:

العلم حجاب بین القلب وبین اللہ عزوجل — علم، اللہ اور دل کے درمیان ایک حجاب بن جاتا ہے

ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے:

اذا رأیت الصوفی یشتغل بحدثنا فاغسل یدك منه[1] — جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حدثنا اور اخبرنا کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو۔

---

[1] یہ اقوال ہم نے مدارج السالکین ج ۲ صفحہ ۲۳۹ سے لیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس علم کو قرآن مجید "العلم" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے کسی اور علم کے اتباع کو وہ اتباع ہوا اور اتباع ضلالت قرار دیتا ہے، اس علم کی قدر و قیمت ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ کے نزدیک کیا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ — اگر تم نے اس "العلم" کے بعد جو تمہارے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابل میں تمہارا کوئی کارساز اور (باقی صفحہ ۵۰ پر)

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کی حقیقت

صوفیوں کے نزدیک علم اور معرفت کے جو مدارج ہیں اور جس علم کو وہ علم اور جس معرفت کو وہ معرفت کہتے ہیں، ہم یہاں مختصراً اس کی وضاحت کریں گے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دوسروں کے معیارِ علم و معرفت اور ان کے معیارِ علم و معرفت میں کیا فرق ہے اور اس

(بقیہ صفحہ ۵۶) (بقرہ ۱۲۰) مددگار نہ ہوگا۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ	اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے، بعد اس کے
بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ	کہ تمہارے پاس العلم آچکا ہے تو تم اس وقت ظالموں
إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝	میں سے شمار ہو گے۔

(بقرہ۔ رکوع۔ ۱۷)

لیکن ہمارے صوفیوں کا ایک طبقہ اس علم کو حجاب سمجھتا ہے اور اگر وہ کسی کو اس علم کی طلب میں مشغول پاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی نگاہوں میں اس کی کچھ قدر ہو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ضائع ہو گیا۔ یہاں تک کہ صوفیوں کے نزدیک علم کی اصطلاح ہی سرے سے ایک حقیر اصطلاح بن گئی ہے، وہ جس علم کو علم تحقیقی سمجھتے ہیں، اس کو علم کی اصطلاح سے تعبیر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے انہوں نے اپنی ایک خاص اصطلاح "معرفت" کی وضع کی ہے اور جب وہ اپنے علم کو تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالکین میں ایک جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صوفیوں نے اپنے علم کے لیے علم کی جگہ معرفت کی اصطلاح اختیار کی ہے، لیکن انہوں نے اس کا سبب نہیں بیان کیا کہ آخر صوفیوں کو قرآن و حدیث کی اصطلاح کو چھوڑ کر ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ میرے نزدیک ان لوگوں کو اس نئی اصطلاح کے وضع کرنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ علم یا العلم کی اصطلاح علم وحی اور علم شریعت کے لیے معروف ہو چکی تھی اور اس علم کو یہ حضرات اپنے علم کے مقابل میں محض ایک علمِ ظاہر کی حیثیت دیتے تھے، اس وجہ سے انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کے لیے وہ کوئی اور اصطلاح وضع کریں جس کو وہ علم شریعت سے افضل و برتر سمجھتے ہیں اور جو اُن کے نزدیک علمِ حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم و معرفت کے حاصل کرنے کے ان کے ہاں ذرائع کیا ہیں۔ اس وضاحت کے لیے ہم پانچویں صدی ہجری کے مشہور امامِ تصوّف شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل ہروی حنبلی متوفّی ۴۸۱ھ کی یادگار تصنیف منازل السائرین سے پہلے علم کی حقیقت اور اس کے مختلف مدارج کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہم معرفت کی حقیقت اور اس کے مراتب پر ان کی رائے نقل کریں گے۔

علم کی حقیقت

شیخ الاسلام نے علم کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ وہ بدیہی علم جو آدمی کے حس و مشاہدہ میں آتا ہے یا جس کی بنیاد قابلِ اعتماد نقل و روایت پر ہے، یا جو سابق تجربات کی صحت پر مبنی ہے

۲۔ وہ علم خفی جو پاکیزہ جسموں کی پاکیزہ رُوحوں کے اندر نشو و نما پاتا ہے، جو بے ریا ریاضت کے پانی سے سیرابی حاصل کرتا ہے، جو بلند ہمت اشخاص انفاسِ صادقہ کے اندر خلوت کے اوقات اور دنیا کے ہنگاموں سے ناآشنا کانوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ وہ علمِ لدنّی جس کا وجود ہی اس کی سند ہے، جس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے، جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے۔

ان میں سے پہلے درجہ کے علم کی صوفیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے بھی اس کا ذکر بالکل ایک ابتدائی درجہ کی چیز کی حیثیت سے کیا ہے اور ایک لفظ بھی اس کے متعلق ایسا نہیں لکھا ہے جس سے ذرا بھی اس کی اہمیت محسوس ہوتی ہو۔ حالاں کہ علم شریعت بھی ان حضرات کے نزدیک اسی درجہ میں داخل ہے، اس لیے کہ وہی علم ہے "جس کی بنیاد قابلِ اعتماد نقل و روایت پر ہے"۔

دوسرے درجہ کے علم کے بارہ میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ:

هو علم يظهر الغائب ويغيب — یہ علم غیب کو ظاہر اور حاضر کو غائب کر دیتا ہے

لہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مدارج السالکین مطبوعہ مصر میں شروع میں منازل السائرین کا متن درج ہے میں یہاں اس کے مطالب اردو میں پیش کروں گا اور حتی الامکان ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کی کوشش کروں گا ـــــ جو اصحاب اصل عبارتیں دیکھنا چاہیں وہ مذکورہ کتاب کی طرف مراجعت کریں۔

الشهادة ویشیر الی الجمع   اور مقامِ جمع کی طرف رہبری کرتا ہے۔)

اس عبارت کی شرح اپنی طرف سے کرنے کی بجائے میں شیخ الاسلام کی کتاب کے سب سے بڑے شارح علامہ ابن قیم کے وہ الفاظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں، جو انھوں نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"وھو یظہر الغائب" کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز عارف سے اوجھل ہوتی ہے، یہ علم اس چیز کا کشف کر دیتا ہے۔ "ویغیب الشھادۃ" سے یہ مراد ہے کہ یہ علم عارف کو اس کے مشہودِ حقیقی کے سوا ہر چیز کے مشاہدہ سے بے خبر کر دیتا ہے۔ "ویشیر الی الجمع" میں وحدانیت و فردانیت کے مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں تمام رسوم و قیود مٹ جاتے ہیں، یہاں تک کہ خود شاہد بھی اپنے آپ کو اس فردانیت میں گم کر دیتا ہے[1]"

علم کا تیسرا درجہ جس کو شیخ الاسلام نے علمِ لدنی سے تعبیر فرمایا ہے، درحقیقت یہی علم اربابِ تصوف کے یہاں علم و معرفت کی حقیقی معراج ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام نے اس کی شان میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ "لیس بینہ وبین الغیب حجاب" علمِ لدنی اور غیب کے درمیان سرے سے کوئی پردہ حائل ہی نہیں رہ جاتا، اس کی تعریف میں بھی شیخ الاسلام نے جو فقرے ارشاد فرمائے ہیں، ان کی وضاحت بھی میں اپنی طرف سے کرنے کی بجائے بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کی تفسیر میں جو کچھ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے اس کو یہاں درج کر دوں، علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

"اسنادہ وجودہ" اس کا وجود ہی اس کی سند ہے، کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس کے علاوہ جو علم[2] ہے اس کے حصول کا راستہ اسناد ہے، اسی طرح اس علم کے حصول کا راستہ وجدان ہے۔ وادراکہ عیانہ۔ (اس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے) کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم فکر و استنباط سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کشف اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ونعتہ حکمہ۔ (جس کا حکم ہی اس

---

[1] مدارج السالکین مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۴۲   [2] یہ اشارہ صاف علمِ شریعت کی طرف ہے۔

کی تعریف ہے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ اپنی دلیل ہے، اس کی دلیل کہیں اور سے نہیں لانی پڑتی۔ وہ خود دلیل، اور خود مدلول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا، بخلاف علم کی دوسری اقسام کے کہ ان کے درمیان اور غیب کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے۔ صوفیوں کے نزدیک اس سے مراد ایک نور ہے جو مشہودِ حقیقی کی طرف سے عارف کی طرف آتا ہے اور وہ اس کے حواس کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو مٹا کر عارف کے اندر خود ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر وہ مشہودِ حقیقی کو اسی نور کے ذریعے سے دیکھنے لگتا ہے اور اس نور کے ظہور کے بعد مشہودِ حقیقی کے سوا عارف کی نظر میں سب کچھ فنا ہو جاتا ہے[۱]۔"

شیخ الاسلام کی اس پوری بحث پر ایک نظر دوبارہ ڈال کر وہ نتائج سامنے رکھ لیجیے جو اس سے نکلتے ہیں:

سب سے پہلے چیز تو یہ سامنے آتی ہے کہ معرفت کے نقطۂ نظر سے صوفیائے کرام کے نزدیک علم شریعت کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، علمِ شریعت جس کی بنیاد نقل و روایت پر ہے ان کے نزدیک بالکل ابتدائی درجہ کی چیز ہے، معرفت کے نقطۂ نظر سے جس علم کی اہمیت ہے وہ علم خفی ہے یا علمِ لدنی۔

علم خفی اور علمِ لدنی کو جس طرح نقل و روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح عقل و استدلال اور فکر و استنباط سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ تمام سِر، وجدان، کشف اور مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں۔

ان کے حصول کا راستہ، تعقل، تفکر اور استنباط و اجتہاد نہیں ہے بلکہ مراقبہ، توجہ، ریاضت اور خلوت گزینی ہے۔

یہ علم عارف کے حواس کو معطل کر کے خود اس کی جگہ لے لیتا ہے، اور عارف کو تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے مشہودِ حقیقی کے اندر گم کر دیتا ہے ۔ یہ علمِ غیب کے تمام پردے

---

[۱] مدارج السالکین جلد ۲ صفحہ ۲۴۳۔

اٹھا دیتا ہے اور عارف تمام حقائق کا گویا برای العین مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

اس بحث پر تنقید کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت اور اس کے مدارج پر شیخ الاسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کو بھی مختصراً ناظرین کے سامنے رکھ دیں تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ معرفت کا معیار صوفیائے کرام کے نزدیک کیا ہے؛

معرفت کی حقیقت

سب سے پہلے شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ: المعرفة احاطة بعين الشئ كما هو (معرفت کسی شے کی حقیقت کا اس طرح احاطہ کر لینا ہے جیسی کہ فی الحقیقت وہ ہے۔)

اس کے بعد علم کی طرح معرفت کے بھی شیخ الاسلام نے تین درجے قرار دیے ہیں اور لوگوں کو تین طبقات۔ عوام، خواص اور اخص الخواص۔ میں تقسیم کر کے ہر طبقہ کی معرفت اس کے درجہ کے اعتبار سے الگ الگ بتائی ہے۔

معرفت کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ خدا کی جن صفات اور کرشموں کا مظاہرہ اس کی مخلوقات و مصنوعات میں ہو رہا ہے اور جن کا بیان نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ اُن کی معرفت حاصل ہو۔ یہ معرفت، عوام کی معرفت ہے۔

معرفت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کی معرفت حاصل ہو، اس طرح کہ ذات اور صفات کے درمیان کوئی تفریق نہ واقع ہو۔ یہ خواص کی معرفت ہے۔

معرفت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ خدا خود اپنی معرفت کا نور عارف پر ڈال دے اور عارف کی معرفت اس نور میں گم ہو جائے، اس معرفت تک نہ استدلال کی رسائی ہے نہ اس تک کسی دلیل کی راہنمائی ہے اور نہ یہاں تک کسی وسیلہ کی پہنچ ہے۔ دل کا مشاہدہ، علم کے حدود و قیود سے آزادی اور مقامِ جمع کا مطالعہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ اخص الخواص کی معرفت ہے[1]

اب اس بحث کا جو خلاصہ نکلتا ہے اس کو بھی پیشِ نظر رکھ لیجیے۔

معرفت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کی اصل حقیقت کا جیسی کہ وہ فی الواقع ہے احاطہ

[1] معرفت کی یہ پوری بحث منازل السائرین سے ماخوذ ہے۔

کر لیا جائے۔

خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت جس کا ذریعہ انبیاء ہیں، یہ ابتدائی درجہ کی معرفت ہے، معرفت کا اونچا درجہ درحقیقت معرفت ذات کا درجہ ہے۔

حقیقی معرفت جو اخص الخواص کا حصہ ہے وہ عقل و استدلال اور دلیل و شہادت سے ایک بالکل ماوراء شے ہے۔ یہ معرفت جن کو حاصل ہو جاتی ہے وہ حقائق کو دلیل سے معلوم کرنے کی بجائے ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ وہ علم کے حدود و قیود سے بالاتر اور خود شہود حقیقی کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔

فلاسفہ اور متکلمین کے نظریات پر تبصرہ

اب ہم ان مختلف رایوں پر مختصراً تبصرہ کر کے یہ دکھائیں گے کہ ان میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا حصہ محض بے حقیقت خیال آرائی پر مبنی ہے۔

فلاسفہ اور متکلمین میں سے، ہر ایک نے جیسا کہ آپ نے دیکھا، ایک دوسرے کے بالکل ضد مسلک اختیار کیا ہے۔ ایک گروہ عقل کو اس قدر اچھالتا ہے کہ انسان کو بالکل آسمان پر پڑھا دیتا ہے اور دوسرا اس کو اس قدر گراتا ہے کہ وہ بالکل تحت الثریٰ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک عقل کی راہنمائی پر اس قدر اعتماد رکھتا ہے کہ انسان کو کسی مافوق عقل راہنمائی سے بالکل ہی بے نیاز اور مستغنی ثابت کر دیتا ہے، دوسرا عقل کو اس قدر ناقابلِ اعتماد ٹھہراتا ہے کہ انسان کو بالکل بے بصیرت اور اندھا بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ عقل نہ تو اس غیر معمولی احترام و اعتماد ہی کی مستحق ہے جس کا مستحق اس کو فلاسفہ نے گردانا ہے اور نہ اس توہین و تحقیر ہی کی سزاوار ہے جس کی سزاوار اس غریب کو متکلمین نے ٹھہرایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر سب سے بڑا انعام جو فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو عقل عنایت کی ہے، لیکن یہ عقل ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے بالکل کافی ہو اور اس کے بعد انسان کسی مافوق عقل کی راہنمائی کا محتاج نہ رہے۔ عقل تمام خوبیوں کے باوجود اپنے اندر متعدد ایسی خامیاں بھی رکھتی ہے کہ اس کی راہنمائی نہ تو کامل ہو سکتی ہے، نہ بے خطا۔ اوّل تو یہ جن حواسوں سے کام لیتی ہے، ان کی رسائی ہی بہت محدود

ہے، اس وجہ سے بہت سے سوالات، خصوصاً مابعد الطبیعی سوالات کے حل میں اس کے یہ وسائل و وسایط بالکل ہی ناکارہ ثابت ہو جاتے ہیں، دُوسرے وہ اپنے حواسوں کی فراہم کردہ معلومات سے جو کلیات ترتیب دیتی ہے اور پھر ان سے جو نتائج نکالتی ہے ان میں بھی وہ غلطیوں سے محفوظ نہیں، علاوہ ازیں وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی بھی کر سکتی ہے، وہ پست ہمت بھی ہو سکتی ہے۔ اور وہ مرعوب و خوف زدہ بھی ہو سکتی ہے اور اپنے نفسانی میلانات و رجحانات کے حق میں جانب دار بھی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ تمام انسانوں کی عقلوں کو جمع کر کے ان سب کی راہنمائی پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ انہی نقائص کی بنا پر، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اختلاف تو ان کے نتائج فکر میں لازماً رونما ہو کے رہے گا۔

تاہم عقل سے وہ مایوسی اور بدگمانی بھی غلط ہے جس کا اظہار متشککین نے کیا ہے۔ عقل کی رسائی محدود ضرور ہے لیکن یہ سمجھ لینا کہ وہ مابعد الطبیعی سوالات کے حل کرنے اور اخلاقی اقدار کی جانچ پرکھ کے معاملہ میں بالکل ہی کوری ہے، ایک سخت قسم کا مغالطہ بلکہ ایک کھلی ہوئی جہالت ہے۔ عقل اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باوجود ہماری رہنمائی بہت دُور تک کر سکتی ہے، وہ اس کائنات کے مطالعہ اور اس کے اندر جو نظم و حکمت ہے، اس کے مشاہدہ سے نہ صرف ایک خالق کا بلکہ خالق کی بہت سی صفات کا بھی اندازہ کر سکتی ہے۔ وہ خالق کی صفات سے خالق کی پسند اور ناپسند کے متعلق بھی ایک تصور قائم کر سکتی ہے، وہ اس دنیا کے نظام اور اس کے سنن و قوانین کے مطالعہ سے ایک روز جزا و سزا کا بھی خیال کر سکتی ہے، وہ انسانی فطرت کے اندر ودیعت کردہ اسلامی یقینیات سے خیر و شر کے اصول بھی متعین کر سکتی ہے۔ وہ یہ ساری باتیں کر سکتی ہے، البتہ اس طرح نہیں کر سکتی کہ اس کے کیے ہوئے کو بالکل کامل سمجھا جا سکے یا اس کی صحت و صداقت پر پُورا بھروسہ کیا جا سکے، بس یہ خرابی اس کے کام میں ایک ایسی خرابی ہے جس کے سبب سے راہنمائی کے معاملہ میں تنہا اسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا بالخصوص ایسے معاملات میں جن پر انسان کی حقیقی طمانیت و مسرت اور اس کی انفرادی و نوعی سعادت و کامرانی کا انحصار ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فلاسفر نے عقل پر جو اعتماد کیا ہے، وہ بھی بالبداہت غلط ہے اور متشککین نے اس کو جو بالکل خارج از بحث قرار دے دیا ہے وہ بھی صریحاً حقیقت کے بالکل خلاف

ہے، حق ان دونوں کے درمیان ہے۔

شیخ الاسلام کے نظریات پر تبصرہ

اب آئیے شیخ الاسلام کے نظریات کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ اس میں کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ ہم شیخ الاسلام[1] کے خیالات کے اس حصہ کو زیر بحث نہیں لائیں گے جس میں کسی پہلو سے اختلافِ رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے بلکہ ان کی صرف انہی غلطیوں کا سامنے لائیں گے جو بالکل واضح ہیں اور جن کی کوئی توجیہہ دلائل کی روشنی میں ممکن نہیں ہے۔ ہمیں شیخ الاسلام کے نظریات پر مندرجہ ذیل اصولی اعتراضات ہیں:

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام نے شریعت کے علم کو کشف، مشاہدہ اور الہام کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے مقابل میں حصولِ معرفت کے نقطۂ نظر سے فروتر ٹھہرایا ہے، حالاں کہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ علم شریعت کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی میں کسی وہم، کسی وسوسہ، کسی نفسانی خیال آرائی اور کسی شیطانی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے کیوں کہ انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس علم کی بنیاد وجدان اور کشف و مشاہدہ یا الہام وغیرہ پر ہو اس میں ہر قسم کی شیطانی اور نفسانی مداخلت کا امکان ہوتا ہے کیوں کہ کسی بڑے سے بڑے عارف اور کسی بڑے سے بڑے صوفی کے متعلق بھی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ شیخ الاسلام نے علم لدنّی کے بارہ میں نہ صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ فکر و استنباط سے بالاتر ہے بلکہ اس کو بجائے خود دلیل کی حیثیت دے ڈالی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صحت و صداقت کسی دوسری دلیل کی تصدیق و تائید کی محتاج نہیں رہی جس طرح ایک نبی کو وحی کے ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی تصدیق و تائید کے لیے وہ کسی

---

[1] یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ نظریات تنہا شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل ہروی ہی کے ہیں، ہم نے شیخ الاسلام کو تمام اکابر تصوف کے ایک قابلِ اعتماد نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کیا ہے، جو نظریات شیخ الاسلام کے ہیں، کم و بیش وہی نظریات دوسرے اکابر تصوف کے بھی ہیں اور اگر کسی کے نظریات بنیادی طور پر شیخ الاسلام کے نظریات سے الگ ہیں تو اس کو تصوف کے زمرہ ہی سے الگ سمجھنا چاہیے۔

خارجی شہادت کا محتاج نہیں رہتا۔ اسی طرح ایک عارف بھی اپنے وجدان یا اپنے کشف یا مشاہدہ یا الہام کے ذریعہ سے جو علمِ لدنّی پاتا ہے اس کو کسی اور کسوٹی پر اس کو جانچنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے "اس کا وجود ہی اس کی سند ہے۔

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام کی یہ بات دین میں ایک شدید قسم کا فتنہ ہے۔ علم خفی ہو یا علم لدنّی اس کو بجائے خود دلیل تسلیم کر لینے کے معنی تو یہ ہوئے کہ عارفین کو انبیاء کا درجہ دے دیا جائے اور ان کے کشف و مشاہدہ اور ان کے الہام کو بالکل ہم پایۂ وحی بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شخص کے لیے اسلام پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ کشف و الہام کے ذریعہ سے علم کے حصول کے ہم منکر نہیں ہیں لیکن یہ علم قابلِ قبول صرف اسی حالت میں ہونا چاہیے جب یہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر یہ شریعت کے خلاف ہو تو لازماً یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اس کو قبول کر لینا دیدہ دانستہ اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

اگر اس کشفی یا الہامی علم کو اس درجہ اہمیت دے دی جائے کہ یہ کتاب و سنت کی طرح بجائے خود دلیل بن جائے تو اس سے جس طرح کے فتنے پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فیوض الحرمین سے ان کی ایک "تحقیق شریف" نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

تحقیق شریف:- الاولیاء کثیرا	ایک نہایت اعلیٰ تحقیق یہ ہے کہ بہت سے
ما یلھمون بان اللہ تعالیٰ	اولیاء پر یہ الہام کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
اسقط عنھم التکلیف وانہ	ان کو تمام شرعی احکام کی تعمیل سے بری کر دیا
خیرھم فی الطاعات ان	ہے اور ان کو طاعت و عبادت کے معاملہ
شاءوا فعلوھا وان لم یشاءوا	میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو کریں
لم یفعلوھا۔ حکی لی سیدی	اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں۔ مجھ سے میرے والدِ
الوالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ	ماجد نے خود اپنے بارہ میں یہ بیان فرمایا کہ خود
عن نفسہ انہ الھم بھذا و	ان کو بھی اسی طرح کا الہام ہوا تھا لیکن انھوں نے

انه دعا الله تعالى ان يقيم
عليه التكليف وما اختار
الا التمس ولم يكن من
مذهبه سقوط التكليف
عن احد من خلق الله مادام
عاقلا بالغا فرأيته يرى
الالهام حقا ويرى مذهبه
حقا ويتحير فى التطبيق
واخبرت عن سيدى العم
قدس سره ان كان يخبر
عن نفسه انه الهم بسقوط
التكليف وقيل له ان عبدت
طمعا فى الجنة فانا وعدناك
ان ندخلك اياها وان
عبدت طلبا لرضانا فقد
رضينا عنك رضا لا سخط
بعده فقال ربى انما اعبدك
لا لشىء دونك ـ وكان قدس
سره يميل الى ان الكمل
يسقط عنهم التكليف والله
سبحانه هو الذى يقيم
عليهم النواميس من غير
اختيارهم هكذا ارى

اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ ان کے اوپر
شرعی ذمہ داریوں کو قائم رکھے اور انہوں نے
قوانین و احکام کی پابندی ہی کو اختیار کیا، ان
کا مسلک یہ نہیں تھا کہ کوئی عاقل و بالغ شرعی
ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جا سکتا ہے لیکن
میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے الہام کو بھی حق
سمجھتے ہیں اور اپنے مسلک کو بھی حق سمجھتے ہیں
اور ان دونوں کے درمیان تطبیق دینے میں ان
کو کچھ حیرانی سی پیش آ رہی ہے۔
مجھے میرے عم بزرگوار کی نسبت بھی یہ معلوم ہوا
کہ وہ بھی اپنی بابت یہ فرماتے تھے کہ ان کو بھی
ذمہ داریوں سے بریت کا الہام ہوا تھا۔ ان کو
غیب سے کہا گیا تھا کہ اگر تم کو جہنم سے پناہ دی
اور اگر تم جنت کی آرزو میں ہماری عبادت
کرتے تھے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تم
کو اس میں ضرور داخل کریں گے۔ اور اگر تم ہماری
خوشنودی کی طلب میں ہماری عبادت کرتے
تھے تو ہم تم سے ایسے راضی ہوئے کہ اب اس
کے بعد کبھی ناخوش نہ ہوں گے، تو انہوں نے کہا
کہ اے رب! میں تیری عبادت محض تیرے لیے
کرتا ہوں کسی اور غرض کے لیے نہیں کرتا ہوں۔
عم بزرگوار کا میلان اس بات کی طرف تھا کہ
کاملین سے شرعی ذمہ داریاں ساقط کر دی جاتی

عن کثیر من اولیاء اللہ تعالیٰ۔	ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے اوپر ان کے اختیار کے بغیر شرعی قوانین کو جاری رکھتا ہے اور اسی قسم کی روایت دوسرے بہت سے اولیاء اور کاملین سے ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اس قسم کے الہامات کو رحمانی سمجھنے کا تعلق ہے شاہ صاحب کے والدِ بزرگوار اور عمِ بزرگوار دونوں حضرات ایک ہی رائے رکھتے تھے، البتہ ان دونوں بزرگوں کی رائیں اس بارہ میں مختلف تھیں کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بری کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟ شاہ صاحب کے والد ماجد کا مذہب یہ تھا کہ شرعی ذمہ داریوں سے کوئی شخص بھی بری نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کے عمِ بزرگوار کا مذہب یہ تھا کہ کاملین شرعی ذمہ داریوں سے بری تو کر دیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اختیار کے بغیر ہی ان کو تمام شرعی تکالیف کا پابند بنائے رکھتا ہے۔

خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بارہ میں اپنے عمِ بزرگوار کے مسلک کے مؤید معلوم ہوتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے عمِ بزرگوار کا مذکورہ بالا مسلک نقل کرنے کے بعد اس کا فلسفہ بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

والسّرّ فی ذالک عندی	میرے نزدیک اس کے اندر رمز یہ ہے کہ
ان الانسان اذا انتقل عن	آدمی جب ان شرعی احکام پر ایمان غائبانہ
الایمان بالغیب بھذا النوامیس	کے درجہ سے ترقی کر کے ایمان شہادت
الی الایمان بھا علی بینۃ	(ایمان علی بینہ) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے
ووجد ھذا العبادات و	اور ان عبادات و احکام کی طلب اپنے اندر
النوامیس فی نفسہ مثل	اسی طرح محسوس کرنے لگتا ہے، جس طرح
الجوع والعطش مما لا	بھوک اور پیاس کو محسوس کرتا ہے جن کو چھوڑنے
یقدر علی ترکہ فلا معنی	پر وہ قادر نہیں رہتا تو پھر ان چیزوں کا اس

لہ یہ عبارات فیوض الحرمین صفحہ ۴۳، ۴۴ سے نقل کی گئی ہیں۔

لتعلق التکلیف بھا لانھا من الجبلۃ التی جبل علیھا۔

کو مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں کیوں کہ یہ چیزیں تو اب اس کی جبلت بن چکی ہیں، جن پر وہ پیدا ہوا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کے الہامات کو اپنے والد ماجد اور عم بزرگوار کی طرح رحمانی سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کا ارشاد ہے: والحق عندی ان الالہام کلہ حق[1] بلکہ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ کاملین جن کو ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالشہادۃ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے وہ شرعی تکالیف سے بری کر دیے جاتے ہیں کیونکہ شرعی تکالیف ان کے لیے بالکل اضطراری نوعیت کی چیز بن جاتی ہیں، جن سے انحراف ان کے لیے ممکن ہی نہیں رہ جاتا، جس طرح وہ طبعی قوانین کی مجبورانہ اطاعت کرتے ہیں اور جس طرح وہ بے بس ہو کر جبلی تقاضوں کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح وہ شرعی احکام کی بھی تعمیل بالکل بے بس ہو کر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو شرعی تکلیف کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اس دلیل کی بنا پر کہ ان کاملین کے لیے شرعی احکام و قوانین جبلی تقاضوں کی حیثیت حاصل کرتے ہیں یہ کہا جا سکتا کہ ان کو شرعی احکام کا مکلف بنائے رکھنے کے کوئی معنی نہیں تو بعینہ اسی دلیل کی بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جب یہ کاملین ان شرعی احکام کی تعمیل پر جبلی طور پر مجبور ہیں تو ان کی ذمہ داریوں سے ان کو بری قرار دینے کے بھی کوئی معنی نہیں، کیوں کہ کسی چیز سے بری قرار دینے کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اختیار موجود ہو، جب اختیار ہی سلب ہو چکا تو بری قرار دینا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو معذورین و مجبورین کے زمرہ میں شمار کیے جانے کے سبب سے غیر مکلف سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ مرتبہ اسلامی شریعت میں کاملین کا نہیں بلکہ نابالغوں اور مجانین کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام عذاب و ثواب اختیاری اعمال

---

[1] یہ عبارت فیوض الحرمین صفحہ ۲۳، ۲۴ سے نقل کی گئی ہے۔

پر مرتب ہوتا ہے تو جب یہ اعمال ان کاملین کے لیے اختیاری باقی نہیں رہے تو ان پر ان کو اجر و ثواب کس بات کا ملے گا؟

تیسری بات یہ ہے کہ انبیائے کرام کا ایمان قرآن کی تصریح کے مطابق علیٰ بینہ ہوتا ہے چنانچہ حضرت نوحؑ فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۲۸ ہود) اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک بینہ پر ہوں۔

حضرت صالحؑ فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۶۳۔ ہود)

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۸۸۔ ہود)

لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی کے متعلق بھی کوئی ادنیٰ اشارہ ہمیں اس بات کا نہیں ملتا کہ ان کو کبھی اس بات کا الہام ہوا ہو کہ ان کو شرعی تکالیف سے بری قرار دے دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کو برابر یہی تاکید ہوتی رہی کہ جو کچھ تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اس پر برابر جمے رہو اور سر مو اس سے تجاوز نہ کرنا۔ حالاں کہ شرعی تکالیف اگر کسی کے لیے جبلی چیزیں بن سکتی ہیں تو سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں لیکن جب وہ آخر دم تک مکلف رہے اور دوسروں سے زیادہ مکلف رہے تو تابہ دیگراں چہ رسد۔

ہمارے نزدیک اس طرح کا الہام یا کشف کاملین کو تو ہو سکتا ہے، لیکن ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ الہام یا کشف رحمانی بھی ہو سکتا ہے۔ رحمانی کشف اور رحمانی لقا ہمیشہ بندہ کو صحیح سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ بندہ کو فتنہ میں نہیں ڈالتا فتنہ میں ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ یہ کام رحمان کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں نبیوں اور رسولوں پر وحی نازل فرمائی لیکن یہ وحی ہمیشہ شرعی ذمہ داریوں کے اٹھانے کی تاکید کے ساتھ نازل ہوئی، نبی کے لیے بھی اور اس کی امت کے لیے بھی، ہم کو انبیاء کے پورے گروہ میں سے کسی کے بارہ میں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کو ایک مرتبہ بھی وحی یا کشف کے ذریعہ سے یہ بتایا گیا ہو کہ اب وہ شرعی فرائض اور ذمہ داریوں سے بری کر دیے گئے ہیں، اگر انبیاء کرام

کی زندگیوں میں اس طرح کی کوئی چیز ملتی ہے تو اس کی نوعیت یا تو شیطانی وسوسہ کی ہے جس سے انہوں نے اللہ کی پناہ مانگی ہے یا پھر انسانی داعیہ کی ہے جس کی انہوں نے اصلاح فرمائی ہے مثلاً ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہؐ! جب آپؐ کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے تو آپؐ نوافل میں اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں آپؐ نے فرمایا:

افلا اکون عبدا شکورا — کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں

اگر کاملیت کا انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوتا کہ کامل کو شرعی تکالیف ہی سے بری قرار دے دیا جاتا تو سب سے بڑھ کر کامل اور اکمل تو حضور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی، لیکن قرآن کی کسی آیت یا آپؐ کی حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپؐ کو زندگی کے کسی دور میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کے لیے ہوا ہو کہ آپؐ کو شرعی ذمہ داریوں سے کسی پہلو سے بھی سبکدوش کیا گیا ہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس کمالِ عبدیت میں آپؐ جتنے ہی آگے بڑھتے گئے شرعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی قدر بڑھتا گیا۔

ہم یہاں چند آیتیں ایسی نقل کرتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی زندگی کے آخری دور میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی بندگی میں زیادہ سے زیادہ سرگرم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے،

سورۂ الم نشرح میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ — پس جب تم فارغ ہو جاؤ، اپنے رب کی بندگی میں کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی طرف جھک پڑو۔

جس سورہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تاویل کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قربِ وفات کی پیشین گوئی ہے عین اسی سورہ میں آپؐ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ — جب اللہ کی مدد اور فتح آئے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو

فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ	رہے ہیں تو اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ	تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۙ	وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

ایک جگہ صاف صاف یہ ہدایت ہے کہ اپنے رب کی بندگی پر جمے رہو، یہاں تک کہ موت آجائے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ	اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو، یہاں
الْيَقِيْنُ	تک کہ موت آجائے۔

تمام اہل تاویل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں یقین سے مراد موت ہے بہرحال اس قسم کا القا خدا کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا، اگر ہو سکتا ہے، تو شیطان کی طرف سے ہو سکتا ہے وہ بلاشبہ کاملین کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ آخرت کی فلاح و کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے انہوں نے کر لیا۔ اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس کوشش میں اگر اس کو کچھ زیادہ کامیابی بالفرض نہ بھی ہو، صرف اتنی ہی کامیابی ہو جائے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنے عمل کو زیادہ اہمیت ہی دینے لگ جائے تو یہ بھی اس شخص کی آخرت کی بربادی اور شیطان کی بہت بڑی کامیابی ہے اور اہل تقویٰ اس فتنہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر شیطان کے اسی وسوسہ کو کوئی بزرگ اپنی سادہ لوحی سے سچ مچ القاء رحمانی ہی سمجھ بیٹھیں اور اس کی تعمیل میں تمام شرعی تکالیف سے چھٹکارا بھی حاصل کر لیں، تب تو سمجھیے کہ شیطان کو سو فی صدی کامیابی حاصل ہو گی۔ ہمارے نزدیک اس قسم کے الہامی اور کشفی علوم کو بجائے خود دلیل اور معیار قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے جس سے کسی طرح بھی بچا نہیں جا سکتا اسی چیز سے ہزار ہا بدعات پیدا ہوئی ہیں اور اگر اس کا دروازہ کھلا رہے تو اس سے ہزار ہا بدعات آئندہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ بہت سے مبتدع صوفیوں نے اسی قسم کے غیبی اشارات کو آڑ بنا کر اپنے آپ کو شرعی ذمہ داریوں سے بری قرار دے لیا۔ جس کے سبب سے وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی انہوں نے گمراہ کیا، اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

۳۔ اس علمِ لدنی کے متعلق شیخ الاسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

لیس بینہٗ و بین الغیب حجاب۔ — اس کے درمیان اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔

جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ جس کو علمِ لدنی حاصل ہو اس کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالبداہت قرآن کے خلاف ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے، اس کے سوا نہ کسی انسان کو حاصل ہے نہ کسی فرشتہ کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ نبیوں اور فرشتوں کا ہے، لیکن قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے نہ براہِ راست خطاب کر سکتے ہیں نہ غیب سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اگر ان سے خطاب کرتا ہے تو یا تو وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے یہ نہیں ہوتا کہ ان کے لیے سارے حجابات اٹھا دیے جاتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (۵۱ - زخرف)

اور کسی انسان کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے، مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ میں یا اس کے پاس وہ اپنا کوئی فرستادہ (فرشتہ) بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے اس کی طرف وحی کر دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اللہ بہت بلند اور حکمت والا ہے۔

اسی طرح یہ بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے بندوں کی مصلحت کے لیے کسی نبی یا رسول کو اپنے غیب کی باتوں میں سے کچھ باتوں سے باخبر کر دے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ

وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب سے کسی کو باخبر نہیں کرتا ہاں اگر کسی رسول کو منتخب کرے تو اس کے آگے اور پیچھے اپنے

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا۔ پہرہ دار مقرر کرتا ہے؛

انبیاء کی دعوت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتے ہیں، وہ بلاتے ہی انہی لوگوں کو ہیں جو عقل و استدلال سے کام لینے، آفاق و انفس میں خدا کی جو نشانیاں ہیں، ان پر غور کرنے اور ان کے نتائج کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں، وہ ان لوگوں کو اپنی دعوت کے لیے بالکل بیکار سمجھتے ہیں جو تفکر و تدبر کی بجائے ہر حقیقت کے مشاہدہ و معائنہ کے طالب ہوں، جو لوگ غیب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اللہ کو ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہیں، قرآن میں ایک جگہ بھی ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس دنیا میں مشاہدۂ غیب کو حکمتِ الٰہی کے بالکل خلاف اور اس قسم کے ایمان کو بالکل غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں اصلی آزمائش ہی یہی ہے کہ آدمی مشاہدۂ غیب کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور انبیاء کی گواہی کی بنا پر حق کو ماننے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسا علم ہے جو غیب کے پردوں کو اٹھا دیتا ہے اور اس دنیا میں وہ انسانوں کو حاصل بھی ہو سکتا ہے تو اس کے پانے کے سب سے زیادہ مستحق حضراتِ انبیائے کرام ہی ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اس علم سے آگاہ نہیں کیا حالانکہ ان کی قوموں کی طرف سے برابر یہ مطالبہ رہا کہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو غیب کا مشاہدہ کرا دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا کہ اس دنیا میں غیب کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، پھر کس طرح ممکن ہے کہ جو چیز انبیاء کو نہیں عطا کی گئی اور جس کا دیا جانا حکمتِ الٰہی کے خلاف قرار دیا گیا، وہ صوفیوں کو حاصل ہو گئی؟

یہاں اس قصہ سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو جو سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور خضر کا بیان ہوا ہے۔ خضر کو جو علم عطا ہوا تھا اس کے متعلق قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس علم نے ان کے لیے غیب کے تمام پردے اٹھا دیے تھے۔ اس سے زیادہ جو کچھ نکلتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند معاملات میں خضر کو اپنی مشیت کی تنفیذ کا واسطہ بنایا تھا اور ان کے اوپر ان معاملات کی حکمت بھی کھول دی تھی۔ جہاں تک حضرت موسیٰؑ

کا تعلق ہے انہوں نے خضر کی باتیں جو گوارا کیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے یہ ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان کے پاس ایک خاص امر کی تعلیم کے لیے جائیں ان کا خدا کی طرف سے خضر کے پاس جانا خود اس بات کی دلیل تھا کہ خضر خدا کے خاص بندے ہیں۔ ان کا علم قابلِ اعتماد ہے اور ان کا عمل خدا کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خضر کی وہ باتیں جو ان کی نگاہ میں حق کے خلاف نظر آئیں محض اس وجہ سے گوارا کیں کہ ان کو وحی کے ذریعہ سے خضر کے اوپر اعتماد کرنے کی ہدایت ہوئی تھی اگر وحی کے ذریعے سے ان کو خضر پر اعتماد کرنے کی ہدایت نہ ہوتی تو یقیناً حضرت موسیٰ خضر کے ایک فعل کو بھی برداشت نہ کرتے۔ خود خضر نے بھی آخر میں حضرتِ موسیٰ کو یہی اطمینان دلایا کہ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنے جی سے نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر نے چند کام حضرت موسیٰؑ کے سامنے ان کو اس بات کی تعلیم دینے کے لیے کیے کہ خدا کے کام اگرچہ بظاہر کتنے ہی بے حکمت نظر آئیں لیکن ان کے اندر نہایت گہری حکمت ہوتی ہے جس کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور یہ کام انہوں نے براہِ راست خدا کے احکام کے تحت اسی طرح انجام دیے جس طرح فرشتے اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت کی تنفیذ کا واسطہ جس طرح فرشتوں کو بناتا ہے، اسی طرح کسی انسان کو بھی اگر اس نے کسی مصلحت کے تحت کسی وقت بنایا تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ لیکن اس چیز کو آڑ بنا کر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی اقدام شریعت کے خلاف کر ڈالے اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا یہ فعل شریعت کے خلاف ہے تو وہ یہ جواب دے کہ میں نے تو یہ براہِ راست خدا کے حکم کے تحت اس کی مشیت کی تنفیذ کی ہے کیوں کہ دوسروں کے پاس اس کے صدق و کذب کے جانچنے کا ذریعہ وحی الٰہی ہی ہے اور وحی الٰہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ اب حق و باطل کی کسوٹی قرآن و سنت ہے، اگر کسی شخص کا فعل کتاب و سنت کے خلاف ہو تو وہ اس عذر پر کتاب و سنت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا کہ اُس نے یہ جو کچھ بھی کہا یا کیا ہے علم لدنّی کی رہنمائی کے تحت کیا ہے اور یہ علم بجائے خود دلیل ہے، اس کو کسی اور کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۴ شیخ الاسلام نے معرفت کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ :

المعرفۃ احاطۃ بعین الشیٔ کما ھو — معرفت یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت کا جیسی کہ وہ ہے، احاطہ کر لیا جائے۔

معرفت کی اس تعریف کی رو سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی معرفت نہیں حاصل کی جا سکتی چہ جائیکہ خدا کی ذات اور اس کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو سکے اس طرح معرفت ہم اس ہوا کی بھی حاصل نہیں کر سکتے جس کے اندر ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں، اس پانی کی بھی نہیں کر سکتے جس کو پیتے ہیں، اُس سورج کی بھی نہیں کر سکتے جس کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت اگر ہم خود اپنے وجود کی بھی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ہمارے لیے محال ہے اگرچہ ہمارے وجود سے زیادہ ہم سے قریب تر شے کوئی بھی نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس طرح کی معرفت ہم زمین پر رینگنے والی کسی ننھی سی چیونٹی کی بھی حاصل نہیں کر سکتے پھر غور کیجیے کہ انسان جب اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی کما حقہٗ معرفت حاصل نہیں کر سکتا تو اُس کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے جو ہمارے خیال و گمان اور قیاس و وہم سب سے بالا تر ہے

ع

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

۵ معرفت کی اس تعریف کے بعد ستم یہ ہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال کی معرفت کو بالکل ابتدائی درجہ کی چیز بتایا گیا ہے، معرفت کا دوسرا درجہ جو خواص کا حصہ ہے، ان حضرات کے نزدیک معرفتِ ذات سے شروع ہوتا ہے، حالاں کہ انسان خدا کی ذات کی کما حقہٗ معرفت تو درکنار اس کا سرے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کی صفات مثلاً سمع، بصر، علم، قدرت وغیرہ کا تصور تو انسان کچھ کر سکتا ہے (اگرچہ وہ کتنا ہی ناقص ہو) کیوں کہ ان صفات کی ایک جھلک وہ اپنے اندر بھی پاتا ہے، لیکن خدا کی ذات کا تصور کرنے کے لیے تو اس کے تمام ذخیرۂ معلومات میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے جس قدر بھی بحث کی ہے خدا کی صفات، اس کے افعال اور اس کے قوانین و سنن سے کی ہے۔ اس کی ذات سے کوئی بحث نہیں کی ہے اور اس بات کی صاف تصریح کر دی ہے کہ اس دنیا میں انسان خدا کی ذات

کی تجلی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ احادیث میں خدا کی ذات کے سوال پر غور کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے کیوں کہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے انسان کے پاس سرے سے کوئی ذریعہ ہے ہی نہیں۔ اگر وہ اس سوال پر غور کرے گا تو حیرانی و درماندگی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوگا اور حیرانی و درماندگی بجائے اس کے کہ انسان کو کچھ دے اس سے وہ کچھ بھی چھین لیتی ہے جو اس کے پاس پہلے سے ہوتا ہے، چنانچہ اس بات کا تو حضرات صوفیائے کرام کو بھی اقرار ہے کہ جس کو تجلیٔ ذات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات فرائض و واجبات بھی چھوڑ بیٹھتا ہے[1]۔

ہمارے نزدیک تجلیٔ ذات اوّل تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کسی کو حاصل نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی شخص اس کے در پے ہو تو وہ کچھ پانے کے بجائے الٹے وہ بھی کھو آتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔

۴ معرفت کا تیسرا درجہ جس کو اخص الخواص کا حصہ قرار دیا گیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خالص وحدت الوجود کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو علم کے حدود و قیود سے بالکل بالاتر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم سے مراد علم شریعت ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ علم شریعت نہ تو اس معرفت کا وسیلہ و ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ وہ اس معرفت پہ کوئی حکم ہی لگا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ ان حضرات کے نزدیک عارف ایک صاحب حال ہے اور ایک صاحب حال نے کشف اور مشاہدہ سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس پر مجرد ایک صاحب قال کو کوئی حکم لگانے کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نظریہ بنیادی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارہ میں انسان کو اپنے جی سے کچھ کہنے کا حق نہیں دیا ہے بلکہ صاف صاف فرمایا ہے کہ اپنی ذات و صفات کو اللہ تعالیٰ خود ہی جانتا ہے انسان اس کو اپنے محدود ذرائع علم سے کما حقہٗ نہیں جان سکتا، اس وجہ سے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ظن و گمان اور اپنے کشف و مشاہدہ کی بنا پر خدا کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے اللہ کی وحی کو رہنما بنائے اور اس کے بارہ میں وہی کچھ مانے جو خود اس نے اپنے متعلق بتایا ہے۔

---

[1] مدارج السالکین ص ۸۷ ج ۲۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

پس تم اپنے جی سے اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، اپنے آپ کو اللہ ہی جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

اگر کوئی شخص خدا کے بارہ میں کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جو خود خدا کے پیش کردہ تصور سے مختلف ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کو اپنے کشف یا مشاہدہ کے ذریعہ سے خدا کی یہی معرفت حاصل ہوئی ہے تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شخص یا تو کسی وہم میں مبتلا ہے یا غلط بیانی کر رہا ہے۔

خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسلک

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خدا کی معرفت سے متعلق فلاسفہ، متکلمین اور اربابِ تصوّف نے جو نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ خلا ہے، اب ہم مختصراً بتائیں گے کہ خدا کی معرفت کا بالکل صحیح اور قابلِ اطمینان ذریعہ کیا ہے؟

ہمارے نزدیک خدا کی معرفت کا صحیح اور قابلِ اطمینان ذریعہ انبیا علیہم السلام ہیں لیکن ہمارے اس کہنے کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ عقل و فطرت کو وجدان اور کشف کو معرفت الٰہی میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے کہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ عقل یا کشف وغیرہ کے ذریعہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے اس میں غلطی اور وہم کے امکانات ہیں اور انبیاء کا طریقہ غلطی اور وہم کے تمام امکانات سے محفوظ ہے، انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کی بنیاد جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے عقل اور فطرت ہی پر ہے اور اس کے اندر وجدان اور کشف کو بھی دخل ہے، لیکن ان کے طریقہ میں چونکہ عقل یا وجدان تنہا کام نہیں کرتے بلکہ وحی الٰہی کی راہنمائی بھی ان کی مدد کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس طریقہ میں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ انسان کسی غلطی یا گمراہی میں مبتلا ہو سکے۔

انبیاء علیہم السلام کو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وحی کے ذریعہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وحی کے ذریعے سے حاصل ہونے والے اس علم کو قرآن کی اصطلاح میں "العلم"

کہا گیا ہے۔" العلم " یعنی علمِ حقیقی، جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے، جو انسان کے لیے حقیقی صلاح وفلاح کی راہ کھولتا ہے، جو اس کے قلب اور اس کی روح کو سچی طمانیت اور سکینت بخشتا ہے، جو اس کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے اور اس کی آخرت کو بھی روشن کرتا ہے، جو ہر قسم کے اختلاط والتباس اور ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے جس میں کسی قسم کے وہم یا وسوسہ کی کسی آمیزش کا اندیشہ نہیں ہے، جو ہر قسم کی شیطانی دخل اندازی سے بالکل محفوظ ہے، جس کو دینے والا خدا ہے جس کو لانے والے جبریل امین ہیں اور جس کو دنیا میں پھیلانے والے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس کو دنیا میں اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی دونوں جگہ اس امر کا اہتمام فرمایا کہ نہ شیاطین الجن[1] اس کے قریب پھٹک سکیں اور نہ شیاطین الانس اس کے اندر کوئی خرابی پیدا کر سکیں[2] جس کی عظمت اور پاکیزگی اور جس کے محافظین وحاملین کے صدق و

---

[1] نزولِ وحی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے وحی کو ہر قسم کی شیطانی دسترس سے محفوظ کر دینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ آسمان کے اندر شیطانوں کی آمد و شد بند کر دی اور اس کو روکنے کے لیے نہایت مضبوط قسم کا پہرہ لگا دیا۔ سورہ جن میں اس کا ذکر خود جنوں کی زبان سے یوں ہوا ہے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۱۰-جن)	اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو ہم نے پایا کہ اس کو سخت قسم کے پہرہ داروں اور شہاب ثاقب سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس میں استراق سمع کے لیے گھات کی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو استراق سمع کے لیے گھات لگائے گا تو وہ ایک شہاب ثاقب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

[2] اسی طرح شیاطین الانس اللہ کے اتارے ہوئے علم اور اس کے دین میں جو گھپلا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کو روکنے کا بھی اس نے انتظام فرمایا۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط وَاللّٰهُ	پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اللہ (باقی بر صفحہ ۷۹)

وفا کی شہادت خود ان کے اتارنے والے نے ان الفاظ میں دی ہے :

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ	گرامی صحیفوں میں بلند اور پاکیزہ ،
مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ	باوقار اور باوفا منشیوں کے
بَرَرَةٍ ۝ (۱۳-۱۶ عبس)	ہاتھوں میں ۔

ان کی معنوی قدر و قیمت کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی :

ان هذا القرآن حبل الله	یہی قرآن اللہ کی رسی ہے، یہی نورِ مبین ہے
وهو النور المبين و الشفاء	اور شفاء نافع ہے، یہی اس کی پناہ ہے
النافع وعصمة من تمسك	جو اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور اس
به و نجاة من تبعه	شخص کے لیے وسیلۂ نجات ہے جو اس
	کی پیروی کرے ۔

جس کے بارہ میں حضرت علیؓ نے جو تمام اربابِ تصوف کے نزدیک سب سے بڑے عارف ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی ہے :

قال اما انی سمعت رسول	فرمایا یاد رکھو میں نے رسول اللہ صلی اللہ
الله صلى الله عليه وسلم	علیہ وسلم سے یہ بات سُنی ہے کہ آپ نے فرمایا
يقول الا انها تكون فتنة	عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا، میں
قلت فما المخرج منها يا	نے عرض کیا، اس سے نجات کیا چیز دلائے
رسول الله، قال كتاب الله	گی؟ یا رسول اللہ! — آپ نے فرمایا، اللہ
فيه نبأ ما قبلكم و خبر	کی کتاب! اس میں تمہارے اگلوں کی سرگزشت
ما بعدكم وحكم ما بينكم	ہے جو کچھ بعد میں آنے والا ہے اس کی خبر

(بقیہ صفحہ ۷۸)

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ	اپنی آیتوں کو مستحکم کرتا ہے اور اللہ علم والا
(۵۲ - حج)	اور حکمت والا ہے ۔

وهو الفصل ليس بالهزل من تركه من جبار قصمه الله ومن ابتغى الهدى في غيره اضله الله وهو حبل الله المتين وهو الذكر الحكيم، وهو الصراط المستقيم، وهو الذى لا تزيغ به الاهواء ولا تلتبس به الالسنة ولا تشبع منه العلماء ولا يخلق على كثرة الرد ولا تنقضى عجائبه وهو الذى لم تنته الجن اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قرانا عجبا يهدى الى الرشد فآمنا به من قال به صدق ومن عمل به اجر ومن حكم به عدل ومن دعا اليه هدى الى صراط مستقيم۔

(ترمذی)

ہے اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا ہوگا، اس کا فیصلہ ہے اور یہ ایک دوٹوک بات ہے، کوئی ہنسی، دل لگی نہیں ہے، جو سرکش اس کو چھوڑ دے گا اللہ اس کی پشت کی ہڈی توڑ دے گا، جو اس کے سوا کوئی اور مرجع ہدایت بنائے گا، اللہ اس کو گمراہ کر دے گا، خدا کی مضبوط رسی یہی ہے، حکمت سے بھری ہوئی کتاب یہی ہے، خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ یہی ہے، اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں نہیں گمراہ کرتیں اور زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں، علماء اس سے کبھی نہیں آسودہ ہوتے، کتنی ہی پڑھو اس سے سیری نہ ہوگی، اس کے عجائب حکمت کبھی ختم نہیں ہوں گے، اس کے سنتے ہی جنات پکار اُٹھے ہم نے عجیب وغریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے، جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا، جس نے اس کی مدد سے فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی دعوت دی۔

یہی علم ہے جس کے بارے میں ہم اوپر انہی حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کر آئے ہیں۔

سئل علیؓ هل خصكم

حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مخصوص
وسلم بشیء دون الناس	علم ایسا بھی سکھایا تھا جو دوسروں کو نہ سکھایا
فقال لا والذی فلق الحبۃ	ہو، آپ نے جواب دیا کہ نہیں اس ذات
وبرأ النسمۃ الا فھما	کی قسم جس نے تخم پھاڑا اور خلق کو پیدا کیا،
یؤتیہ اللہ عبدا فی	مجھے آپ نے اس قسم کا کوئی علم نہیں سکھایا
کتابہ۔	البتہ وہ فہم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کا
	کسی بندے کو عطا فرما دے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علم خاص جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت وحی الٰہی کے فہم ہی کا ثمرہ تھا، اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں تھا۔

وحی الٰہی کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ارباب تصوّف کے علمِ خفی یا علمِ لدنّی کی طرح عقل وفطرت سے بالکل ماوراء شے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے عقل اور فطرت ہی پر ہوتی ہے۔ قرآن کہیں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں جو تم سے کہی جارہی ہیں، ان کا وجود ہی ان کی سند ہے یا یہ خود ہی دلیل اور خود ہی مدلول ہیں بلکہ وہ ہر جگہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل انہی باتوں کا مطالبہ کرتی ہے اور تمہاری فطرت ان کی صحت اور صداقت پر گواہ ہے، وہ ان چیزوں کا باقاعدہ منطقی طریقہ پر ثابت کرنے کے لیے آفاق اور انفس کے اندر سے دلیلیں پیش کرتا ہے اور اس خوبی اور اس وضاحت کے ساتھ ان کو ثابت کرتا ہے کہ کوئی ہٹ دھرم ہی ان کا انکار کرسکتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وحی الٰہی ہماری اپنی ہی فطرت کے مدفون خزانہ کو ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیتی ہے اور ہماری ہی عقل کو ہمارے اوپر گواہ بنا دیتی ہے۔ اگر یہ کام ہم خود کرتے تو اس میں غلطیوں کا امکان تھا اور یہ غلطیاں ہماری دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام وحی کے ذریعہ سے انجام دے دیا جو ہر شک وشبہ سے بالا ہوتے ہیں اہلِ تصوّف کے کشف ومشاہدہ سے کہیں ارفع ہے، اور اگر کوئی شخص اس میں کما حقہٗ فہم وبصیرت حاصل کرلے تو اس کو وہ نورِ یقین اور شرحِ صدر بھی حاصل ہو جائے جو اصل مقصود

ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لیے صوفیہ طرح طرح کی ریاضت کرکے کشف و مشاہدہ کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی حقیقت کی طرف حضرت علیؓ نے اپنے مذکورہ بالا قول میں اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صوفیوں کے علمِ نفی یا علمِ لدنّی کی طرح انبیاء علیہم السلام کا علم، عقل کو مفلوج اور خیرہ نہیں بناتا بلکہ وہ تمام بنیادی معاملات میں رہنمائی کرکے عقل کو صحیح اور قطعی نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور اس طرح وہ اس کی ایسی تربیت کر دیتا ہے کہ بقیہ مسائل میں وہ آپ سے آپ صحیح طرز پر سوچنے لگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار مخاطب کو تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی گئی ہے۔

تعقل کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات، شہوات اور خواہشات کو اپنا راہنما نہ بنا لے اور نہ اوہام و خیالات کے ہاتھ میں اپنی باگ دے بیٹھے بلکہ اس کے اندر خدا نے جو عقل رکھی ہے اس کو رہنما بنائے اور اس کی راہنمائی پر اعتماد کرے۔

تفکر کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ عالم کے قوانین و احکام اور فطرتِ انسانی کے مطالبات اور تقاضوں پر حکیمانہ طور پر غور کیا جائے اور ان سے زندگی کے لیے جو اصول پیدا ہوتے ہیں ان کو پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن بدیہیات پر یقین رکھتا ہے۔ ان بدیہیات کو جذبات و شہوات کی ہلچل کے اندر بھی یاد رکھے اور پھر ان سے بالکل لازمی طور پر جو نتائج نکلتے ہیں ان کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تسلیم کرے۔

الغرض وحیِ الٰہی ہم کو خدا کی معرفت کی منزل تک ہماری عقل پر پٹی باندھ کر نہیں لے جاتی بلکہ وہ ہماری عقل ہی کو آفاق و انفس کے اندر خدا کی صفات اور اس کے سنن و قوانین کا مشاہدہ کراتی ہے۔ پھر ان صفات اور ان سنن و قوانین سے جو اخلاقی اصول پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان سے زندگی کے لیے جو ضابطہ بنتا ہے، ان کو ہمارے سامنے رکھتی ہے اور پھر اس سے جزا و سزا اور آخرت کے لیے جو راہنمائی ملتی ہے اس کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، اس طرح ہماری عقل ایک بالکل مامون ہادی کی راہنمائی میں خدا کی معرفت کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے، جہاں تک اس کے

اندر پہنچنے کی صلاحیت ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن حکیم ہی ہے جو خدا کی معرفت کا اصل ذریعہ ہے اور اسی کے تدبر سے انسان کو تعقل، تفکر اور تذکر کی وہ صحیح تربیت ملتی ہے جس سے انسان خداشناسی اور خدارسی کا اہل بنتا ہے اور اس راہ میں اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔

تدبرِ قرآن اور اُس کے آداب و شرائط

یہ پچھلی فصل میں واضح ہو چکا ہے کہ خدا کی معرفت یا دوسرے الفاظ میں "العلم" کے حاصل ہونے کا اصلی ذریعہ قرآنِ حکیم ہے لیکن اس مقصد کے لیے قرآن کی ہر تلاوت نتیجہ خیز نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ آداب و شرائط ہیں، اگر یہ ملحوظ رکھے جائیں تو قرآن سے مذکورہ مقصد حاصل ہوتا ہے، اگر یہ ملحوظ نہ رکھے جائیں تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کو تزکیہ کا مقصد عزیز ہو، ان کو آداب و شرائط کا پورا پورا اہتمام کرنا چاہیے، ہم اختصار کے ساتھ اس فصل میں یہ شرائط بیان کریں گے۔

نیت کی پاکیزگی

سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف ہدایت و معرفت حاصل کرنے کے لیے پڑھے، کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر نہ پڑھے، اگر طلبِ معرفت و ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہو گی تو نہ صرف یہ کہ وہ قرآن کے فیض سے محروم رہے گا، بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دُور وہ اب تک رہا ہے، اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے گا۔ اگر آدمی قرآن کو اس لیے پڑھے کہ لوگ اسے مفسرِ قرآن سمجھنے لگیں یا اس لیے پڑھے کہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد اس سے شہرت اور نفع دنیاوی حاصل کر سکے، یا اس لیے پڑھے کہ

اس کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ اپنے ان نظریات کو قرآن کے ملمع کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا خواہش مند ہو تو ممکن ہے اس کے یہ ارادے کسی حد تک پورے ہو جائیں لیکن جہاں تک فہم قرآن اور اس سے حصولِ معرفت کا تعلق ہے، اس طرح وہ اس کا دروازہ اپنے اوپر بالکل بند کر لے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و معرفت کا صحیفہ بنا کر اُتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت و معرفت کا داعیہ ودیعت کر دیا ہے اگر اسی داعیہ کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اس سے اپنی کوشش اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کے مطابق فیض پاتا ہے، اور اگر اس داعیہ کے علاوہ کسی اور خواہش کے تحت وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو لکل امرء ما نویٰ کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کا وہ طلب گار ہوتا ہے، قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ "اس کے ذریعے سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے"۔ اور یہ اصول بیان فرمانے کے بعد ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ گمراہ ان لوگوں کو کرتا ہے جو فاسق ہوتے ہیں یعنی جو لوگ اپنی اغراض کے ایسے بندے ہوتے ہیں کہ وہ ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کو یاد کرتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ اس پر توحید کے رموز کھولے جائیں اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنے کا شوق رکھتا ہے تو ہرگز اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ اگر ایک شخص اپنے فسادِ طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری ہی بنا لیتا ہے تو وہ اسی بات کے لائق ہے کہ اس کو شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری میں اضافہ ہو، اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ	یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے
بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ	گمراہی کو پسند کیا تو ان کی یہ تجارت ان
وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝	کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور وہ ہدایت

پانے والے نہ ہوئے۔ (بقرہ : ۱۶)

قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے

دُوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اسی حیثیت سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی پوری عظمت واہمیت نہ ہو تو آدمی اس کو سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف کے دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کرسکتا جو اس کے خزانۂ حکمت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے جاننے سے پہلے ہی حسنِ ظن قائم کرلیا جائے کہ وہ بڑی پُرحکمت اور اعلیٰ کتاب ہے۔ لیکن غور کیجیے تو قرآن مجید کے متعلق اس قسم کا پیشگی حُسنِ ظن ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے، قرآن مجید کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بالکل مجہول ہو۔ وہ اپنے پیچھے ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے، اس کے کارنامے نہایت شاندار ہیں، ذہنوں اور دماغوں کی تبدیلی میں اس کتاب نے جو معجزہ دکھایا ہے، آج تک کسی کتاب نے بھی یہ معجزہ نہیں دکھایا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصہ اس کو نہ صرف ایک کتاب مانتا ہے بلکہ اس کو خدائی اور آسمانی کتاب مانتا ہے، اس کو لوحِ محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے، اس کو ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے جس کی نظیر نہ انسان پیش کرسکتے اور نہ جنات پیش کرسکتے۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی اور جس کے حاضر کے متعلق یہ شہادتیں اور لوگوں کے یہ احساسات موجود ہوں، بہرحال ایک اہمیت رکھنے والا کلام ہے۔ اور آدمی اس کو سمجھنے کا حق اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب اس کی یہ عظمت واہمیت اس کے پیشِ نظر ہو۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق سمجھے جو اہتمام اس کے لیے فی الواقع مطلوب ہے۔ اگر کسی رقبۂ زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا رہا ہے اور کسی زمانے میں وہاں سے کافی سونا برآمد ہوچکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو وہاں سے سونا ہی نکلے گا اور پھر اس کی اسی حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر اس سے فائدہ اُٹھانے کا سروسامان کیا جاتا ہے اور اس پر محنت صرف کی جاتی

ہے۔ لیکن اگر ایک معدن کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ گھُورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت کی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہاں سے کوئلہ یا چونا فراہم ہوگا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنا وقت ہی ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا یا پسند کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس سے اس کو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع ہوگی۔

یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں لوگوں کے اندر موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس توجہ اور اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادہ کے لیے ضروری ہے یہ غلط فہمیاں قرآن مجید کے ماننے والوں اور اس کے منکروں، دونوں کے اندر موجود ہیں۔ جو اس کے منکرین ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں لیکن ان کے خیال میں وہ زمانہ اب گذر چکا ہے۔ عرب کے بدوؤں کے لیے، جن کے مسائل سیدھے سادھے تھے، ان لوگوں کے خیال میں یہ کتاب مفید ہو سکتی تھی اور ان کے لیے بلاشبہ یہ مفید ثابت ہوئی لیکن موجودہ زمانے کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے وہ اس کتاب کو بالکل ناکافی سمجھتے ہیں۔

جو اس کے ماننے والے ہیں ان میں بہت سے لوگ اس کو محض حرام و حلال کے بتلانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں اور فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد، ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو وہ صرف تبرک کے نقطۂ نظر سے باقی رہ گئی ہے۔ ارباب تصوف اس کو محض علم ظاہر کا صحیفہ سمجھتے ہیں۔ علم باطن کے اسرار و حقائق ان کے نزدیک کشف و مشاہدہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو بس اچھی اچھی نصیحتوں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں، وہ اس کے اندر کسی گہری حکمت یا کسی بلند فلسفہ کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ اس کو نزع کی سختیوں کے دور کرنے اور ایصال ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو دفع آفات و بلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں اور جس طرح عیسائی دل کی جانب والے جیب میں انجیل رکھے پھرتے ہیں اسی طرح اس خیال کے مسلمان جب گھر سے نکلتے ہیں تو جیب میں قرآن رکھ کے نکلتے ہیں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان ناممکن ہے کہ قرآنِ حکیم سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جس کے لیے

وہ فی الحقیقت نازل ہوا ہے۔ وہ اس کو انہی حقیر اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں جن اغراض کے لیے ان کے خیال میں یہ اترا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو ایک توپ دی جائے کہ وہ اس کے ذریعہ سے دشمنوں کے قلعہ کو مسمار کر دے لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی ایک مشین سمجھ بیٹھے اور اسی حقیر مقصد کے لیے اس کو استعمال کرنا شروع کر دے۔

قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم

قرآن حکیم سے حقیقی استفادہ کے لیے تیسری ضروری چیز

یہ ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے بالکل ہٹے ہوئے ہیں، وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف محسوس کرتا ہے، اس فرق و اختلاف کو محسوس کر کے ایک صاحب عزم اور ایک حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو قرآن کے تقاضوں کے مطابق بنا کے رہوں گا اور وہ ہر قسم کی قربانیاں کر کے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر قسم کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھال ہی لیتا ہے لیکن جو شخص صاحب عزم نہیں ہوتا یا اس کے اندر حق شناسی اور حق طلبی کا سچا جذبہ نہیں ہوتا وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کر سکتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصوّرات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری حیثیت سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا ماحول میرے لیے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن منافع اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو

الگ رہا عجب نہیں کہ ان کے سبب سے جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائلِ معاش کو قرآن کے ضابطۂ حلال و حرام کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نانِ شبینہ کے لیے بھی فکرمند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل میں ڈٹ جانا اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کمر ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے، صرف مردانِ کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں۔ معمولی ہمت و ارادہ کے لوگ یہیں سے اپنا رُخ بدل دیتے ہیں۔ بعض اس قسم کے لوگ جو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے زیادہ خواہش مند نہیں ہوتے وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنے نفس کی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح لیکن ہمارے لیے اس پر چلنا نہایت مشکل ہے، اس لیے ہم اسی راہ پر چلیں گے جس راہ پر ہم کو ہمارا نفس لے جا رہا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے رُوپ میں پیش کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرتے ہیں۔ بعض اضطرار اور مجبوری کے بہانوں سے اپنے لیے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بناتے ہیں، بعض دُور از کار اور لایعنی تاویلات کے ذریعے سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں، بعض وقت کے تقاضوں اور مصالح کی آڑ تلاش کر کے ان کے پیچھے چھپتے ہیں، بعض قرآن میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفیں یہود نے تورات میں کی تھیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے اپنے لیے ایک الگ راہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی قرآن کے جس حصہ کو وہ اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں اور جس حصہ کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں اور ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھے ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی، کامیابی اور فلاح کا راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی ہمت کر لے اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس ارادہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے سعادت کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا اس

کے لیے دُوسرا دروازہ کھول دیتا ہے، اگر ایک ماحول سے وہ پھینکا جاتا ہے تو دُوسرا ماحول اُس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کے لیے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآنِ حکیم نے اِن الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے :

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ	اور جو ہماری راہ میں جد و جہد کریں گے ہم
سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ	ضرور اُن پر اپنی راہیں کھولیں گے اور
الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (عنکبوت ۶۹)	اللہ تعالیٰ خوبی کے طالبوں کے ساتھ ہے۔

تدبّر قرآن سے استفادہ کے لیے چوتھی شرط تدبّر ہے، اس شرط کا ذکر خود قرآن نے بار بار کیا ہے :

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ	کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے
عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔	دِلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کے مخاطبِ اوّل تھے، وہ قرآن مجید کو برابر تدبّر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبّر کرتے تھے وہ اتنا ہی قرآنِ مجید کے فہم میں ممتاز تھے۔ صحابہؓ نے قرآن مجید کے مطالعہ کے لیے اپنے حلقے بھی قائم کیے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہو کر قرآن کا اجتماعی مطالعہ کرتے تھے، اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص دلچسپی تھی اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں خلفائے راشدین بالخصوص حضرت عمرؓ اس قسم کے حلقوں سے قرآن کے ماہرین سے برابر نہایت گہری دلچسپی لیتے رہے۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور قرآن کے معانی کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت و معرفت اور ایک خزانۂ علم و حکمت سمجھنے کے بجائے محض حصولِ برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دمِ نزع اس کے ذریعے سے جانکنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے میت کو ایصالِ ثواب کیا جائے۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں راہنما ہونے کے بجائے

اس کا مصرف صرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں، اس کے ذریعے سے اس کا افتتاح کریں تاکہ یہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو تعویز کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تاکہ جب وہ اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلیں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ سے کہیں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اس شکل میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں یہی کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز بھی آدمی پڑھتا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے وہ اپنے دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اس کو سمجھ سکے، لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں کہ مبادا کہیں اس کے کسی لفظ کا مفہوم دماغ کو چھو جائے۔

تفویض الی اللہ

قرآن مجید سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس میں جو مشکلات پیش آئیں آدمی ان سے بددل اور مایوس ہونے یا ان کے سبب سے قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے اپنی الجھن کو خدا کے سامنے پیش کرے اور اس سے مدد اور راہنمائی طلب کرے۔ قرآن میں آدمی کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "قولِ ثقیل" کے نیچے دب گیا ہے جس کے بارِ گراں کو اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی علمی مشکل آ گئی ہے جس کا حل ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس طرح کی علمی اور عملی مشکلوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے برابر دعا اور قرآن مجید پر برابر غور کرتا رہے اگر قرآن مجید یاد ہو تو شب کی نمازوں میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھے، ان شاء اللہ اس کی ساری الجھنیں دور اور ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی اور ان مشکلوں کے حل ہونے سے اس پر علم و حکمت کے جو دروازے کھلیں گے وہ دروازے کسی اور طرح اس پر ہرگز نہ کھلتے۔ مندرجہ ذیل دعا بھی اس طرح کے حالات میں پڑھتے رہنا نہایت نافع ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ اِبْنُ عَبْدِكَ
اِبْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ
مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ
قَضَاءُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ
هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ
اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ
اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ
الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ
صَدْرِيْ وَجَلَاءَ حُزْنِيْ
وَذَهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ۔

اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا،
اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیری
مٹھی میں ہے، مجھ پہ تیرا حکم جاری ہے، میرے
بارہ میں تیرا فیصلہ حق ہے، میں تجھ سے تیرے
ہر اس نام کے واسطہ جو تیرا ہے، جس سے تُو نے
اپنے آپ کو پکارا ہے یا جس کو تُو نے اپنی کتاب
میں اُتارا ہے، یا جس کو تُو نے اپنی مخلوق میں سے
کسی کو سکھایا ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تُو
قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نُور،
میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج
بنا دے۔

اُسوۂ حسنہ

معرفتِ الٰہی اور حصولِ تزکیہ کا دوسرا قابلِ اعتماد ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے لیکن آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے صحیح فیض ایک طالبِ تزکیہ صرف اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کو صحیح قسم کی نسبت حاصل ہو، اس نسبت کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آپؐ کے منصبِ رسالت کی حیثیت اور آپؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ خاص طور پر یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہدِ صحابہ و تابعین کے گذرنے کے بعد سے اس چیز کے بارہ میں ہمارے درمیان بہت کچھ اختلافات پیدا ہو گیا ہے اور اس اختلاف کا اثر حصولِ معرفت و تزکیہ کے اس مقصد پر بھی لازماً پڑتا ہے جو آپؐ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے۔ اس وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے اختصار کے ساتھ نقطۂ ہائے نظر کا یہ اختلاف واضح کر دیں۔ اس کے بعد تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کریں گے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری کس نوعیت کی وابستگی معرفتِ الٰہی کے مقصد کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی پیدا کرنے کے لیے ہمیں کن باتوں کا اہتمام کرنا ہے کس قسم کی جدوجہد عمل میں لانی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت

منصبِ رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں

کی حیثیت اور آپؐ کے ساتھ ہمارے تعلّق کی نوعیت کے بارہ میں ہمارے اندر جو غلط تصورات پیدا ہو چکے ہیں، وہ ہیں تو بہت سے لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ہم صرف چار بنیادی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کریں گے جو ہمارے چار بڑے گروہوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی حیثیت سمجھتا ہے جو ایک کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان کسی معتمد ہرکارہ اور ایک دیانت دار چٹھی رساں کی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بس یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اپنے بندوں پر نازل فرمانی چاہی وہ آپؐ نے ان کو پہنچا دی۔ اس کے بعد آپؐ کا کام ختم ہو گیا۔ وہ اپنے اسی تصوّر کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت متعیّن کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ منصبِ رسالت کا اس قدر حقیر تصوّر رکھتے ہیں، ان کے لیے معرفتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی اور جب آپؐ کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی تو آپؐ کی ذات کے ساتھ کسی غیر معمولی وابستگی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی جب اصلی کام آپؐ کا صرف خط کا پہنچا دینا تھا اور آپؐ خط پہنچا چکے تو اس کے بعد اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ اصل خط کی ہے یا زیادہ سے زیادہ کاتب کی۔ نہ کہ خط کے لانے والے قاصد کی۔ اس کے بعد تو اگر قاصد سرے سے درمیان سے غائب بھی ہو جائے، جب بھی ان حضرات کے نقطۂ نظر سے کوئی خلا نہیں واقع ہونا چاہیے۔

رسالت کا یہ تصوّر بنیادی طور پر غلط ہے۔ نبیؐ، خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان صرف ایک قاصد اور نامہ بر ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک معلم بھی ہوتا ہے، ایک مزکّی بھی ہوتا ہے، ایک مرشد بھی ہوتا ہے، ایک مبیّن بھی ہوتا ہے اور ایک بشیر بھی ہوتا ہے ایک مُنذر بھی ہوتا ہے، ایک سراج منیر بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک واجب الاطاعت

ہادی بھی ہوتا ہے اور پھر اپنی ان تمام خصوصیتوں کے ساتھ وہ اپنے ارشاد و ہدایت کے فرائض کے سلسلہ میں براہِ راست خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ غلطی اور گمراہی کے تمام خطروں سے بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے اس کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خدا کی کتاب بندوں کو پہنچا دے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اس کتاب کے تمام اسرار و رموز لوگوں کو سمجھا دے، اس کتاب پر عمل کر کے دکھا دے، اس کتاب پر عمل کرنے والوں کا ایک گروہ اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کرے اور اس کتاب کے مضمرات، ان کی انفرادی اجتماعی زندگیوں میں نمایاں کر دے۔ ان سارے کاموں میں اس کی اپنی ذات ایک عامل کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور ایک راہنما کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور اپنی اس دُوسری حیثیت میں جو کچھ وہ کہتا ہے یا کرتا ہے یا جس چیز کو وہ منظور کر لیتا ہے، اس کو اس کتاب کے اور اس کے منصبِ رسالت کے تحت ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

رسالت کے اس تصور کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم جتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات رکھتے ہیں اتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات نہ دنیا میں ہمارے کسی کے ساتھ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ سے آپ یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان گوناگوں تعلقات کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہ ہو یا ان میں سے بعض کا یا کُل کا منکر ہو، تو وہ ہرگز آپ کی ذات بابرکات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ جو منصبِ رسالت کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہے وہ ہمارے اربابِ تصوّف کا ہے، یہ لوگ اوّل تو شریعت اور طریقت اور علمِ ظاہر اور علمِ باطن کی الگ الگ حدبندیاں قائم کیے ہوئے ہیں۔ پھر مزید ستم یہ کرتے ہیں کہ ان دونوں علموں کو ایک دُوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاں تک علمِ ظاہر یا علمِ شریعت کا تعلق ہے اس کی تعلیم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو دی، لیکن علمِ باطن یا علمِ طریقت کی تعلیم آپؐ نے بطور ایک راز کے صرف چند مخصوص لوگوں ہی کو بتائی اور پھر انھی لوگوں کے واسطہ سے

یہ علم سینہ بہ سینہ تصوّف کے مختلف سلسلوں تک منتقل ہوا ہے اور وہی اس راز کے امین بنے۔

اس خیال کے اندر جو خرابیاں ہیں اور اس سے منصب نبوّت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس سے معرفتِ الٰہی کے نصب العین کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی طرف ہم اس کتاب کی پہلی فصل میں بعض اشارات کر چکے ہیں۔ یہ خیال اگرچہ غلط ہے، لیکن غلط ہونے کے باوجود ہمارے نزدیک کم از کم اس پہلو سے غنیمت ہے کہ اس میں علمِ ظاہر اور علمِ باطن دونوں کا سرچشمہ نبیؐ ہی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ علمِ شریعت کا سرچشمہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کیا گیا ہو لیکن علمِ طریقت کا سرچشمہ کسی اور کو قرار دے دیا گیا ہو۔ ورنہ اہلِ تصوف میں تو ایک ایسا گروہ بھی ہے جو نبوت اور ولایت کے دو الگ الگ بالکل متوازی منصب تسلیم کرتا ہے پھر ان میں سے ایک کو وہ علم ظاہر (یعنی علمِ شریعت) کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور دوسرے کو علمِ باطن کا۔ اس گروہ کے نزدیک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس طرح خاتم الانبیاء کا منصب مخصوص ہے، اسی طرح بعض اشخاص کے لیے ان کے نزدیک خاتم الاولیائ کا منصب مخصوص ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں منصب بالکل دو متوازی نظاموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو مستقل متوازی نظاموں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ ان کے درمیان رقابت اور کشمکش کی حالت رہے۔ چنانچہ ان کے درمیان بھی برابر رقیبانہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔ طریقت کے علمبردار شریعت کے حامیوں کو ظاہر پرست اور بے مغز قرار دیتے ہیں اور شریعت کے حامی، طریقت کے حامیوں کو مبتدع اور گمراہ ٹھہراتے ہیں اور اس تعصب اور غلو نے بڑھتے بڑھتے یہ شکل اختیار کر لی ہے کہ بہت سے صوفی حضرات شریعت کو اپنی طریقت کے مقابلے میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے اور معرفتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے ان کی نگاہوں میں جو مرتبہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے وہ العیاذ باللہ کسی نبی کا بھی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص منصب رسالتؐ کے متعلق اس سوءِ ظن میں مبتلا ہو جائے تو اس کو معرفتِ الٰہی کا ایک ذرہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا، اگرچہ وہ بزعمِ خویش باطن میں اتنا کمال حاصل کر لے کہ ہوا میں اڑنے اور پانی پہ دوڑنے لگ جائے۔ معرفتِ الٰہی کا اصلی ذریعہ صرف انبیائ

علیہم السلام ہی ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیینؐ ہیں اور آپؐ کی شریعت آخری اور کامل شریعت ہے اس وجہ سے لازماً آپؐ خاتم الاولیاء اور خاتم العارفین بھی ہیں۔ معرفت کا جو مقام آپؐ کو حاصل ہوا، وہ نہ کسی اور کو حاصل ہوا اور نہ ہوگا اور علم کا جو خزانہ آپؐ کی شریعت کے اندر پوشیدہ ہے وہ خزانہ نہ کسی اور چیز کے اندر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۳۔ ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ماضی کی ایک قابلِ احترام شخصیت سے زیادہ اہمیّت نہیں دیتے۔ ساری قوم چوں کہ آپؐ کو رسول کہتی ہے اس وجہ سے یہ لوگ بھی آپؐ کو رسولؐ ہی کہتے ہیں اور قومی روایات کے زیرِ اثر آپؐ کے لیے محبّت اور عصبیّت کا جذبہ بھی ایک حد تک رکھتے ہیں، لیکن یہ بات ان لوگوں کے دل میں کسی طرح بھی نہیں دھنستی کہ آپؐ جس معاملہ میں جو کچھ فرما گئے ہیں وہی حرفِ آخر ہے اور انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا انحصار بس اس کو بے چون وچرا مان لینے ہی پر ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک آپؐ نے جو کچھ بتایا اور سکھایا وہ ایک مخصوص زمانہ اور ایک مخصوص ماحول کے لیے تو بے شک ٹھیک تھا لیکن علم و روشنی کے اس زمانہ میں بھی انہی چیزوں پر اصرار کیے چلے جانا، ان کے خیال میں جہالت اور حماقت ہے، اب آپؐ کی بتائی ہوئی باتوں میں سے اگر کچھ چیزیں مانے جانے کے قابل ہیں

—— تو یا تو وہ ہیں جو خود ان کی اپنی خواہشات کے مطابق ہیں یا وہ ہیں جن کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانے میں بھی قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو یہ لوگ دل سے گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں اگرچہ اپنی کمزوری اور بزدلی کے سبب سے اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ رکھتے ہوں۔

۴۔ ہمارے عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہے، جن کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے، وہ مختلف اوقات میں اپنی اس عقیدت کا اظہار کر کے اپنے خیال میں آپؐ کو نبوّت و رسالت کے تمام حقوق و واجبات سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں، انہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس مقصد کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، آپؐ نے دنیا کو کیا تعلیم دی، اپنے بعد

اُمت پر کیا ذمہ داریاں چھوڑ گئے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا ہے، ان سوالوں پر غور کرنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے وہ اپنے تصورات کے مطابق آپؐ کی ذات کے ساتھ اظہارِ عقیدت کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں، اگرچہ اس اظہارِ عقیدت کا طریقہ صریحاً آپؐ کی تعلیمات اور ہدایات کے خلاف ہی ہو۔ جاہل پیروں اور مولویوں کی ایک جماعت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عوام کے اس جذبۂ عقیدت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتے ہوئے عوام میں مقبول بننے کا یہ راستہ بہت سہل ہے کہ عوام کی اس جاہلانہ عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منصبِ رسالت سے اٹھا کر خدائی کے منصب پر متمکن کرنے کی کوشش کی، اور اپنے زعم کے مطابق اس کے دلائل فراہم کیے۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اظہارِ عقیدت ومحبت کے ایسے طریقے ایجاد کیے جن سے ان کو اپنی خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لیے شریعت کی تمام پابندیوں سے پوری آزادی مل جائے، اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپؐ کی محبت و عقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے ان تمام عقائد کی بنیادیں بھی ڈھا دی گئی ہیں جن سے معرفتِ الٰہی کی راہیں کھلتی تھیں اور وہ تمام اعمال و اخلاق بھی برباد کر دیے گئے جو اس معرفت کو جلا دینے والے تھے۔ جس ذات کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے راہنما بنے اور ان کو خدا کا راستہ دکھائے، اسی کے نام کو ان ظالموں نے اس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے ہٹا کر ان کو گمراہی کے راستوں پر ڈال دیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت

اور آپؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت سے متعلق ہمارے اندر جو گمراہیاں آج پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے یہ چند بڑی بڑی گمراہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر معرفتِ الٰہی کے حصول کا واحد راستہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی ہے تو ان گمراہیوں کی موجودگی میں آپؐ کے ساتھ نہ تو ہمارا صحیح ربط ہی قائم ہو سکتا ہے اور نہ وہ چیز ہی ہم آپؐ سے حاصل کر سکتے ہیں

جس کے حاصل ہونے کا آپ واحد ذریعہ ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی ہدایت کی ہے ہم وہ بنیادیں واضح کر دیں تاکہ جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے وہ خدا تک پہنچنے کے واحد ذریعہ کے ساتھ اپنی ٹھیک ٹھیک وابستگی قائم کر سکے۔

ہمارے نزدیک قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر قائم کیا ہے:۔

ایمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی پہلی بنیاد ایمان ہے، ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپؐ اللہ کے آخری رسولؐ ہیں بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپؐ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے — اس بات پر اعتماد کہ آپؐ صادق اور امین ہیں۔ اس بات پر اعتماد کہ آپؐ کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت ہے اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو — اس بات پر اعتماد کہ آپؐ نے جو راہ دکھائی ہے اگرچہ بظاہر اس میں کتنے ہی خطرات نظر آرہے ہوں لیکن نجات اور فلاح کی حقیقی راہ وہی ہے — اس بات پر اعتماد کہ آپؐ نے زندگی کے جو اصول سکھائے ہیں وہ وقتی اور عارضی نہیں ہیں بلکہ وہ دائمی اور ابدی ہیں۔ اور انسان ان سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکے گا اور سب سے بڑھ کر اس بات پر اعتماد کہ خدا کی معرفت کا جو طریقہ آپؐ نے بتایا اور سکھایا ہے، اس سے بڑھ کر نہ کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

جب تک آدمی کے اندر یہ اعتماد نہ پیدا ہو، مجرد اس تصدیق سے کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں، آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا، اور نہ یہ ایمان اس معرفت کے نقطۂ نظر سے کچھ کارآمد ہوتا ہے جو اس ایمان کی حقیقی غایت ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

ذاق طعم الایمان من رضی	ایمان کا مزہ اس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب
باللہ ربا و بالاسلام دینا	ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور
و بمحمد رسولا۔	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنا رسول ہونے
(مسلم)	پر مطمئن ہو گیا۔

یہی اعتقاد ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرت عمرؓ کو دی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! ہم کبھی کبھی یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپؐ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض باتیں نوٹ کر لیا کریں۔؟

آپؐ نے فرمایا کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنے دین کے بارہ میں حیرانیوں میں پڑ گئے اسی طرح تم بھی حیرانیوں میں پڑنا چاہتے ہو، میں نے تمہارے سامنے اللہ کے دین کو بالکل روشن اور شفاف صورت میں رکھا ہے۔ اگر آج موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔[1]

یہی بات ایک دوسری روایت میں کچھ مختلف طریقہ پر وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا سوال پر کچھ خفگی کا بھی اظہار فرمایا۔ حضرت عمرؓ کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کا احساس ہوا تو وہ فوراً پکار اٹھے۔

رضیت باللہ ربّاً وبالاسلام دیناً وبمحمدٍ نبیاً۔[2] "میں اللہ کے اپنا رب ہونے پر اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنا نبی ہونے پر پوری طرح مطمئن ہوں۔"

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جہاں تک اللہ کی معرفت کا راستہ دکھانے اور خدا کی صراطِ مستقیم کو واضح کرنے کا تعلق ہے، یہ کام بہتر سے بہتر طریق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اگر آپؐ کے بعد ہوتے تو اسی طریقہ کی پیروی کرتے۔ ظاہر ہے کہ حق کی راہنمائی کے نقطۂ نظر سے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کے بعد حضرت موسیٰؑ اور ان کی شریعت کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تو دوسرے اشخاص اور ان کے علوم و افکار اور نظریات و تجربات کی کیا وقعت باقی رہتی ہے۔؟ دوسرے علوم و افکار اگر کچھ قابلِ لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جہاں تک وہ کتاب و سنّت کے موافق و مؤید ہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی فکر و فلسفہ کو

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ [2] مشکوٰۃ باب مذکور

یا کسی وجدان و کشف کو یا کسی طریقہ اور تجربہ کو نبی کے علم و عمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھیرائے یا اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا بھی دعویٰ کرے تو اس کا دعویٰ ایمان محض ایک فریب نفس ہے کیوں کہ اس کا ایمان اس اعتماد سے بالکل خالی ہے جو اس ایمان کی اصل رُوح ہے۔

اطاعت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری شرط آپؐ کی کامل اطاعت ہے۔ دنیا کا کوئی نبی اور رسول بھی اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت بھی کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایات وہ دے اس کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ — ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

(النساء - ۶۴)

دُوسری جگہ ہے کہ آدمی کے نیک اعمال کی قبولیّت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو اس کے تمام اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (محمد - ۳۳) — اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو رائیگاں نہ کرو۔

رسولؐ کی اطاعت کے مطالبہ کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت جو اصل مقصود ہے اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہِ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطہ سے کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے

ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کی یہ اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔	جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

رسول کا ہاتھ لوگوں کے لیے اللہ کے ہاتھ کا قائم مقام ہوتا ہے، جو لوگ رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ گویا بالواسطہ اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (الفتح - ۱۰)	جو لوگ تم سے بیعت کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں اللہ ہی کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

خود احادیث میں بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا راستہ یہی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی جائے، مثلاً:

من اطاع محمدًا فقد اطاع اللہ ومن عصیٰ محمدًا فقد عصی اللہ ومحمدٌ فرق بین الناس۔ (بخاری)	جس نے محمدؐ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمدؐ ہی نشانِ امتیاز ہیں۔

قرآن مجید میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ یہ اطاعت محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے طور پر اپنے آپ کو خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کے تابع کر دے، آپس میں جتنے قضیے اور مسئلے بھی پیدا ہوں، ان سب کے طے کرنے کے لیے کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیا جائے، اور پھر کتاب و سنت کے فیصلوں کو دل کے پورے اطمینان اور طبیعت کی پوری رضامندی کے ساتھ قبول کیا جائے، ان کے خلاف دل کے اندر کسی قسم کی بدگمانی یا شکایت نہ رہے، فرمایا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ	پس نہیں تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہیں جب کہ ان تمام معاملات میں جو ان کے درمیان

بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي	پیدا ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے
أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ	فیصلہ سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی
وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ہ	محسوس نہ کریں اور وہ پورے طور پر اپنے آپ
(نساء)	کو تمہارے تابع نہ بنائیں۔

ان آیات واحادیث کے ظاہری الفاظ سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کا تعلق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی سے تھا، جب آپ کی ذاتِ خاص ہمارے درمیان موجود نہیں رہی تو اس اطاعت کا سوال بھی باقی نہیں رہا۔ آپ کی وفات کے بعد اللہ کی کتاب اور آپ کی سنت امت کے اندر آپ کے قائم مقام ہے اس وجہ سے اب انہی دو چیزوں کی اطاعت آپ کی اطاعت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے خود اس کی وصیت بھی فرمادی تھی :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
وسلم ترکت فیکم امرین	ہے کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں
لن تضلوا ما تمسکتم بھما	جب تک تم ان دونوں پر مضبوطی سے قائم
کتاب اللہ و سنۃ رسولہ[1]	رہو گے، اس وقت تک تم گمراہ نہ ہو گے۔

علاوہ ازیں ایک اسلامی حکومت کے وہ امراء اور حکام بھی اسی حکم میں داخل ہیں جو زمین میں خدا کی کتاب اور آپ کی سنت کے نافذ کرنے والے ہوں۔ اس کی تصریح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی ہے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے
وسلم من اطاعنی فقد اطاع	میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت
اللہ ومن اطاع الامام فقد	کی اور جس نے امام کی اطاعت کی تو اس نے
اطاعنی ومن عصانی فقد	میری اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی
عصی اللہ ومن عصی الامام	اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی
فقد عصانی۔[2]	نافرمانی کی تو اس نے میری نافرمانی کی۔

[1] بخاری، کتاب الاحکام [2] مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب وسنّت کی پیروی کریں جن کے ذریعے سے آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اگر محض زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جاتا رہے، اور اطاعت اپنی ہوائے نفس کی یا رسولؐ کی ہدایات کے خلاف دوسروں کی کی جاتی رہے تو اس طرح رسولؐ کو رسولؐ ماننا وہ ماننا نہیں ہے جس سے معرفتِ الٰہی کے دروازے کھلیں بلکہ اس طرح کا ماننا اُلٹا آدمی کے خسران اور اس کی بدبختی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

اِتّباع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اتّباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کے دائرہ میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر ونواہی کی ہو، لیکن اتباع کے دائرہ میں مستحبات ونوافل بھی آجاتے ہیں پھر اطاعت بعض حالات میں محض ظاہری اور رسمی بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی ایک شخص کی اطاعت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت میں اخلاص اور محبّت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا، لیکن اتباع میں متبوع کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جانا بھی شرط ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آپؐ کی اتّباع بھی کرتے تھے، وہ صرف یہی نہیں کرتے تھے کہ آپؐ کسی بات کا حکم دیں تو اس کی تعمیل کر دیں یا کسی بات سے روکیں تو اس سے رُک جائیں بلکہ وہ آپؐ کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نگاہوں میں رکھتے اور پھر اس کی تقلید کرتے تھے۔ آپؐ کس طرح اُٹھتے ہیں، کس طرح بیٹھتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، کس طرح جاگتے ہیں، کس طرح چلتے ہیں، کس طرح گفتگو کرتے ہیں، کس طرح کھانا کھاتے ہیں، کس طرح ہاتھ دھوتے ہیں، کس طرح وضو کرتے ہیں، کس طرح نماز پڑھتے ہیں؛ غرض وہ آپؐ کی تمام حرکات وسکنات پوری طرح نظر میں رکھتے اور پھر ان میں سے ہر شخص کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالے اور یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محبت و عقیدت

کے جذبہ سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباعِ رسول میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعتِ رسولؐ سے نہیں بلکہ درحقیقت اتباعِ رسولؐ سے حاصل ہوتا ہے۔ رسولؐ، خدا کی معرفت کا مظہرِ کامل ہوتا ہے، اس کی ایک ایک ادا معرفتِ الٰہی کا نشان ہوتی ہے، اس وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں وہ رسولؐ کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں، وہ رسولؐ کے اندر وہ علم دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عمل دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، وہ عادات دیکھتے ہیں جو خدا کو پسند ہیں، وہ صفات دیکھتے ہیں جو خدا کو محبوب ہیں وہ جمالِ خدا دیکھتے ہیں جس پر جمالِ خداوندی کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رسولؐ کے ایک ایک نقش کو تلاش کر کر کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کی محبت میں کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا صلہ یہ پاتے ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ - (آل عمران)

کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کریگا۔

درحقیقت رسولؐ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہی یہی ہے کہ معرفتِ الٰہی کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے اس کو رسول کی روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرا دیا جائے۔ اگر باطن میں معرفت کا نور جلوہ گر ہو تو ظاہر کی ایک ایک چیز میں جو نورانیت ہونی چاہیے، پیغمبر کی زندگی اس کا کامل نمونہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس کی زندگی کی ایک ایک ادا کو پیروی کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، اور جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی میں جتنا ہی ترقی کرتا ہے، وہ خدا کی محبت اور اس کی محبوبیت میں اتنی ہی ترقی کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ -

تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

محبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی شرط آپؐ کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا وہ اطاعت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد

محبت پر نہ ہو۔ ایسی اطاعت جس کی تہہ میں محبت کا جذبہ کارفرما نہ ہو بعض حالات میں محض نفاق ہوتی ہے۔ پھر محبت بھی محض رسمی اور ظاہری قسم کی مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے جس کے مقابل میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جائے، جس کے لیے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے لیکن خود اس کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑا جا سکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ	تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے
عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا	خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا	جس کے گر جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور مکانات
وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ	جو تمہیں پسند ہیں، اگر یہ ساری چیزیں تم کو اللہ
اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ	اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد
جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا	سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک
حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ (توبہ ۲۴)	کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کردے۔

اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص کا ایمان بالرسول متحقق نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام عزیزوں اور قرابت داروں سے عزیز نہ رکھے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں
وسلم لا یؤمن احدکم	سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک
حتی اکون احب الیہ من	میں اس کے نزدیک اس کے باپ اس
والدہ و ولدہ و الناس	کے نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے
اجمعین۔[1]	اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب
(متفق علیہ)	نہ ہو جاؤں۔

[1] مشکوٰۃ، باب الایمان۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی محبت کے بعد ہی کوئی شخص ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا ہو سکتا ہے۔

ثلث من کن فیه وجد	تین چیزیں جس شخص میں ہوں گی، وہ ان کے
بهن حلاوة الایمان من	سبب سے ایمان کا مزا چکھے گا۔ ایک وہ
کان الله ورسوله احب الیه	شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول
مما سواء	دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب
(متفق علیه)	ہوں۔

لیکن یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس محبت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود محض وہ جذباتی محبت نہیں ہے جو آدمی کو فطری طور پر اپنے بیوی بچوں یا اپنے دوسرے عزیزوں کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس سے مقصود وہ عقلی اور اصولی محبت بھی ہے جو ایک شخص کو کسی اصول اور مسلک کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ اسی اصول اور اسی مسلک کو مقدم رکھتا ہے، اس اصول اور مسلک کے اوپر وہ ہر چیز اور ہر اصول، ہر مسلک اور ہر خواہش اور ہر حکم کو قربان کر دیتا ہے لیکن خود اس کو دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہیں کرتا۔ اس اصول اور مسلک کی برتری کے لیے وہ ساری چیزوں کو پست کر دیتا ہے لیکن اس اصول اور مسلک کو کسی حالت میں بھی پست دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس سے خود اس کا اپنا نفس اس مسلک کی مخالفت میں مزاحم ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی لڑتا ہے، اگر دوسرے اس سے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے بیوی بچوں اور اعزا و اقارب کے مطالبات بھی اگر اس کے اس مسلک کے مطالبات سے کسی مرحلہ پر ٹکراتے ہیں تو وہ اپنے اس اصول اور مسلک کا ساتھ دیتا ہے اور بے تکلف اپنے بیوی بچوں کی خواہشوں اور اپنے خاندان اور قوم کے مطالبہ کو ٹھکرا دیتا ہے۔

اس محبت کا اصولی اور عقلی ہونا خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

من احب سنتی فقد احبنی	جس نے میری سنت سے محبت کی اس

ومن احبنی کان معی فی الجنۃ (ترمذی)

نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

اطاعت بلا محبت اور محبت بلا اتباع

اس تفصیل سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا ایمانی تعلق اس وقت تک استوار نہیں ہوسکتا جب تک اس ایمان کی بنیاد، اطاعت، اتباع اور محبت پر نہ ہو۔ وہیں مختلف اشارات سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اطاعت بلا محبت کے نفاق، اور محبت بلا اطاعت و اتباع کے بدعت ہے۔

یہ بات کہ محبت بلا اطاعت کے نفاق ہے، خود قرآن مجید سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے، حوالی مدینہ کے بہت سے اعراب، اسلام کی سیاسی طاقت بڑھ جانے کے بعد اسلامی احکام و قوانین کی ظاہری اطاعت کرنے لگے تھے لیکن یہ اطاعت محض سیاسی مصالح کے تحت مجبورانہ تھی، اللہ اور رسولؐ کی محبت اور اس ایمان کا نتیجہ نہیں تھی جس کی اصلی روح اخلاص و اعتماد ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے جب بعض مواقع پہ اپنے ایمان کا دعویٰ اس طرح کیا جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انھوں نے ایمان لا کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اسلام پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے تو قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی کہ ان مدعیانِ ایمان سے کہہ دو کہ محض اسلامی احکام و قوانین کی ظاہری اطاعت سے آدمی مومن نہیں ہوجایا کرتا بلکہ ایمان کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اخلاص و محبت بھی شرط ہے اور یہ چیز تمہارے اندر مفقود ہے اس وجہ سے ابھی تمہارا دعوائے ایمان بھی غلط ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات ۱۴)

اور یہ اعرابی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو۔ البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کرلی، ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر نہیں داخل ہوا ہے۔

رہی دوسری بات یعنی محبّت بلا اطاعت و اتباع کا بدعت ہونا تو یہ اوپر کی آیات و احادیث سے واضح طور پر نکلتی ہے۔

جس طرح قرآن مجید نے اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ والی آیت میں اللہ کی محبت کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ نبیؐ کی اتباع کی جائے اور بغیر اتباع نبیؐ کے اللہ کی محبت کے جتنے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں ان سب کو بدعت و ضلالت قرار دیا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے من احبّ سنّتی فقد احبنی والی حدیث میں یہ واضح فرما دیا کہ آپؐ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپؐ کی سنّت کے ساتھ محبت کی جائے اور بعض دوسری حدیثوں میں آپؐ نے اپنی محبت میں اس قسم کے غلو کی ممانعت فرمائی ہے جس قسم کا غلو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہدایت اور یہ ممانعت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن آپؐ کی سنّت کی پیروی نہیں کرتے اوّل تو ان کا دعویٰ ہی بے حقیقت ہے اور اگر اس کے اندر سچائی کی رمق ہے بھی تو ان کی یہ محبت بالکل بے معنی محبّت ہے اور اگر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے کے کچھ ایسے طریقے بھی ایجاد کر لیے ہیں جو صریحاً آپؐ کی سنّت کے خلاف ہیں تو یہ اسی طرح کی بدعت ہے جس طرح کی بدعت نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کی محبت میں کی ہے کہ ان کو پیغمبر کی بجائے خدا بنا کے بٹھا دیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبّت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض عقلی و اصولی ہی نہیں تھی بلکہ جذباتی بھی تھی لیکن یہ جذبات کبھی حدود کتاب و سنّت سے متجاوز نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف یہ حال تھا کہ صحابہ اپنے اوپر بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا لیتے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلوؤں میں ایک کانٹے کا چبھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں ان کے اپنے جسم تیروں سے چھلنی ہو جاتے تھے لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے جیتے جی آپؐ کا بال بھی بیکا ہو۔ مرد تو مرد عورتوں تک کے جذبات کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے بیٹے اور شوہر اور باپ اور بھائی سب کو قربان کر کے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی

کی آرزو میں رکھتی تھیں، دوسری طرف اتباعِ سنّت کا یہ اہتمام تھا کہ اس محبّت سے مغلوب ہو کر بھی کبھی کوئی ایسی بات ان سے صادر نہیں ہوتی تھی جو آپؐ کی صریح ہدایات تو در کنار، آپؐ کی پسند ہی کے خلاف ہو، حضرت انسؓ کا بیان ملاحظہ ہو:

عن انس قال لم یکن	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ
شخص احب الیہم من	کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کوئی شخص بھی محبوب نہ تھا، لیکن جب
وسلم وکانوا اذا راوہ	وہ آپؐ کو دیکھتے تو آپؐ کی تعظیم کے لیے
لم یقوموا لما یعلمون من	کھڑے نہ ہوتے کیوں کہ ان کو معلوم
کراھیتہ لذالک۔	تھا کہ آپؐ اس بات کو ناپسند
(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)	کرتے ہیں۔

لیکن آج اگر ہم مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان کے اندر عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نکلے گی جو یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس ایمان کے ساتھ اطاعت موجود نہیں ہے، یا محبّت کا دم بھرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اتباعِ سنّت نہیں ہے۔ اطاعت اور اتباع دونوں کی جگہ انہوں نے اپنے جی سے چند چیزیں ایجاد کر لی ہیں —— کچھ میلاد کی مجلسیں منعقد کر دیتے ہیں، کچھ دیگیں پکوا کے تقسیم کر دیتے ہیں، ایک آدھ جلوس نکلوا دیتے ہیں، کچھ نعرے لگوا دیتے ہیں —— بس اس طرح کی کچھ باتیں ہیں جن سے ان کا ایمان اور ان کی محبّتِ رسولؐ عبارت ہے، آپ کو کتنے ایسے اشخاص مل جائیں گے جنہوں نے نماز مدت العمر نہیں پڑھی لیکن مہینہ میں میلاد کی مجلسیں اور قوالی کی محفلیں کئی بار منعقد کرتے ہیں۔ مال رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنے کی ان کو کبھی توفیق نہیں ہوئی لیکن اپنی ان بدعات پر جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پہ کرتے ہیں ہر سال ہزار ہا روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کی کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مطالبہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنی زندگیوں کا جائزہ لے کر ان کو درست کرنے کی کوشش کریں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں اپنے آپ کو ہر وقت سرشار ظاہر کرتے ہیں اور نعتیہ اشعار پڑھ کر

یا اُن کر اان پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ حالت ہمارے کسی ایک ہی طبقہ کی نہیں ہے بلکہ ہمارے اکثر طبقے اسی قسم کی محبتِ رسولؐ کے دعویدار ہیں اور اگر کچھ لوگ اتباعِ سنت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں تو ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے نزدیک تمام سنّت جن چند اختلافی مسائل کے اندر سمٹ آئی ہے بس انہی چند چیزوں پر ان کا سارا زور صرف ہوتا ہے گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف انہی چند مسائل کی تعلیم کے لیے ہوئی تھی۔

حجاباتِ علم

پچھلے مباحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ علمِ حقیقی دراصل ہے کیا اور اس کے حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع کیا ہیں ؟ اب ہم بتائیں گے کہ اس علم کے حصول کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں ؟ وہ رکاوٹیں کہاں سے اُبھرتی ہیں اور ان کے دور کرنے یا ان پر قابو پانے کی تدابیر کیا ہیں ؟

ہمارے نزدیک یہ رکاوٹیں یا یہ حجابات دو قسم کے ہیں ، ایک تو وہ رکاوٹیں جن جن کے پیدا ہو جانے کے بعد علمِ حقیقی کے حصول کا راستہ ہی سرے سے بند ہو جاتا ہے ۔ یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ ان کے ہوتے ہوئے انسان کے اندر علمِ حقیقی کے لیے کوئی رغبت پیدا ہو سکے یا اس کے حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی جدوجہد کر سکے بلکہ یہ رکاوٹیں انسان کو اس قدر ناکارہ بنا دیتی ہیں کہ اس کی رغبت اور خواہش کے بغیر علمِ حقیقی اس پر کہیں سے برس بھی پڑے تب بھی وہ اس نعمت کی قدر نہیں کر سکتا ۔

دوسری وہ رکاوٹیں ہیں جن کی نوعیت آفتوں اور بیماریوں کی سی ہے یعنی یہ ایک آفت کی طرح انسان کے حاصل کردہ علم پر نازل ہوتی ہیں اور پھر یا تو دیمک کی طرح آہستہ آہستہ اس کے

پورے ذخیرہ کو چاٹ جاتی ہیں یا ایک برقِ خاطف کی طرح چشم زدن میں اس کو سوختہ کرکے رکھ دیتی ہیں۔ ہم نے پہلی قسم کی رکاوٹوں کے لیے حجابات کی اصطلاح اختیار کی ہے اور اس دوسری قسم کی مصیبتوں کے لیے آفات کی۔ ہم اس فصل میں حجابات کی وضاحت کریں گے اس کے بعد ایک علیحدہ فصل میں آفات پر بحث کریں گے۔ پھر ایک مستقل فصل میں ان کے دُور کرنے یا ان پر قابو پانے کی تدابیر بیان کریں گے۔

ہمارے نزدیک بڑے بڑے حجابات چار ہیں، جن کو مختصر تشریح کے ساتھ ہم یہاں بیان کرتے ہیں :

۱۔ حُبِّ عاجلہ

علم حقیقی سے محروم رکھنے والے حجابات میں سے سب سے بڑا حجاب، حُبِّ عاجلہ کا حجاب ہے۔ حبِّ عاجلہ کا مطلب ہے آخرت کی زندگی اور اس کی نعمتوں کے مقابل میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں اور راحتوں کو ترجیح دینا۔

آدمی کے سامنے سب سے پہلے اس کی جسمانی ضرورتیں اور خواہشیں ہی آتی ہیں اور انہی کے پورا کرنے پر اس کے مادی اور جسمانی وجود و بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ ان خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کوشش کرے۔ ایک خاص حد تک ان خواہشات اور ضروریات کی تحصیل میں انسان کا مصروف ہونا خود قدرت کا منشا ہے چنانچہ اسی مصلحت سے قدرت نے ان کے ساتھ لذت کی چاٹ بھی لگا رکھی ہے تاکہ انسان ان کو ایک بالکل بے مزہ اور محض مشقت کا دھندا سمجھ کر چھوڑ نہ بیٹھے بلکہ ان کے مطلوبات کو حاصل کرنے میں جوش اور سرگرمی کے ساتھ کوشش کرے تاکہ ان کے واسطہ سے انسان کے جو شخصی اور نوعی مصالح پورے ہونے ہیں وہ پورے ہو سکیں۔

لیکن ان چیزوں کے اندر انسان کا انہماک بس ایک خاص حد تک ہی مطلوب ہے۔ اگر یہ انہماک اس خاص حد سے آگے بڑھ جائے تو اس سے انسان کے روحانی اور اخلاقی اقدار کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ پھر یہ خواہشیں اور لذتیں انسان پر اس طرح سوار ہو جاتی ہیں کہ وہ بالکل ہی بطن و فرج کا غلام بن کے رہ جاتا ہے اور اس کو یہ سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں

ملتی کہ ان خواہشوں کی غلامی کے سوا اس کی زندگی کا اور کوئی مقصد بھی ہے اور اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس کے تقاضے اور مطالبات اس زندگی کے تقاضوں اور مطالبات سے کچھ مختلف ہیں۔ یہی گروہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ	کیا تمہارا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے
اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ	اور سمجھتے ہیں؛ یہ تو بس چوپایوں کی طرح ہیں،
بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝	بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

اسی طرح کے لوگوں کے بارہ میں دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ	ان سے پوچھو کہ کیا میں تمہیں خبر دوں، ان
اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ	لوگوں کی جو بالکل ہی گھاٹے میں رہے؛
فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ	یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری سرگرمیاں دنیا
يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا	کی زندگی کی لذتوں کے حاصل کرنے میں
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ	برباد ہوئیں اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑا اچھا
رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ	کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے
اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ	اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس کی ملاقات
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝	کا انکار کیا تو ان کے سارے اعمال اکارت
(کہف)	ہو کے رہ گئے۔ ہم ان کو قیامت کے دن
	کوئی وزن نہیں دیں گے۔

یہ حب عاجلہ کے گرفتاروں کی عام قسم ہے، دنیا میں زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو دنیاوی لذتوں اور راحتوں ہی کو اپنا مقصودِ زندگی بنا لیتے ہیں اور انہی کے حاصل کرنے اور انہی کی فراہمی میں اپنی زندگیاں گنوا دیتے ہیں۔

لیکن ان کے اندر ایک قسم ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو ان حقیر نفسانی لذتوں اور راحتوں کے مقابل میں بظاہر کچھ بلند مقاصد اور بلند اقدار کے طالب ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہ بلند مقاصد اور بلند اقدار بھی حب عاجلہ ہی کی ایک قسم

ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ عام قسم کے پست ذہن لوگ اپنے شخصی اغراض اور ذاتی فوائد ہی کے دائرہ کے اندر بند رہ جاتے ہیں، اس سے آگے انہیں ان خوبیوں اور ان کمالات کو اپنانے کا حوصلہ نہیں ہوتا جو ان کو خدا کی نظر میں نہ سہی کم از کم سوسائٹی ہی کی نظروں میں کچھ عزت و عظمت دلا سکیں لیکن یہ گروہ چونکہ اپنے اندر کچھ ذہانت رکھتا ہے اس وجہ سے وہ محدود شخصی اغراض و منافع سے آگے بڑھ کر کچھ ایسے کمالات حاصل کرنے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارتا ہے جو مجرد حسبِ ذات کے نصب العین سے بلند ہوتے ہیں مگر اس بلندی کی بساط بس اتنی ہوتی ہے کہ آدمی اپنی ذات اور اپنے نفس کی پرستش سے نکل کر اپنی سوسائٹی کی بندگی اور غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے لوگ بلاشبہ علوم اور کمالات کے طالب ہوتے ہیں، لیکن یہ انہی علوم کو علوم اور انہی کمالات کو کمالات سمجھتے ہیں جو وقت کی سوسائٹی میں ان کو عزت اور شہرت دلا سکیں یا جن سے وہ اپنے دنیاوی مقاصد زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے وقت کی سوسائٹی کے بندے ہوتے ہیں۔ سوسائٹی جن چیزوں کو پسند کرے یہ ان کے حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا زور و زر صرف کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، اگرچہ حقیقت کے نقطۂ نظر سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو اور اگر سوسائٹی کے اندر ایک چیز کی مانگ نہ ہو تو وہ اس چیز کی طرف کبھی مڑ کے بھی نہ دیکھیں گے اگرچہ وہ چیز آسمان ہی سے کیوں نہ اتری ہو۔ سوسائٹی میں اگر طلب ہو تو یہ سحر و ساحری اور علمِ فراستِ الید (PALMISTRY) کو بھی علم لدنّی کا درجہ دے دیں گے، لیکن اگر سوسائٹی میں مانگ نہ ہو تو نبیوں اور رسولوں کا علم بھی ان کی نگاہ میں اوہام و خرافات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ	یہ لوگ عاجلہ کو پسند کرتے ہیں اور اپنے
وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝	آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حبِ عاجلہ کے اس حجاب کو حجابِ طبع اور حجابِ رسم کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے اور ان دونوں حجابوں کی وضاحت اسی طرح فرمائی ہے:

"تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کے اندر کھانے پینے اور جماع کے تقاضے موجود ہیں، علاوہ ازیں اس کا دل مختلف طبعی تغیرات مثلاً غم، خوشی، غصہ اور خوف سے متأثر ہوتا رہتا ہے۔ چوں کہ ان میں سے ہر حالت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ آدمی کا نفس پہلے سے ان کے اسباب کی طرف متوجہ ہو اور اس کی تمام ذہنی قوتیں دوسری تمام سمتوں سے مڑ کر اس چیز کی طرف مرکوز ہو جائیں اس وجہ سے ان چیزوں میں وہ زیادہ مشغول رہتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر چیز کا اثر انسان کی طبیعت پر بعد میں بھی قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک طویل زمانہ ایسی حالت میں گذر جاتا ہے کہ یہ چیزیں اس کو اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ وہ ایک اعلیٰ چیز کی طرف متوجہ ہو سکے، بلکہ بہت سے لوگ تو اس کیچڑ میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ انہیں مدت العمر اس سے نکلنا ہی نصیب نہیں ہوتا، کتنے ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ان کا نفس اتنا غالب آجاتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے رسوم و آداب اور عقل کی ذمہ داریوں کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے اور کوئی علامت بھی ان کو ان کی نفس پرستی سے روک نہیں سکتی۔ اس حجاب کو حجابِ نفس کہتے ہیں۔

لیکن جن کے اندر عقل اور ذہانت موجود ہوتی ہے وہ انہی نفسانی تقاضوں کے اندر کچھ فرصت کے ایسے اوقات بھی نکال لیتے ہیں جن میں وہ نفسانی تقاضوں سے یکسو ہو کر اپنی عقلی اور عملی قوتوں کے لحاظ سے کچھ نوعی کمالات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب وہ شروع شروع میں آنکھیں کھولتے ہیں اور اپنی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ اسباب معیشت کی فراہمی، زینت و آرائش کے اہتمام، فخر و مباہات کے ہنگاموں اور فصاحت و خطابت اور علوم و فنون کی سرگرمیوں میں مصروف ہے تو یہی چیزیں ان کے دلوں کو بھی موہ لیتی ہیں اور وہ بھی انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں پوری دلچسپی اور پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول ہو جاتے ہیں اس کو حجابِ رسم اور حجابِ دنیا کہتے ہیں اور ایسے کتنے ہیں جو انہی چیزوں میں پھنسے ہوئے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو موت آجاتی ہے

لہ حجۃ اللہ البالغہ، باب الحجب المانعۃ عن ظہور الفطرۃ۔

شاہ صاحب کے اس بیان سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ یہ عموماً دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگ ہیں جو ساری ساری زندگیاں اپنے نفسانی تقاضوں کی تکمیل ہی میں گزار دیتے ہیں اور ان کو اس سے کسی اعلیٰ و برتر مقصد کی طرف توجہ کرنے کی بھی فرصت ہی نہیں ملتی، یا پھر وہ لوگ ہیں جو اگر کمال حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو بس انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں جن چیزوں کو وقت کی سوسائٹی کمال سمجھتی ہے اس سے آگے نہ ان کے نزدیک کمال کا کوئی تصور ہوتا ہے اور نہ ان کے حصول کے لیے ان کے اندر کوئی جذبہ پیدا ہوتا۔ ان کے حصولِ کمال کی ساری جدوجہد کا منتہا یہ ہوتا ہے کہ اسی طلبِ دنیا کے ایک جال سے نکلے اور پھر اُسی کے دوسرے جال میں جا پھنسے۔

۲- تکبّر

علم و معرفت کی راہ میں دوسرا بڑا حجاب تکبّر ہے۔ تکبّر کی تعریف خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرما دی ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک روایت ہے:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ	انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
علیہ وسلم لا یدخل الجنۃ	ارشاد فرمایا کہ جس کے دل کے اندر ذرہ برابر بھی
من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ	تکبّر ہوگا وہ جنت میں نہیں داخل ہوگا ایک شخص
من کبر فقال رجل ان الرجل	نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے
یحب ان یکون ثوبہ حسنا و	کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو
نعلہ حسنۃ فقال ان اللہ	تو کیا یہ بھی تکبّر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ خود صاحبِ
جمیل و یحب الجمال، الکبر	جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبّر یہ ہے
بطر الحق و غمط الناس۔	کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے

اس سے معلوم ہوا کہ تکبّر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے۔ بعض لوگ اپنے آپ کو اتنی بڑی چیز سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے اور ان کے یا ان کے زمرہ کے سوا کوئی اور شخص بھی کسی احترام یا اعتراف کا مستحق ہو سکتا ہے، ان کو جو

عزت و نعمت حاصل ہوتی ہے اس کو وہ اللہ کا فضل سمجھتے اور اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اس کو یا تو اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں یا اس کو اپنی کوشش اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے اور فخر کرتے ہیں۔ اسی چیز کو بعض احادیث میں اعجاب المرء بنفسہ (آدمی کی خود فریبی) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کے لیے تین بڑی مہلک چیزوں میں سے اس کو سب سے زیادہ مہلک شمار کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

واما المہلکات فھوی	رہیں تین مہلک چیزیں تو ان میں سے ایک
متبع وشح مطاع و	خواہشات کی پیروی ہے، دوسرے بخل
اعجاب المرء بنفسہ و	کی اطاعت اور تیسرے آدمی کا خود اپنے
ھو اشدھن۔	اوپر فریفتہ ہونا اور یہ چیز ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔

قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب سے پہلے خدا کی نافرمانی شیطان نے کی اور اس کی نافرمانی کی تہہ میں یہی تکبر کا جذبہ کارفرما تھا چنانچہ اس کے متعلق قرآن مجید میں بار بار یہ لفظ آئے ہیں ابی واستکبر (اس نے خدا کی اطاعت سے انکار کیا اور تکبر کیا)

قرآنِ مجید نے انبیاء کرام اور ان کی قوموں کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں بھی جگہ جگہ اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ انبیاء کے انکار میں سب سے پہلے ان کی قوموں کے اسی طبقہ نے سبقت کی جو تکبر میں مبتلا تھا، ان لوگوں کو اوّل تو یہی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی کہ خدا کی کسی نعمت کا مستحق ان کے اندر سے کوئی ایسا شخص قرار پائے جو ان کی طرح مالدار اور صاحب اقتدار نہیں ہے اور اگر اس بات پر کسی طرح وہ اپنی طبیعت کو راضی بھی کر لیتے تھے تو پھر اس بات کو برداشت کرنا ان کے لیے ناممکن ہوتا تھا کہ پیغمبر کے غریب ساتھیوں کو اپنا ساتھی اور اپنا ہمسر بنائیں اور ان کی صحبت میں برابر کے آدمی کی حیثیت سے بیٹھیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ کے اربابِ اقتدار اور مسند نشینوں نے ان کی باتوں کو محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس سے ان کی علمی و سیاسی برتری کا پندار مجروح ہوتا تھا

بعینہٖ یہی چیز قریش کے اکابر کے لیے بھی حجاب بنی رہی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہی ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو اس منصب پر سرفراز کرتا محمد جیسے نادار اور قلاش آدمی کو یہ عزت ہرگز نہ بخشتا۔ اور اگر کبھی بادلِ نخواستہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کرنے پر آمادہ بھی ہوتے تو اس کے لیے یہ شرط پیش کرتے کہ آپؐ کے اردگرد جو غریب اور نادار لوگ (ان کے الفاظ میں رذیل اور بیوقوف لوگ) جمع ہو گئے ہیں پہلے آپؐ ان کو اپنے پاس سے ہٹائیں تب ہم آپؐ کے پاس آئیں گے۔

بعینہٖ یہی صورتِ حال ہمیشہ انبیاء کے علاوہ دوسرے مصلحین اور داعیانِ حق کو بھی پیش آئی ہے۔ ان کی پیش کی ہوئی صداقتوں کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت و قوت کے ساتھ انہی لوگوں نے جھٹلایا ہے جو استکبار کے فتنہ میں مبتلا رہے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر آج تک جتنے مصلح اور داعیٔ حق پیدا ہوئے ہیں اگر ان کے حالات جمع کیے جائیں تو یہ چیز بطور قدرِ مشترک اس میں ملے گی کہ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی راہ کھولنے کی انہوں نے جو کوشش کی اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ متکبرین ہی بنے۔ نہ انہوں نے خود اس راہ پر چلنا پسند کیا اور نہ جہاں تک ان کا بس چلا انہوں نے دوسروں کو اس راہ پر چلنے دینا چاہا۔

اس تکبر کے ساتھ حسد اور غصہ کا پایا جانا بھی لازمی ہے جب ایک حقیقت متکبرین کے تکبر کے علی الرغم ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی ہے اور بالآخر ظہور میں آ رہتی ہے تو جو لوگ اس کے دبانے کے درپے ہوتے ہیں ان پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہوتی ہے اور حسد کے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں، اور اس حسد اور جھنجلاہٹ دونوں کے مرکب سے پھر دوسری بہت سی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو آدمی کو حق سے اتنا دور کر دیتی ہیں کہ اس کے لیے حق کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

۳۔ عصبیتِ جاہلیت

معرفتِ حق کے حجابات میں سے ایک حجاب عصبیتِ جاہلیت بھی ہے۔ عصبیتِ جاہلیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص قدیم روایات و مالوفات، قدیم رسم و رواج اور باپ دادا کے طریقہ کے تعصب میں گرفتار ہو جائے کہ نہ ان پر کوئی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار ہو اور نہ ان کی جگہ کوئی اور چیز

قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ اور قدیم روایات سے محبت بجائے خود بری چیز نہیں ہے بلکہ بعض اعتبارات سے نہایت اچھی اور نہایت ضروری چیز ہے لیکن ان روایات کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی جگہ ان سے بہتر چیز قبول نہ کرنا جاہلی عصبیت ہے جو علم و معرفت اور حق و صداقت کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کو ان کی قوموں نے زیادہ تر اسی تعصب کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارے باپ دادا جو علم و فضل اور اخلاق و عمل میں بہرحال پچھلوں سے برتر تھے۔ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کا اختیار کیا ہوا کوئی طریقہ غلط ہو اور بعد والے آکر اس کی اصلاح کریں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے میں اپنے اسلاف کی توہین اور خود اپنی سبکی خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک قدامت بجائے خود ان کے عقیدہ و مسلک کی صحت و صداقت کی ایک ایسی دلیل تھی جس کو دنیا کی کوئی اور دلیل باطل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے مقابل میں نہ وہ عقل کا فیصلہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے نہ کسی وحی کو کوئی اہمیت دیتے تھے، وہ جس راہ پر چل رہے تھے، اس پر پوری طرح قانع اور مطمئن تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کے لیے جو کچھ بہتر ہو سکتا تھا وہ سب کچھ باپ دادا پر روشن تھا۔ اب اس میں کسی ترمیم یا کسی اضافہ کی گنجائش نہیں ہے ان کے وجدنا علیہ اٰبآءنا کے نعرہ کے اندر ان کا ماضی، ان کا حال اور ان کا مستقبل سب کچھ محفوظ تھا، اس وجہ سے وہ اس گنبد سے باہر نکلنے کے لیے کسی طرح بھی آمادہ نہ تھے اگرچہ اس گنبد سے باہر نکلنے کے لیے ان کو کوئی نبی ہی کیوں نہ دعوت دے رہا ہو۔

قدیم سے محبت اور قدامت کے ساتھ غیر معتدل حسن ظن کا یہی جذبہ ہے جس نے ہمارے یہاں اندھی تقلید کی طرح ڈالی۔ اندھی تقلید کا مطلب یہ ہے کہ اگلوں میں سے کسی کے ساتھ اتنا حسن ظن ہو جائے کہ اس کو بجائے خود سند تسلیم کر لیا جائے اور اس کے کسی قول یا فعل کو کتاب و سنت کی کسوٹی پہ پرکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کا کوئی قول یا فعل کتاب و سنت کے خلاف بھی نظر آئے اور کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ بھی دلائے جب بھی اس بات پر اصرار کیا جائے جو اس نے کہی ہے اور اس کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جائے کہ وہ کتاب و سنت کی پچھلوں سے زیادہ جاننے والا ہے اس وجہ سے اس کی بات ضرور کتاب و سنت کی کسی نہ کسی دلیل پر مبنی ہوگی اگرچہ وہ دلیل ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ اس قسم کی تقلید کتاب و سنت کو عملی

اعتبار سے بالکل بانجھ بنا کر رکھ دیتی ہے کیوں کہ تقلید زدہ طبقہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کتاب و سنّت سے جو کچھ نکالا جا سکتا تھا وہ اسلاف نے اچھی طرح بلو کر نکال لیا ہے اب جو کچھ بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہی چھاچھ ہے۔

۴۔ غفلت یا لا اُبالی

علم کے لیے ایک بڑا حجاب غفلت اور لا اُبالی پن بھی ہے۔ غفلت اور لا اُبالی پن کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زندگی کے کسی پہلو پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کرے بلکہ اس کو کسی نہ کسی طرح صرف گزار دینے پر قانع ہو جائے ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے — عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اس ذہنیت کے لوگ کبھی اس سوال پر غور نہیں کرتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، کہاں جائیں گے اور جس نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا ہے اس نے کس مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اگر وہ مقصد ہم نے پورا نہ کیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ نہیں ہے کہ اس طرح کے سوالات اُن کے ذہن میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے، پیدا تو ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی ان کو حل کرنے میں اپنے آپ کو پریشان نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یہ معمہ نہ کسی سے حل ہوا ہے اور نہ حل ہوگا۔ اس وجہ سے ان کی ساری جدوجہد صرف اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کے عیش اور ان کی بے فکری میں کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے اگر ان کی اس خواہش اور کوشش کے باوجود کوئی تلخ حقیقت سامنے آ ہی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ رُو در رُو ہو کر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں وہ اس کے مقابل میں شتر مرغ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں یعنی وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیتے ہیں اور پھر یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ تلخ حقیقت گزر گئی۔

حد یہ ہے کہ جو لوگ اس لا اُبالی پن کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ان آزمائشوں سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے جن میں وہ مبتلا کیے جاتے ہیں کہ ان کا یہ لا اُبالی پن دور ہو اور وہ اپنی زندگی کے مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور سنجیدہ نتائج پر پہنچنے کی طرف مائل ہوں۔ ان لوگوں کی مثال حدیث میں گدھے سے دی گئی ہے جس کو اس کا مالک کبھی کھول دیتا ہے اور کبھی باندھ دیتا ہے لیکن اس کو کچھ پتہ نہیں کہ کیوں اس نے اس کو باندھا اور کیوں کھول دیا۔

اس گروہ کے اندر ایک عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کو زندگی کی ابتدائی ضروریات روٹی کپڑے ۔۔۔ کی فراہمی سے اوّل تو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی اور اعلیٰ اور برتر مقصد کے حاصل کرنے کے درپے ہوں اور اگر فرصت ملتی بھی ہے تو اس کو وہ کسی نہ کسی ایسے مشغلہ میں صرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے ان کو زندگی کی تلخیوں سے کم از کم غافل ہی کر دے۔ اس مقصد کے لیے ان لوگوں نے کچھ عقل کو مغلوب کر دینے والی منشیات اور طبیعت کو بہلانے والی دلچسپیاں ایجاد کر رکھی ہیں جن سے وقتی طور پر ان کو کچھ تفریح حاصل ہو جایا کرتی ہے لیکن جوں ہی وہ ان سے الگ ہوئے اور ان سُن کر دینے والی دواؤں کا اثر دور ہوا زندگی کی تلخیوں کی وہ ساری ٹیسیں مزید زور و قوت کے ساتھ پھر عود کر آتی ہیں جن سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان سُن کر دینے والی دواؤں کی مدد حاصل کی تھی۔ حالانکہ اگر وہ اپنا یہ تھوڑا سا فرصت کا وقت ان فضولیات پر ضائع کرنے کے بجائے زندگی کی اعلیٰ حقیقتوں کو سمجھنے پر صرف کرتے تو اس سے وہ اپنی دُنیا اور اپنی آخرت دونوں میں بہتر نتائج حاصل کرتے لیکن اُن کا لاأُبالی پن اُن کو کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتا جس میں کچھ سنجیدگی ہو اور جس کے لیے کچھ دماغ اور عقل صرف کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

تصانیف و تراجم

از نامہ پروفیسر غلام احمد حریری

برائے عام قارئین:

درسی کتب

آفاتِ علم

جس طرح کسی سرسبز و شاداب باغ پر کوئی آفتِ ارضی و سماوی نازل ہو جاتی ہے اور وہ تباہ ہو کے رہ جاتا ہے جس طرح لہلہاتی ہوئی کھیتی کو کوئی روگ لگ جاتا ہے جس سے وہ دفعتہً یا آہستہ آہستہ جھلس جاتی ہے۔ جس طرح ایک عالی شان عمارت نذرِ تغافل ہو جانے کے سبب سے یا کسی زلزلہ کی وجہ سے کھنڈر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک تنومند اور تندرست انسان کسی بیماری کا شکار ہو کر موت کے کنارے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح علم و معرفت کو تباہ کر دینے والی بھی بہت سی بیماریاں ہیں جو اگر اس کی جڑوں کو لگ جائیں تو پھر اس کو ختم کر کے ہی دم لیتی ہیں۔ ان آفتوں میں سے بعض اپنے مزاج کے لحاظ سے جلد اور تیز اثر کرنے والی ہیں اور بعض آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ بعض انفرادی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں اور بعض وبائی بیماریوں کی طرح پھوٹ پڑتی ہیں بعض عقل اور ذہن کی طرف سے نمودار ہوتی ہیں۔ بعض اخلاق و عمل کی طرف سے، بعض محض کاہلی اور بے پروائی سے پیدا ہوتی ہیں۔ بعض جان، مال یا جامع لفظوں میں دنیا کی غیر معمولی محبت کے سبب سے، بعض بزدلی، پست ہمتی اور خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں اور بعض گھمنڈ، غرور اور خود پسندی اور انانیت کا ان اعتبارات سے ان کے درجہ اور ان کی نوعیت میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے لیکن

جہاں تک ان کے اثر اور نتیجہ کا تعلق ہے یہ سب انسان کو علمِ حقیقی کی دولت سے محروم کر دینے کی خاصیت میں بالکل یکساں ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہر انسان جو ایک مرتبہ علم کی دولت پا کر اس سے محروم ہو جانے کے لیے تیار نہ ہو وہ ان بیماریوں کی نوعیت اور ان کے علاج کے طریقوں سے اچھی طرح واقف رہے۔ اپنی صحت کی قدر کرنے والا ایک شخص جتنا اہتمام ان بیماریوں سے واقف رہنے کے لیے کرتا ہے جو اس کی صحت کو برباد کر سکتی ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری، علمِ حقیقی کے ایک قدردان کے لیے ان آفتوں سے باخبر رہنا ہے جو اس کے علم کو غارت کر سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنے خزانہ کی حفاظت کا اہتمام اس کی قدر و قیمت کے لحاظ سے کرتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جسمانی صحت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو اس سے جو نقصان اس کو پہنچے گا وہ بیشتر اسی دنیا کی زندگی تک محدود رہے گا۔ لیکن اگر ایک شخص علمِ حقیقی کی نعمت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان بیماریوں کی اس اہمیت کے سبب سے ہم یہاں ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

غفلت اور بے پروائی

ان بیماریوں میں سب سے زیادہ عام بیماری غفلت اور بے پروائی کی بیماری ہے۔ انسان کا کچھ خاصہ سا ہے کہ جو چیز اس کے پاس موجود ہو، اس کی قدر آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں میں کم ہو جایا کرتی ہے اور جس چیز کی قدر کم ہو جائے لازماً اس کے رکھ رکھاؤ میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ جب ایک چیز کے رکھ رکھاؤ میں فرق آیا تو پھر ناگزیر ہے کہ اس پر تغافل کا سایہ پڑنا شروع ہو جائے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس پر ایک دن ایسا آئے کہ وہ بالکل ہی عدم کی تاریکی میں چھپ جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نسیان کو علم کی سب سے زیادہ عام آفت قرار دیا ہے۔

آپؐ کا ارشاد ہے:

آفة العلم النسیان — علم کے لیے بڑی آفت بھول جانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق (جو علمِ حقیقی کا خزانہ ہے) آپؐ نے خاص طور پر یہ ہدایت فرمائی ہے کہ لوگ اپنے قرآن کے علم کو برابر تازہ کرتے رہیں تاکہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

آپؐ کے الفاظ یہ ہیں:

تعاهدوا القرآن فانہ اشد	اپنے علم قرآن کو برابر تازہ کرتے رہو جس طرح
تفصیا من صدور الرجال	اونٹ غفلت کے سبب سے کھو جاتا ہے
من النعم	اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ قرآن سینوں
(متفق علیہ)	سے نکل جایا کرتا ہے۔

دوسری روایت میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

مثل صاحب القرآن کمثل	اس شخص کی مثال جس کے پاس قرآن کا علم ہو
صاحب الابل المعقلۃ	اس شخص کی ہے جس کے پاس بندھنوں میں
ان عاھد علیھا امسکھا	بندھے ہوئے اونٹ ہوں اگر وہ ان کی دیکھ
وان اطلقھا ذھبت	بھال کرتا رہتا ہے تو وہ محفوظ رہتے ہیں اور
	اگر وہ ان سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر وہ کہیں
	کے کہیں چل دیتے ہیں۔

یعنی علم کے لیے صرف ایک مرتبہ حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو حاصل کر لینے کے بعد بار بار اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا بھی ضروری ہے ورنہ اس کی مثال ایسی ہو گی کہ ایک شخص صرف کثیر اور اہتمام و انتظام کی تمام زحمتیں جھیل کر کسی دور دراز ولایت سے ایک قیمتی پودا منگوائے لیکن منگا چکنے کے بعد پھر اس کی خبر نہ لے کہ وہ کس حال میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو پودا جس قدر قیمتی ہوتا ہے، وہ اسی قدر رکھ رکھاؤ اور اہتمام کا طالب ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز اس کو حاصل نہ ہو سکے تو پھر اس کا نشوونما پانا تو درکنار اس کا محفوظ رہنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہی حال حقیقی علم کا ہے، جہاں تک اس کے حاصل ہونے کا تعلق ہے اس کا راستہ ہر طالب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جس طرح آسمان سے بارش برستی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سب سے بڑی نعمت بھی برسائی ہے اور اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کے صالح بندوں نے اس نعمت کے تقسیم کرنے میں، تاریخ کے کسی دور میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور اس علم کو بقدر استعداد پایا بھی بہتوں نے ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں بہت تھوڑے ہی پورے اترے ہیں،

اور در حقیقت یہی تھوڑے سے پورے اترنے والے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ یاب ہوئے ہیں ورنہ بہتوں کے لیے، جیسا کہ بعض حدیثوں میں فرمایا گیا ہے۔ یہ علم مفید ہونے کے بجائے ان کے خلاف ایک حجت ہی ثابت ہوا ہے۔

یہی سبب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید کی بعض آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبریلؑ امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی آیتیں سناتے تو آپؐ اس اندیشہ سے کہ کوئی چیز یاد کرنے سے رہ نہ جائے اس کو بار بار دہراتے اور اس کو اچھی طرح محفوظ کرنے کی کوشش فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس فکر سے فارغ کر دینے کے لیے قرآن مجید کو جمع کرنے اور اس کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری خود لے لی اور آپؐ کو ان الفاظ میں تسلی دی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ	تم اس کو (قرآن کو) جلد حاصل کر لینے کے
بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ	لیے اس پر اپنی زبان نہ چلاؤ، ہماری ذمہ داری
قُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ	ہے اس کو محفوظ کرنا اور اس کو سنانا، سو
فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ	جب ہم اس کو سنائیں تو تم اس سنائے
عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ	ہوئے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمہ
(سورہ قیٰمۃ)	ہے اس کی وضاحت کرنا۔

یہ قرآن کو محفوظ رکھنے کا مقصد ہی ہے جس کی وجہ سے اس کو ایسے اسلوب میں ڈھالا گیا کہ اس کو یاد رکھنا آسان ہو، اور پھر اس کی بار بار تلاوت کا حکم دیا گیا، اور پنج وقتہ نمازوں میں اس کی تلاوت کو ضروری قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں رمضان کی راتوں میں خاص اہتمام کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ٹھیرایا گیا کہ مساجد میں قرآن پڑھا جائے اور لوگ اس کو سنیں خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرض اور نفل نمازوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، قرآن کا جتنا جتنا حصہ اترتا جاتا اور جس جس کو پہنچتا جاتا وہ اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ اہتمام صرف قرآن کے الفاظ ہی کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں تھا بلکہ الفاظ سے زیادہ اس کے معانی و مطالب کے محفوظ کرنے

کے لیے صحابہؓ میں سرگرمی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ صحابہ اپنے زمانہ میں مختلف علمی مجلسیں قائم کرتے تھے، جن میں قرآن مجید کے معانی و مطالب اور اس کے اسرار و حقائق پر گفتگوئیں ہوتی تھیں ان حلقوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے تھے اور تحقیقِ قرآنی کی ان مجلسوں کو آپؐ ذکر و عبادت کی مجلسوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

قرآن اور علوم نبویؐ کو محفوظ کرنے کا یہی ذوق و شوق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے زمانوں میں بھی باقی رہا۔ خلفائے راشدین خود اس دلچسپی کو بڑھاتے میں حصہ لیتے رہے بخصوصیت کے ساتھ حضرت عمرؓ نے اس خدمت میں جو حصہ لیا اس کے ذکر سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کے لیے حفاظت کا یہ اہتمام پچھلی اُمتوں کے زمانوں میں نہ ہو سکا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا اور یہ امتیں اللہ تعالیٰ کی روشنی پانے کے بعد ان سے محروم ہو گئیں۔ چنانچہ یہود کا حال جو ہوا اس کی مثال قرآن نے یہ دی ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ (بقرہ: ۱۷)	ان کی مثال بالکل اس شخص کی ہے جس نے آگ جلائی جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا، تو اللہ نے ان کی روشنی اچک لی اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا جہاں ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

انہی یہود کے متعلق فرمایا ہے کہ:

وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ۔ (مائدہ: ۱۳)	اور جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ انھوں نے فراموش کر دیا اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے مطلع ہوتے رہو گے۔

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ انھوں نے

اللہ تعالیٰ کے آتائے ہوئے علم کا ایک حصّہ اپنی ناقدری اور بے پروائی کے سبب سے فراموش کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کی مستقل بنیادیں قائم ہو گئیں جن کے رفع ہونے کی اب ان کے پاس کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی ۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى	اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا کہ ہم نصرانی
اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا	ہیں، ہم نے ان کا عہد لیا تو وہ بھلا بیٹھے ،
حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا	ایک حصّہ اس چیز کا جس کے ذریعہ سے ان
بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ	کو یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔	دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی ، قیامت
(مائدہ : ۱۴)	تک کے لیے ۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی

دوسری چیز جو علمِ حقیقی سے محروم کرنے والی ہے وہ خواہشات نفس کی پیروی ہے اس کے لیے قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح اتباعِ ہوا ہے ۔ اتباعِ ہوا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کی تکمیل ، اپنی خواہشات کے حصول ، اپنی شہوات کی تسکین اور اپنے جذبات کی تسلّی کے سوا اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہ رکھے ان کے سوا اس کے سامنے زندگی کا کوئی اور اعلیٰ اور بلند تر مقصد نہ رہ جائے ۔ وہ انہی چیزوں کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھ بیٹھے اور اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں اور اپنے تمام ذرائع و وسائل بس انہی کی خدمت اور انہی کی مقصد براری میں لگا دے ۔ ان کی لذتیں اور ان کے نقد منافع اس کو اس طرح مسحور کر لیں کہ اس کو یہ سوچنے کا کبھی موقع ہی نہ مل سکے کہ ان سے بڑھ کر بھی کوئی چیز چاہنے کی ہو سکتی ہے اور یہ زندگی اس کے حاصل کرنے کا بھی ذریعہ بن سکتی ہے ۔

اس اتباعِ ہوا کا ایک مرحلہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات و شہوات کی تعمیل میں اس قدر آگے بڑھ جائے کہ زندگی کے اندر وہ ان کے سوا یا تو کسی اور اعلیٰ اصول اور کسی برتر قدر کا سرے سے قائل ہی نہ رہ جائے یا قائل تو رہے لیکن اپنے ان نفسانی مطلوبات کے حصول میں ان کا حائل ہونا کسی طرح گوارا نہ کرے وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جب اُٹھے تو اس چیز سے بالکل آنکھیں بند کر کے اُٹھے کہ حرام و حلال اور ظلم و انصاف کے کچھ معروف

ضابطے بھی ہیں جن کا اس کو احترام کرنا ہے۔ جب اس کے اوپر شہوت کا بھوت سوار ہو تو وہ صرف اس بات پر نگاہ رکھے کہ اس کی یہ شہوت کی آگ بجھتی کس طرح ہے، اس سے بالکل قطع نظر کرے کہ اس کے لیے خدا اور رسُول نے کچھ حدود بھی مقرر کیے ہیں جن سے تجاوز کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ جب اس پر یہ جذبہ غالب آجائے تو وہ اس کے تقاضوں کی رَو میں بہہ جانے کے لیے اپنے آپ کو اس کی موجوں کے حوالہ کر دے۔ اس سے اسے کچھ بحث نہ رہے کہ یہ جذبہ بُرا ہے یا اچھا اور اس کے اندر اعتدال اور بے اعتدالی کی حدیں کیا ہیں۔ بالغرض وہ ایک نرا حیوان بن جائے اور حیوانوں ہی کی طرح اپنی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے۔ بس اگر کچھ فرق رہ جائے تو یہ کہ حیوانات کے لیے کچھ جبلّی حدود ہوتے ہیں جن کی پابندی پر وہ مجبور ہوتے ہیں، اس وجہ سے کسی راہ میں بھی قدرت کی مقرر کی ہوئی ایک متعیّن حد سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے اور یہ ایک خود مختار مخلوق ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں جس قدر آگے بڑھنا چاہے، بڑھتا چلا جائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ — یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس اتباعِ ہوا کا دوسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ آدمی صرف حلال و حرام کے لیے حدود توڑنے پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اس قدر اندھا ہو جائے کہ ان کی خاطر تمام اقدار کو تلپٹ کر دینے کے درپے ہو جائے، اس کی کوشش یہ ہونے لگے کہ معروف، منکر بن جائے اور منکر معروف کی جگہ حاصل کرے جو چیز اب تک نیکی سمجھی گئی ہے وہ بدی سمجھی جانے لگے اور جو بدی ہے وہ نیکی کی حیثیت اختیار کر لے، قوم کی روایات قوم کی تہذیب اور قوم کے سارے معیارات یک قلم تبدیل ہو جائیں، دین و مذہب کے نام سے جو چیز موجود ہے اس کا اوّل تو خاتمہ ہو جائے لیکن اگر خاتمہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی وہ چیزیں جو کسی پہلو سے نفس کی آزادیوں میں خلل انداز ہوتی ہیں، مٹا دی جائیں، ان میں سے بعض کو ملائیت اور دقیانوسیت کہہ کر ختم کر ڈالا جائے، کچھ پر تحریف کی قینچی چلا دی جائے

کچھ پر تاویلِ باطل کی سیاہی پھیر دی جائے۔ صرف انہی چیزوں کو باقی رہنے دیا جائے جو نفس کی خواہشوں کے مطابق ہیں یا کم از کم ان سے متصادم نہیں ہیں۔

انسان کی یہ کوشش اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی میں اس قدر بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں رہ جاتا کہ کسی گوشہ سے اس کے کانوں میں ملامت کی کوئی آواز پڑے اس خیال سے وہ یا تو ان ساری چیزوں کو مٹا دیتا ہے جو اس کے نفس کو کھٹکتی ہیں یا ان کو تاویل و تحریف کے پردوں میں چھپا دیتا ہے تاکہ ان کے سبب سے اس کی نفس پرستی پر اس کا ضمیر کوئی خلش نہ محسوس کرے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کتر بیونت اور اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد مذہب کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں کے کسی گوشہ میں اگر بچ رہتا ہے تو اس وجہ سے نہیں بچ رہتا ہے کہ وہ مذہب کا حصہ ہے، یا خدا نے اپنی کتاب میں اس کی تعلیم دی ہے یا رسول نے اپنے قول اور فعل سے اس کو قائم کیا ہے بلکہ اس کے بچ رہنے کی واحد وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ ان کے خلاف نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث کی کسی بات کو اس لیے ماننا کہ یہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہے، یہ قرآن و حدیث اور اللہ اور رسول کا ماننا نہیں ہے بلکہ یہ محض اپنی خواہشوں کی پرستش ہے۔ خدا اور رسول کو ماننے کے لیے تو یہ لازمی ہے کہ ان کی ہر بات مانی جائے خواہ وہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہوں یا اُن کے خلاف بلکہ ایمان کا حقیقی تقاضا تو خواہشوں کے خلاف ماننے ہی سے پورا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لا یؤمن احدکم حتی یکون	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک
ھواہ تبعًا لما جئتُ	مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشیں
بہ۔	میرے لائے ہوئے علم کے تابع نہ بن جائیں

انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی بنائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں طرح کے رجحانات ودیعت کر دیے ہیں۔ جہاں تک اس کی ضروریات و خواہشات کا تعلق ہے وہ تو اس کو پوری طاقت کے ساتھ نفعِ عاجل اور لذتِ عاجل کی طرف کھینچتی ہیں اور اسکو

اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی اخلاقی قید و بند کو حائل ہونے دے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کچھ روحانی تقاضے بھی ہیں جو اس کے ہر غلط اقدام پر اس کو ٹوکتے رہتے ہیں اور اس کی نفسانی خواہشوں کے علی الرغم اس کو نیکی، انصاف اور حق پرستی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف کھینچتے ہیں۔ انسان کی نفسانی اور روحانی کش مکش کا یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کی دست گیری اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے انسان کو علم حقیقی کی روشنی عطا فرمائی ہے اور اس علم حقیقی کو "اَلْعِلْمُ" کی اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں رکھی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل میں "اَھْوَاءَ" یعنی اپنی خواہشات، اپنے من گھڑت نظریات و افکار اور اپنے جی سے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کی (جو اَلْعِلْم کے خلاف ہوں) پیروی کرتا ہے تو وہ اس قانون کی مخالفت کرتا ہے جو فاطر السمٰوات والارض نے انسان کی فلاح و نجات کے لیے بنایا ہے اور اس صورت میں اس کو خدا کے قانون کی مخالفت کے بُرے انجام سے کوئی طاقت بھی نہیں بچا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید کی یہ آیت واضح کر دی ہے:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ	اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے
مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ	بعد اس کے کہ تمہارے پاس "العلم"
الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ	آچکا ہے تو اللہ کے مقابل میں کوئی تمہارا
وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ (رعد: ۳۷)	کارساز اور بچانے والا نہیں بن سکے گا۔

اس "العلم" اور "ھواءَ" کی طبیعت میں ہر اعتبار سے بالکل تضاد ہے، ایک کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور دوسرے کا منبع انسان کا اپنا نفس، ایک ہمیشہ انسان کو ابدی زندگی کی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے اشارہ کرتا ہے اور دوسری چیز اس کو اسی زندگی کی فانی لذتوں کی کیچڑ میں لت پت رکھنا چاہتی ہے۔ ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان مادی خواہشوں اور لذتوں کی تنگ نائے سے نکل کر روحانی کمالات کے حاصل کرنے کے لیے پرواز کرے لیکن دوسرے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انسان اسی زمین کا کیڑا بنا رہے۔ اس کوشش اور خواہش میں کچھ عرصہ تک کش مکش رہتی ہے لیکن بالآخر یہ کش مکش اس وقت ختم ہوتی ہے جب

انسان ان میں سے کسی ایک کو مستقلاً اپنے لیے انتخاب کر لیتا ہے اگر وہ برابر "العلم" کے مقابل میں "ھواء" ہی کو ترجیح دیتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کے بجائے پستیوں ہی میں گرے ہوئے رہنے کو پسند کرتا ہے اور خدا کے بجائے اپنے نفس اور اس کی خواہشوں ہی کی راہنمائی پر اعتماد کرتا ہے اور اس پر دناءت اور رذالت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر سے خیر کی طرف اور بدی سے نیکی کی طرف موڑنے کے لیے عُسر اور یُسر اور رنج و راحت کے جو امتحانات رکھے ہیں ان سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں ہی صورتوں میں کُتّے کی طرح زبان نکالے ہی رہتا ہے تو ایسے لوگوں سے "العلم" کی نعمت سلب ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خواہشوں اور لذتوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ ان کے پیچھے جن جن وادیوں میں بھٹکنا چاہتے ہیں اچھی طرح بھٹک لیں۔ قرآن مجید نے اسی صورت حال کی تصویر ایک تمثیل کے ذریعہ سے پیش کی ہے۔ اور دیکھیے کس قدر جامع اور خوب صورت تمثیل ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ۞ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ۔ (الاعراف: ۱۷۶)	اور ان کو سرگزشت سناؤ اس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیتیں عنایت کی تھیں، ان سے وہ بالکل کنارہ کش ہو گیا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا پس وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے ذریعے سے اس کو بلند کرتے لیکن وہ برابر پستی ہی کی طرف جھکا رہا، اور اس نے اپنی خواہشوں ہی کی پیروی کی، پس اس کی مثال بالکل کتے کی مثال ہے اگر تم اس کو ڈانٹو ڈپٹو جب بھی اپنی زبان نکالے رکھے گا اور اگر چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رکھے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ نے یہود کی مثال بیان کی ہے جن کو "العلم" کی روشنی عطا ہوئی تھی لیکن

انہوں نے اس روشنی کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان ان کے پیچھے لگ گیا اور اس نے ان کو بالکل ہی ایمان سے محروم کر کے چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ ان آیتوں کی کمند کا سہارا لے کر روحانی بلندیوں کے مقامات طے کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں لیکن وہ برابر اپنی ہوائے نفس ہی سے چمٹے رہے، اور اس قدر پست ہمت اور ذلیل ہو گئے کہ نہ خدا کی تنبیہات نے ان پر کچھ اثر ڈالا اور نہ اس کی عنایات نے۔ بالآخر جب وہ اس قدر ذلیل اور پست ہمت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے "العلم" کی روشنی ان سے چھین لی اور ان کو ان کے نفس کے حوالہ کر دیا۔

عدمِ احتساب

علمِ حقیقی کو برباد کرنے والی آفتوں میں سے ایک بہت بڑی آفت عدمِ احتساب بھی ہے۔ عدمِ احتساب کے معنی یہ ہیں کہ آدمی نیکی اور بدی اور حق اور باطل کے معاملہ میں بالکل بے تعلق ہو کے رہ جائے اسے اس سے کچھ بحث ہی نہ رہے کہ دنیا نیکی کی طرف جا رہی ہے یا بدی کی طرف، خیر کی طرف بڑھ رہی ہے یا شر کی طرف، معاشرہ بگڑ رہا ہے یا بن رہا ہے وہ یا تو یہ نظریہ قائم کر لے کہ یہ پرائے جھگڑے ہیں اور پرائے جھگڑے نمٹانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے یا بقا کی اور حالات کی ناسازگاری اس کو اس قدر پست ہمت اور بزدل بنا دے کہ صریح سے صریح انحراف کو دیکھ کر بھی اس کی زبان سے کلمۂ حق نہ نکلے۔ اگر کسی قوم کے اندر حاملینِ علم کی اکثریت یا ان کی پوری جماعت کی جماعت یہی روش اختیار کر لے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قوم پر باطل کی تاریکی چھا جاتی ہے اور وہ علمِ حقیقی کے نُور سے بالکل ہی محروم ہو جاتی ہے۔

کسی معاشرے کے اندر جس وقت کسی خرابی کا آغاز ہوتا ہے، اس وقت یہ خرابی زیادہ طاقت ور نہیں ہوتی اگر اسی مرحلہ میں معاشرے کے ذمہ دار لوگ اس کے احتساب کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور برائی کے ذمّہ داروں کو مناسب تنبیہ ہو جائے تو اس کے مزید پھیلنے کے امکانات کا سدِّ باب ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس سے تغافل برتا جائے تو آہستہ آہستہ وہی معمولی سی بُرائی جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھر اس کے برگ و بار اس قدر پھیل جاتے ہیں کہ ان پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اس احتساب کے لیے قرآن کی معروف اصطلاح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غفلت کی جائے تو اس کے نتائج کا پہلا مرحلہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ معروف منکر اور منکر، معروف کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ طبیعتیں مسخ ہو کر بدی کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار تھے، وہ علانیہ بدی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے لگ جاتے ہیں۔ اس کا تیسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ علم حقیقی کی روشنی بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے اور تمام معاشرے پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے علم رکھنے والوں کی عقل بھی چکرا جاتی ہے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس فتنہ سے بھاگ کے کہاں جائیں اور کیا کریں؟ ان تمام مراحل کی تصویر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر کھینچ دی ہے، ملاحظہ ہو:

کیف انتم اذا طغیٰ نساؤکم	حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
و فسق شبابکم و ترکتم جہادکم	اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہاری
قالوا و ان ذٰلک لکائن یارسول	عورتیں بے قابو ہو جائیں گی، تمہارے نوجوان
اللہ قال نعم والذی نفسی بیدہٖ	بدچلن ہو جائیں گے اور تم جہاد چھوڑ بیٹھو گے۔
واشد منہ سیکون قالوا	لوگوں نے کہا، یارسول اللہ کیا یہ بھی ہونے
وما اشد منہ یارسول اللہ	والا ہے، آپ نے فرمایا، ہاں خدا کی قسم
قال کیف انتم اذا لم تامروا	جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے
بالمعروف و تنہوا عن المنکر	بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے، لوگوں
قالوا او کائن ذالک یا رسول	نے پوچھا، یارسول اللہ! اس سے زیادہ
اللہ، قال نعم والذی نفسی	سخت مرحلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اس
بیدہٖ و اشد منہ سیکون	وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کا حکم

قالوا وما اشد منه؟ قال كيف انتم اذا رأيتم المعروف منكرا والمنكر معروفا، قالوا او كائن ذلك يا رسول الله؟ قال نعم والذي نفسي بيده واشد منه سيكون۔ قالوا وما اشد منه؟ قال كيف انتم اذا امرتم بالمنكر ونهيتم عن المعروف۔ قالوا او كائن ذلك يا رسول الله قال نعم والذي نفسي بيده واشد منه سيكون۔ يقول الله تعالى بي حلفت لاتيحن لهم فتنة يصير الحليم فيها حيران۔

دو گے تو برائی سے روکو گے؟ لوگوں نے کہا یارسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی سخت مرحلہ سامنے آنے والا ہے لوگوں نے دریافت کیا، یارسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا؟ جب تم دیکھو گے کہ معروف منکر بن گیا ہے اور منکر معروف بن گیا ہے؟ لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اور خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے، لوگوں نے پوچھا، یارسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا، جب تم بُرائی کا حکم دو گے اور بھلائی سے روکو گے؟ لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اور اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت وقت آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ اُس وقت میں اُن کے لیے ایسا فتنہ برپا کروں گا کہ بڑے بڑے دانش ور بھی چکر میں پڑ جائیں گے۔

اس حدیث سے وہ پوری تدریج سامنے آجاتی ہے جس تدریج سے احتساب کے فرض سے غفلت نمایاں ہوتے ہی فتنہ کی تاریکی بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس طرح چھا جاتی ہے کہ بڑے بڑوں کو بھی نیکی اور سچائی کی راہ سجھائی نہیں دیتی اور آنکھیں رکھنے والے بھی اندھے بن جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا مضمون کی تائید بعض دوسری حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اُس خدا
قال والذی نفسی بیدہ لتامرن	کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یا تو تم
بالمعروف وتنھون عن المنکر	نیکی کا حکم دوگے اور برائی سے روکو گے یا
اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم	یہ ہوگا کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب
عذابا من عندہ ثم لتدعونہ	بھیجے گا۔ پھر تم اس کو پکارو گے لیکن تمہاری سُنی
فلا یستجاب لکم۔	نہیں جائے گی۔

ایک دوسری حدیث میں یہی حقیقت ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوئی ہے:

ما من قوم یعمل فیہ	جس قوم کے اندر برائی پھیل رہی ہو اور اس کے
بالمعاصی ثم یقدرون	اندر ایسے لوگ ہوں جو اس کی اصلاح کر سکتے
علی ان یغیروا ثم لایغیرون	ہوں لیکن وہ اصلاح نہ کریں تو اس کے معنی یہ
الا ان یوشک ان یعمھم	ہیں کہ وہ وقت قریب آ لگا ہے جب
اللہ بعقاب	اللہ تعالیٰ ان سب کو کسی عذاب میں پکڑ لے

ایک حدیث جو ٹھیک ٹھیک قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر ہے اس حقیقت کو یوں واضح کر رہی ہے:

ان اللہ تعالیٰ لا یعذب	اللہ تعالیٰ تھوڑے سے بُرے لوگوں کے بُرے
العامۃ بعمل الخاصۃ	اعمال کی پاداش میں دوسروں کو اس وقت
حتی یروا المنکر بین	تک سزا نہیں دیتا جب تک یہ بات نہ پیدا
ظھرانیھم وھم قادرون	ہو جائے کہ وہ اپنے درمیان بُرائی کو پھیلتے

علی ان ینکروہ فلا ینکروا	ہوئے دیکھیں اور وہ اس کے خلاف آواز اٹھانے
فاذا فعلوا ذالک عذب	پر قادر بھی ہوں لیکن وہ آواز نہ اٹھائیں جب
اللہ العامۃ والخاصۃ	وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے بڑوں
	اور چھوٹوں سب کو سزا دے دیتا ہے۔

اس باب میں سب سے زیادہ اہم حدیث ذیل کی حدیث ہے جو نہایت واضح طور پر کھول دیتی ہے کہ اگر کسی قوم کے اہل علم احتساب کے فرض سے غافل ہو جاتے ہیں یا محض منافقانہ قسم کے احتساب پر قانع ہو جاتے ہیں تو کس طرح اللہ تعالیٰ ان کو علم و ایمان کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔

لما وقعت بنو اسرائیل فی	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بنی
المعاصی نھتھم علماءھم	اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہونے لگے تو ان کے
فلم تنتھوا فجالسوھم فی	علماء نے شروع شروع میں ان کو روکا لیکن جب
مجالسھم واکلوھم و	وہ باز نہ آئے تو بالآخر انہوں نے ان کے ساتھ
شاربوھم فضرب اللہ	اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ
قلوب بعضھم ببعض	نے ان میں سے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی
فلعنھم علیٰ لسان داؤد و	دوسروں کے دلوں پر تھوپ دی اور حضرت
عیسی ابن مریم۔	داؤدؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے
	ان پر لعنت کر دی گئی۔

بدعت

علم حقیقی کو برباد کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز بدعت بھی ہے۔ بدعت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے دین میں نہیں ہے اور نہ اس کے مزاج سے کوئی مناسبت ہی رکھتی ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ شریعت میں اصل و اساس کی حیثیت صرف اس چیز کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریق پر ثابت ہے اس کے بعد اگر کسی چیز کو شریعت کے اندر سمجھا جا سکتا ہے تو اس چیز کو سمجھا جا سکتا ہے جو مذکورہ اساسات سے مستنبط ہوئی یا کم از کم ان کے اشارات

سے سمجھی جاتی ہو۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز دین میں لا داخل کرنا جو نہ دین کے کسی اصول سے نکلتی ہو اور نہ اس کے مجموعی نظام ہی سے کوئی جوڑ رکھتی ہو، بدعت ہے، بالخصوص جس چیز کے بارہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنّت موجود ہو اس میں محض اپنے ذوق اور اپنی ایجاد سے کوئی اضافہ کرنا یا اس سنّت کا بدل پیدا کرنا بدعت کی نہایت ہی مکروہ قسم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی تمام دینی ایجادات کے بارہ میں یہ جامع حکم دیا ہے؛

من احدث فی امرنا هٰذا ما	جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز لا
لیس منه فهو رد۔	داخل کی جو اس سے جوڑ نہیں رکھتی تو ایسی شئے
(متفق علیہ)	مردود ہے۔

بعض احادیث میں آپ نے بدعت کی تردید فرماتے ہوئے علمِ دین کے بنیادی ماخذوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان سے ہٹ کر کوئی چیز دین میں پیدا کرنے کی کوشش کرنا بدعت ہے۔ اگر کوئی چیز ان کے اشارات سے نکل رہی ہو یا ان کے حدود کے اندر داخل ہو یا وہ زندگی کے اس دائرہ سے تعلق رکھنے والی ہو، جس کو اسلام نے ہماری اپنی صواب دید پر چھوڑا ہے، تو وہ چیز بدعت نہیں کہلائے گی۔

اما بعد فان خیر الحدیث	آپ نے فرمایا بہترین بات اللہ کی کتاب ہے
کتاب الله وخیر الهدی هدی	اور بہترین طریقہ محمدؐ کا طریقہ ہے اور بدترین
محمد وشر الامور محدثاتها	چیزیں وہ ہیں جو ان کے اندر ان سے بے جوڑ
وکل بدعة ضلالة (مشکوٰۃ بحوالۂ مسلم)	نئی پیدا کی جائیں اور ہر ایسی بدعت گمراہی ہے۔

اس بدعت کی سب سے بُری قسم یہ ہے کہ کسی جاہلی فکر و فلسفہ، کسی غیر اسلامی طور طریقہ اور کسی کافرانہ رنگ ڈھنگ کو اسلام کے عقائد و ایمانیات یا اس کے نظامِ معیشت و معاشرت یا نظامِ تہذیب و تمدّن میں گھسانے کی کوشش کی جائے چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے؛

ابغض الناس الی الله ثلاثة	اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین شخص سب سے
ملحد فی الحرم ومبتغ	زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔ ایک وہ جو حرم کے

فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ومطلب دم امرء مسلم لیھریق دمہ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

اندر کسی بے دینی کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ جو اسلام کے اندر جاہلیت کے کسی طریقہ کو گھسانے کی کوشش کرے، تیسرا وہ جو کسی مسلمان کی جان کے درپے ہو تاکہ اس کا خون بہائے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ ہر بدعت جو ایجاد کی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی سنّت کو ضرور ڈھاتی ہے اور جب کوئی قوم سنّت کی جگہ بدعت کو پسند کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنّت کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلھا من السنۃ (مشکوٰۃ بحوالہ احمد)

جس قوم نے بھی کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند اس کے اندر سے سنّت اٹھا لی گئی۔

تحریف بدعت کے بالمقابل علمِ حقیقی کو تاراج کرنے والی دوسری چیز تحریف ہے۔ بدعت میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی نہیں ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے اور تحریف میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی ہے اپنے اغراض و خواہشات کے خلاف ہونے کے سبب سے اس کو دین سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ علمِ حقیقی پر یہ آفت متعدد شکلوں میں نازل ہوئی ہے۔

اس کی ایک عام اور معروف شکل تو یہ رہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی ایسی من مانی تاویلیں کی جائیں جو اس کلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ الفاظ، قواعدِ زبان، سیاق و سباق، نظائر و شواہد اور خود متکلم کے دوسرے اقوال و ارشادات چیخ چیخ کر اس تاویل سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہوں، لیکن محض اپنی خواہشاتِ نفس کی اتباع میں اس تاویل کو کلامِ الٰہی پر یا کلامِ رسول پر چپکنے کی کوشش کی جائے۔

اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ تاویل و تفسیر کے تکلف میں پڑنے کے بجائے سرے سے

اس چیز ہی کو بدل ڈالا جائے جو امرِ حق کی طرف راہنمائی کے لیے نشانِ راہ کا کام دے رہی ہو۔ نفی کو اثبات، شک کو یقین، زید کو بکر اور دن کو رات بنا کر اصل حقیقت کی اس طرح قلب ماہیت کر دی جائے کہ اس کو پہچاننا محال یا تقریباً محال ہو جائے۔

اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ لفظ یا فقرے کو قرأت اور طرزِ ادا کے تصرفات سے اس طرح بدل دیا جائے کہ وہ جس حقیقت کی طرف رہنمائی کے لیے وضع ہوا تھا اس سے ہٹ کر ایک بالکل ہی مختلف سمت میں مڑ جائے۔

تحریف کی مذکورہ بالا تینوں شکلوں کی طرف قرآن مجید نے یہود کے حالات بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ	الفاظ کو ان کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں۔ اور انہوں نے اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جس کے ذریعہ سے ان کی یاد دہانی کی گئی تھی اور تم جلد ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔

دوسری جگہ ہے:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ	اور یہودیوں میں سے وہ بھی ہیں جو کلمات کو ان کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور کہتے ہیں "سمعنا وعصینا" اور "اسمع غیر مسمع" اور "راعنا" اپنی زبانیں موڑ کر اور دین کی توہین کے لیے۔

یہود و نصاریٰ کے اندر تحریف کی یہ تینوں قسمیں پائی جاتی تھیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو علمِ حقیقی کی روشنی سے بالکل ہی محروم کر دیا۔ مسلمانوں کے اندر جو گمراہ فرقے اُٹھے وہ تحریف کی پہلی اور دوسری قسم پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب و سنت کی لفظی تحریف میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر خاص فضل ہے۔

کتمانِ حق

اسی سلسلہ کی ایک اہم چیز کتمانِ حق بھی ہے ۔ کتمانِ حق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک امر کو جانتے ہوئے اور اس کے اظہار کی ضرورت موجود ہوتے ہوئے کسی طمع یا خوف کے سبب سے اس کے اظہار سے گریز کیا جائے ۔

حق کی شہادت دینا اس امت کا حقیقی فرض منصبی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین اور اس کے آثار سے ہوئے علم کو صحابہ کو پہنچایا ۔ اسی طرح اس امت کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیں :

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	والی ایک امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ	سامنے حق کی گواہی دو ، اور رسولؐ تمہارے
شَهِيْدًا ۔	سامنے گواہی دے ۔

اسی فریضہ کی ادائیگی کا مطالبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے ان الفاظ میں فرمایا ہے :

بلّغوا عنّی ولو اٰیۃ	تم میری طرف سے لوگوں کو علمِ حق پہنچاؤ ، اگرچہ ایک آیت ہی سہی ۔

اسی حقیقت کی طرف حضورؐ نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے :

نضر اللہ عبدًا سمع مقالتی	اللہ تعالےٰ اس بندے کے چہرے کو تر و تازہ
فحفظها ووعاها وادّاها	رکھے جس نے میری بات سنی ، پھر اس کو یاد کیا اور محفوظ رکھا اور لوگوں کو پہنچایا ۔

اور جو لوگ علم رکھتے ہوئے اس کو چھپاتے ہیں ان کو حضورؐ نے یہ وعید سنائی ہے :

من سئل عن علم علمہ ثم	جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس
کتمہ الجم یوم القیٰمۃ	کو وہ جانتا ہے لیکن اس نے چھپائی تو اس کو
بلجام من نار	قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گا

اس فرض سے عموماً دو چیزیں مانع ہوتی ہے ایک طمع ، دوسری خوف ۔

آدمی ان لوگوں کے سامنے اظہارِ حق سے لازماً جھجکتا ہے جن سے اس نے کوئی طمع وابستہ کر رکھی ہو، ایسوں کے سامنے دین کی وہ باتیں تو کہی جاتی ہیں جو ان کو پسند ہوں۔ یا کم از کم ان کو ان سے اختلاف نہ ہو لیکن وہ باتیں کہنا جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہوں اور جن سے ان کی بداعمالیاں بے نقاب ہوتی ہوں، کم از کم اس شخص کے لیے ناممکن ہے جو ان سے اپنی کوئی دنیوی غرض رکھتا ہو۔ حضرت کعب احبار نے حضرت عمرؓ کے ایک سوال کے جواب میں اسی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے :

ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعبؓ سے
قال لکعب من ارباب العلم قال	پوچھا کہ اہل علم کون لوگ ہیں ؟ انھوں نے جواب
الذین یعملون بما یعلمون قال	دیا : کہ جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں ، انھوں نے
فما اخرج العلم من قلوب العلماء	پھر پوچھا کہ علم کو علمائے کے سینوں سے نکالا کس
قال الطمع ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ دارمی)	چیز نے ؟ انھوں نے جواب دیا : لالچ نے

یہی صاحبِ طمع اور خوشامدی گروہ ہے جس نے اپنے اغراض کے لیے اربابِ اقتدار کی ہر بے راہ روی اور گمراہی کو دین ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح وہ خود بھی ذلیل ہوا اور اُس نے دین کو بھی ذلیل کیا۔ انھی لوگوں کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے :

قال لو ان اھل العلم صانوا	فرمایا کہ اگر اہلِ علم اپنے علم کی قدر کرتے اور
العلم و وضعوا عند اھلہ	اس کو اس کے حق داروں کے سامنے پیش
لساروا بہ اھل زمانھم	کرتے تو اس کے ذریعے سے وہ اپنے
ولکنھم بذلوہ اھل الدنیا	زمانے کے لوگوں پر سرداری کرتے، لیکن
لینالوا بہ اھل الدنیا فھانوا	انھوں نے دنیا داروں سے صلہ حاصل کرنے
علیھم	کے لیے اس علم کو ان کی مقصد برآریوں کے
	لیے استعمال کیا ، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نگاہوں
	میں ذلیل ہو کے رہ گئے ۔

اسی قسم کے اقتدار پرست اور دین فروش گروہ کا ذکر حضورؐ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے :

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ
علیہ وسلم ان اناسًا من	میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو فقہ اور
امتی سیتفقہون فی الدین	تفسیر کا علم حاصل کریں گے پھر وہ کہیں گے کہ اس
ویقرءون القرآن یقولون	میں کیا برائی ہے کہ ہم اربابِ اقتدار سے مل
نأتی الامراء فنصیب من	کے ان کی دنیا سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے
دنیاھم و نعتزلھم بدیننا	دین کو ان سے بچائے رکھیں۔ حالاں کہ یہ ممکن
ولا یکون ذلک کما لا یجتنی	نہیں ہے جس طرح ببول کے درخت سے
من القتاد الا الشوک۔	کانٹے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا،
کذلک لا یجتنی من قربھم	اسی طرح اربابِ اقتدار کے دربار کا خیال
(مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)	ہے) گنہ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی قسم کے خوشامدی اور اربابِ اقتدار کی عبادت کرنے والے دین فروشوں کے متعلق حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ اللہ کے سب سے زیادہ مبغوض ہیں اور جب اس قسم کے لوگ پیدا ہونے لگیں گے تو دین کی ساری حقیقت مٹ جائے گی۔ صرف کچھ رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں گے حضورؐ کا ارشاد ہے :

ان من ابغض القراء الی اللہ	خدا کے نزدیک سب سے زیادہ بُرے
تعالیٰ الذین یزورون الامراء	وہ مدعیانِ علمِ قرآن ہیں جو اربابِ اقتدار
یوشک ان یاتی علی الناس	کے تقرب کے طلب گار ہیں قریب ہے
زمان لا یبقی من القرآن	کہ وہ زمانہ آئے گا کہ اسلام میں سے صرف
الا رسمہ۔	اس کا نام باقی رہ جائے اور قرآن میں سے
(مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)	صرف اس کے الفاظ۔

دوسری چیز جو اظہارِ کلمۂ حق سے مانع ہوتی ہے وہ خوف ہے۔ یہ خوف مختلف چیزوں کا ہوتا ہے کبھی اس امارت وسیادت کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو آدمی کو حاصل ہوتی ہے کبھی عوام کی برہمی اور خفگی کا اندیشہ ہوتا ہے، کبھی اربابِ اقتدار کے غصہ وغضب اور اس کے لازمی

نتیجہ کے طور پر کسی آزمائش کے پیش آجانے کا خوف ہوتا ہے۔ اس خوف کو قرآن نے متعدد مقامات پر بڑی وضاحت کے ساتھ منافقین کی صفات میں سے گنایا ہے اور اچھے مسلمانوں کی تعریف اس کے مقابل میں یہ بیان کی ہے:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ	پس عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ	سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت
عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى	کریں گے جو مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں
الْكٰفِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ	کے لیے سخت ہوں گے جو اللہ کے راستے
اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔	میں جدوجہد کریں گے اور کسی مذمت کرنے
(مائدہ: ۵۴)	والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔

اسی حقیقت کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

لا یمنعن احد منکم ھیبۃ	تم میں سے کسی کے لیے انسانوں کا رعب
الناس ان یقول بحق اذا	اس بات سے مانع نہ ہو کہ وہ حق کا اظہار
علمہ	نہ کرے جب کہ وہ اس کو جانتا ہو۔

اسی چیز کو اس مشہور حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔

افضل الجھاد کلمۃ حق	سب سے زیادہ مبارک جہاد کسی حق سے منحرف
عند سلطان جائر۔	صاحب اقتدار کے سامنے کلمۂ حق کا
	کہنا ہے۔

اگر قوم کے اندر اظہارِ حق کا یہ جوہر باقی نہ رہے اور مداہنت اور کتمانِ حق کی بیماری پھیل جائے تو پھر اس کی سزا اس قوم کو یہ ملتی ہے کہ اس کے اندر سے علمِ حق غائب ہو جاتا ہے۔ پچھلی امتوں میں سے یہود و نصاریٰ اس کی نہایت عبرت انگیز مثال موجود ہیں۔

اشتغال بالادنیٰ علمِ حقیقی کی نعمت سے محروم کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ دوسرے حقیر علوم کو اس علم پر ترجیح دی جائے اور آہستہ آہستہ یہ بد مذاقی اس قدر بڑھ جائے کہ پھر طبیعت کے اندر اعلیٰ اور حقیقی علم کے لیے سرے

سے کوئی رغبت ہی باقی نہ رہ جائے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے پڑھنے پڑھانے سے دنیوی منفعتیں اور عزتیں حاصل ہو سکتی ہیں یا جن چیزوں کا علم وقت کی سوسائٹی میں شہرت اور حصولِ مقاصد کا ذریعہ بن سکتا ہے یا جن چیزوں کا مطالعہ لذت اور بے فکری کے ساتھ اوقات گزاری کا سامان فراہم کر سکتا ہے، طبیعتیں انہی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور یہ میلان اس قدر غالب اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جو یا تو نرے قدامت پرست ہوں یا زمانہ کے رجحاناتِ عام بلکہ اس کی وبائے عام سے لڑ کر جینے کا دم داعیہ رکھتے ہوں اور کوئی بھی اس بات کی ہمت نہیں کر سکتا کہ اپنا اور اپنی اولاد کا وقت ان چیزوں کے سیکھنے سکھانے پر ضائع کرے جو حقیقت کے نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی قدر و قیمت کی حامل ہوں لیکن وقت کے بازار میں ان کی کوئی مانگ نہ ہو۔

پچھلی ملتوں میں سے یہودیوں کے متعلق صاف قرآن بیان ہوا ہے کہ جب ان کے اندر کلدانیوں کے علوم، سحر و ساحری اور صوفیانہ قسم کے علوم مثلاً علم خواص کلمات اور عملیات حب و بغض اور تسخیر جنات و شیاطین کا زور ہوا تو ان میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب پیٹھ پیچھے پھینک دی، اس کے سیکھنے سکھانے کے لیے ان کے اندر سرے سے کوئی میلان باقی ہی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ	اور جب ان کے پاس ایک رسول آیا اللہ
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ	کی طرف سے سچ ثابت کرنے والا ان
نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ	پیشین گوئیوں کو جو ان کے پاس موجود تھیں
اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ	تو ان لوگوں کے اندر سے جن کو کتاب ملی
وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ	تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّبَعُوْا مَا	پشت ڈال دیا، گویا وہ اس سے واقف
تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ	ہی نہیں اور پیچھے پڑ گئے، ان چیزوں کے
سُلَيْمٰنَ ۚ	جو شیاطین سلیمان کے زمانہ میں پڑھتے پڑھاتے
(بقرہ: ۱۰۲)	تھے۔

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا :

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا	پس ان سے سیکھتے تھے وہ علم جس کے
يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ	ذریعہ سے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان
زَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ	جدائی کرا سکیں حالاں کہ اس کے ذریعہ سے
بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ	وہ خدا کے حکم کے بغیر کسی کو نقصان نہیں
اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا	پہنچا سکتے تھے اور وہ سیکھتے تھے وہ علم
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ۔	جو ان کو نقصان پہنچاتا تھا۔ نفع نہ پہنچاتا
(بقرہ: ۱۰۲)	تھا۔

یہی صورت مسلمانوں کے اندر اس وقت پیش آئی جب یونانی علوم کا فتنہ پھیلا۔ عباسیوں کے زمانہ میں جب منطق و فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور مسلمانوں نے ان کا پڑھنا پڑھانا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہوگیا کہ بہتر سے بہتر دینی حلقوں میں بھی قرآن اور حدیث کا علم محض برائے تبرک رہ گیا۔ یہ چیزیں وقت کی سوسائٹی کے دل و دماغ پہ اس قدر چھا گئیں کہ وہ شخص پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جو ان چیزوں کے اندر کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔ اوّل تو لوگوں میں دین کو پیش کرنے کا ولولہ ہی سرد پڑ گیا لیکن اگر کچھ باقی رہا بھی تو اس کی جرأت بہت کم لوگ کر سکتے تھے کہ دین کو براہِ راست کتاب و سنت کے واسطہ سے پیش کریں بلکہ وہ مجبور ہوئے کہ انہی بولیوں اور انہی اصطلاحات میں بات کریں جو منطق و فلسفہ کے رعب داب نے زبانوں پہ چڑھا دی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے پیش کرنے کا اصلی ذریعہ علم کلام بن گیا جس کو مذہب کی بگڑی ہوئی شکل کہنا تو اس کی عزت افزائی ہوگی البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلسفہ اور منطق اور یونانی علم مناظرہ کی ایک مسخ شدہ شکل ہے۔

اسی طرح اربابِ تصوف نے اشراقیت اور ویدانت سے جو اثر قبول کیا تو اس راہ سے بہت سے فتنے ایسے گھس آئے جو علمِ حقیقی کی راہنمائی سے محروم کرنے والے ثابت ہوئے اور بعد کے زمانوں میں تو ان لوگوں کا بیشتر اعتماد صرف گنڈوں، تعویذوں اور تسخیر و تاثیر کے عملیات پر رہ گیا۔ جس نے ان چیزوں میں کچھ دخل حاصل کر لیا اس کا کاروبار چل گیا اور جو اس میں پیچھے رہ گئے

وہ بالکل ہی ناکام ثابت ہوئے۔ بہت ہی تھوڑے سے لوگ ایسے نکلے جو اس روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی جرأت کر سکے۔

اب اس دورِ آخر میں اس فتنہ کا جو حال ہے اس کا اندازہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کر سکتا ہے کہ ہر علم ، علم ہے ، ہر چیز کے پڑھنے پڑھانے والوں سے مدرسے اور کالج بھرے ہوئے ہیں ، یہاں تک کہ گندے سے گندے رسالے اور ناپاک سے ناپاک افسانے بھی لاکھوں کی تعداد میں اس ملک کے اندر چھپتے اور بکتے ہیں اور لوگ ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کے پڑھنے پڑھانے والے مفقود ہیں تو یہ وہ علم ہے جس کو اللہ اور رسول ؐ کا علم کہا جاتا ہے۔

یَارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۔

بیماریوں کا علاج

استغالِ بالادنیٰ کے اسباب اور اس کا علاج

پچھلی دو فصلوں میں ہم نے ان بیماریوں کی نشان دہی کی ہے جو علم و معرفت کے لیے مہلک ہیں۔ یہ بیماریاں یوں تو بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن ہم نے صرف دس ایسی بیماریوں کا پتہ دیا ہے جو جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن میں سے ایک ایک کے اندر سے صدہا روحانی و اخلاقی بیماریوں کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ ان میں سے چار بیماریاں تو جیسا کہ ہم نے بتایا ہے ایسی ہیں جو اگر کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کے اندر حق طلبی اور حق شناسی کا داعیہ ہی سرے سے مردہ ہو جاتا ہے، وہ اپنے حالات پر ایسا قانع، اپنے علم پر ایسا مطمئن اور اپنے ماحول میں ایسا مست یا غافل ہوتا ہے کہ نہ تو خود اس کے اندر سے کسی قسم کی طلب یا پیاس اُبھرتی ہے اور نہ کسی کے توجہ دلانے ہی پر اس کے اندر کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے بلکہ بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر اس کا کوئی ہمدرد و خیر خواہ اس کی بے حسی یا بے راہ روی پر اس کو ٹوک دے تو وہ اس کی اس ہمدردی کی قدر کرنے کے بجائے اُلٹا اس کے سر ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کو کیوں ٹوکا؛ وہ اپنے آپ کو مریض سمجھنے میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے؛ اس کو اس تصور سے بھی غصہ آتا ہے کہ کوئی شخص خود اس کے اندر بھی کسی مرض کی نشان دہی کر سکتا ہے یا اس کا علاج

کرسکتا ہے، وہ اپنے آپ کو نہ صرف تندرست و توانا خیال کرتا ہے بلکہ بعض حالات میں وہ دوسروں کا معالج اور طبیب بھی بنا بیٹھا ہوتا ہے، پھر وہ کس طرح گوارا کرے کہ دوسرے آکر اس کے پندارِ حذاقت کو مجروح کریں اور وہ ان کے مشورے قبول کر کے دوسروں کی نظروں سے اپنے آپ کو گرائے اور اپنی جمی جمائی دکان ختم کرے۔

اسی طرح ہم نے بتایا ہے کہ ان میں سے چھ بیماریاں ایسی ہیں جو اگر کسی صاحبِ علم و معرفت کو لگ جائیں تو اس کی تمام حاصل کردہ دولتِ معرفت برباد ہو جایا کرتی ہے۔ علم و ایمان کا جو ذخیرہ اس نے جمع کیا ہوا ہوتا ہے وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ تربیتِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے جو مراحل وہ طے کر چکا ہوتا ہے وہ سارے کے سارے ناطے کردہ بن کے رہ جاتے ہیں، وہ جہاں سے اس راہ میں چلا ہوتا ہے وہیں پھر پلٹ جاتا ہے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی پیچھے پھینک دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے لیے توفیقِ خیر کے دروازے ہی بند ہو جاتے ہیں اور وہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کے بقول نہ صرف اُتنے ہی سے محروم کر دیا جاتا ہے جو اسے بخشا گیا تھا بلکہ وہ بھی اس سے چھین لیا جاتا ہے جو اس کے اپنے پاس موجود ہوتا ہے۔

ہماری جسمانی بیماریوں میں جو اہمیت دق اور سل، کوڑھ اور جذام وغیرہ کو حاصل ہے اس سے زیادہ اہمیت ہماری روحانی و اخلاقی بیماریوں میں ان امراض کو حاصل ہے۔ اس وجہ سے ہم صرف ان کے بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے بلکہ اپنے علم کی حد تک کتاب و سنت کی روشنی میں ان میں سے چند اہم بیماریوں کے اسباب اور ان کے ازالہ کی تدابیر پر بھی گفتگو کرنا چاہتے ہیں[1]

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے اسباب

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ اور شریف

[1] ہم نے صرف چند ہی بیماریوں کے اسباب اور ان کے علاج پر گفتگو کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی بیماریاں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ دوسری بیماریوں پر جو اجمالی بحث ہم نے پچھلی دو فصلوں میں کی ہے وہ ان کے اسباب وعلاج پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔

کو نظر انداز کر کے کسی حقیر و رذیل کام کو انسان بس یونہی نہیں اختیار کر لیتا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے پست اور رذیل نہیں بنایا گیا ہے کہ خواہ مخواہ پستیوں ہی کی طرف جھکے اور گھٹیا باتوں ہی کو پسند کرے اپنی فطرت کے لحاظ سے تو وہ حق طلب، خیر پسند اور اعلیٰ اقدار کا قدردان پیدا کیا گیا ہے لیکن کچھ خاص اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بسا اوقات اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ اور خوب کو نظر انداز کر کے ناخوب کو اختیار کر لیتا ہے اور پھر اسی کے پیچھے اپنی بیش قیمت زندگی گنوا بیٹھتا ہے۔ ہم یہاں ان اسباب کا کھوج لگائیں گے، اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی اُن کے دور کرنے کی تدابیر کی طرف بھی اشارے کرتے جائیں گے۔

وقت کی قدر و قیمت سے بے خبری

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عموماً لوگ وقت کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے، انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ میں اصلی دولت وقت ہی ہے۔ جس نے وقت کو ضائع کر دیا اس نے سب کچھ ضائع کر دیا، قدرت نے انسان کے ہر لمحۂ زندگی کے ساتھ ایک اہم فرض باندھ رکھا ہے جس کی ادائیگی ہی میں اس کی زندگی کی ساری عظمتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی اس فرض کو پہچاننے یا ادا کرنے میں کوتاہی کر جائے جو اُس لمحہ کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر اس فرض کا وقت زندگی میں کبھی بھی نہیں آتا کیوں کہ اس کے بعد اس کو زندگی کے جو لمحات بھی میسر ہوتے ہیں وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں ساتھ لاتے ہیں، اس وجہ سے جو فرض رہ گیا وہ گویا ہمیشہ کے لیے رہ گیا۔ اگر اس کو اس کے اصلی وقت کے بعد پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسی کے مساوی یا اس سے بھی زیادہ بھاری دوسرے کسی فرض کو اس کی خاطر نظر انداز کیا جائے جس نے یہ کہا ہے کہ:

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دُور شُد

اس نے محض ایک شاعرانہ خیال ہی نہیں ظاہر کیا ہے بلکہ زندگی کی ایک نہایت اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

وقت ایک گراں مایہ دولت ہے اور اس دولت کی فطرت یہ ہے کہ یہ رکھ چھوڑنے

کی چیز نہیں ہے۔ یہ برف کے تودے کی طرح ہر وقت پگھلتی رہتی ہے۔ اگر انسان اس سے پوری مستعدی کے ساتھ فائدہ نہ اٹھائے تو یہ بہت جلد پانی کی روانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے اور انسان اپنی غفلت اور بدبختی پر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ پھر اس کی یہ بھی فطرت ہے کہ یہ ایک شمشیرِ دو دم ہے جس کی کاٹ دو طرفہ ہے اگر آپ اس کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ آپ کے خلاف استعمال ہوا اگر اس کے ایک ایک لمحہ کے بدلہ میں آپ نے اجر نہیں کمایا تو صرف یہی خسارہ نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے سرمایہ سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کا اصلی دردانگیز پہلو یہ ہے کہ ضائع شدہ زندگی کا ایک ایک پل آپ کے لیے وبال بنا۔ یہ رائیگاں جانے والی زندگی صرف رائیگاں ہی نہیں جاتی بلکہ انسان پر ایک ابدی لعنت بن کر مسلط ہو جاتی ہے۔

سورہ والعصر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ سورہ وہ سورہ ہے جس کی نسبت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر قرآن میں سے اور کچھ نہ اترتا، صرف یہی سورہ اُترتی تو ہمارے لیے کافی تھی۔ فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ	زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے
خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ	مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا	عملِ صالح کیے اور ایک دوسرے کو حق اور
بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝	ثابت قدمی کی نصیحت کرتے رہے۔

یہ سورہ جہاں اُوپر کے حقائق کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہیں ایک اور باریک نکتہ کی طرف بھی اس سے راہنمائی مل رہی ہے وہ یہ کہ انسان کے اس خسارہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقت اور اس کے مصرف دونوں کی قیمتوں میں موازنہ نہیں کرتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اشرفیاں تو لٹاتا ہے اور کوڑیوں پر مہر کرتا ہے۔ جواہرات دیتا ہے اور سنگ ریزے خریدتا ہے، کانٹوں کو چنتا ہے اور پھولوں کو پھینکتا ہے۔

اگر ایک انسان کے پاس ایک ہی روٹی ہو اور خود اس کو اور اس کے بچوں کو فاقہ درپیش ہو تو بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈال دینے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔ اگر ایک مسافر کے پاس پانی کی ایک ہی چھاگل ہو اور اس کو صحرا کا سفر درپیش ہو تو وہ اس پانی کو پاؤں دھونے پر کبھی ضائع نہیں

کرے گا بلکہ اس کا ایک۔ ایک قطرہ اپنی زندگی بچانے کے لیے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا اگر کسی کے ترکش میں ایک ہی تیر ہو اور راستے میں اسے شیر یا بھیڑیے سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ یہ حماقت کبھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس ایک ہی تیر کو گیدڑوں اور لومڑیوں کے شکار پر ضائع کر دے، بلکہ وہ اس کو اصل خطرہ کی مدافعت کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا لیکن حیرت ہے کہ وہی انسان جو اپنی ایک روٹی، اپنے ایک چھاگل پانی اور اپنے ترکش کے ایک تیر کے مصرف کو متعین کرنے میں اتنا محتاط ہے جب اس کے سامنے خود اپنی زندگی جیسی بیش قیمت چیز کے مصرف کے متعین کرنے کا سوال آتا ہے تو وہ بالکل ہی نادان بن جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ ہمارے حصے میں ایک ہی زندگی آئی ہے کئی زندگیاں نہیں آئی ہیں۔ اسی زندگی کے بدلے میں ہم یا تو ابدی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں یا ابدی خسران، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ابدی کامیابی حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں، یہ چیز محض خواہش کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لیے انسان کو قدم قدم پر مہمات سر کرنی پڑتی ہیں اور زندگی کے ہر موڑ پر معرکے جیتنے ہوتے ہیں۔ بغیر ان معرکوں کے جیتے اور ان مہمات کو سر کیے انسان ابدی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس واضح حقیقت کے باوجود دنیا میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو اپنی زندگیاں نہایت حقیر مقاصد پر ضائع کرتے ہیں، اس کی وجہ جیسا کہ بیان ہوئی یہی ہے کہ انہیں اس زندگی اور اس مدت حیات کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہیں ہے جو ان کے حصہ میں آئی ہے۔ نہ وہ اس کی سیال فطرت سے واقف ہیں، نہ اس کی دو طرفہ کاٹ کو جانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ یہ خود تو اگرچہ عارضی اور فانی ہے لیکن وہ ایک ابدی اور لازوال زندگی کی قیمت بن سکتی ہے بشرطیکہ انسان اس کو حقیر مشغلوں میں ضائع کرنے کے بجائے اسی مصرف میں صرف کرے جس پر اس کو صرف ہونا چاہیے۔

اپنے مرتبہ سے بے خبری

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی طرف مائل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے اس درجہ اور مرتبہ سے غافل ہو جاتا ہے جو قدرت نے اس کو بخشا ہے۔ انسان اس تمام کائنات کی تخلیق کا مقصد اور موضوع ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں اس کے لیے بنائی گئی ہیں لیکن وہ ان چیزوں میں سے کسی کے لیے

بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی ہے لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا۔ وہ ہر چیز کو استعمال کرتا ہے اور کر سکتا ہے لیکن اس دنیا میں کسی کا بھی یہ درجہ اور مرتبہ نہیں ہے کہ خود اس کو استعمال کر سکے۔ سب کے لیے فنا ہے لیکن انسان فنا ہو کر بھی باقی رہنے والا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اور قابلیتیں غیر محدود ہیں اور اس کے درجہ کی بلندی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اگر اس کو اپنی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کر سکے تو دوسری مخلوقات تو درکنار فرشتے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہ زمین میں خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے اور خدا کے سوا کوئی بھی اس سے بڑا نہیں ہے یہ مرتبہ ایک ایسا اونچا مرتبہ ہے کہ اس سے زیادہ اونچے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

خدا نے اس مرتبہ کا انسان کے اندر شعور بھی ودیعت کیا ہے اور اس مرتبہ کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے اس کو قوتیں اور قابلیتیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ اگرچہ اپنے اس شعور کو زندہ رکھنا یا نہ رکھنا اور ان قوتوں اور قابلیتوں کو استعمال کرنا یا نہ کرنا خود اس کی اپنی آزادی رائے اور اپنی پسند یا ناپسند پر منحصر ہے اور یہ اختیار و آزادی بھی غور کیجیے تو اس کے عزت و شرف ہی کا ایک پہلو ہے کیونکہ خدا نے اپنی مخلوقات میں سے انسان ہی کو اس شرف سے نوازا ہے کہ وہ اپنی راہ اور منزل خود انتخاب کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس انتخاب میں اپنے منصب اور مرتبہ کا لحاظ رکھتا ہے تو جس فطرتِ شاہینی کے ساتھ خدا نے اس کو پیدا کیا ہے وہ ظہور میں آتی ہے لیکن اگر وہ اپنے مرتبہ اور مقام کو بھول جائے تو پھر وہ شاہین ہو کر کنجشک فرومایہ اور شیر ہو کر گربۂ مسکین کی فطرت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف سورۂ والتین میں اشارہ فرمایا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔	ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو اسفل السافلین کی طرف لوٹا دیا۔ مگر وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جنہوں نے ایمان اور عملِ صالح کی راہ اختیار کی۔
(سورہ والتین)	

اس احساسِ شرف سے محروم ہو جانے کے بعد انسان جس طرح گرتا ہے اور اپنے آپ کو اپنی حقیر و رذیل خواہشوں کے جس طرح حوالہ کر دیتا ہے اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ جس درجہ ذلیل و خوار ہوتا ہے، اس کی پوری تصویر قرآن مجید نے اعراف کی اس آیت میں کھینچ کے رکھ دی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ آتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۔

ان لوگوں کو اس شخص کی سرگذشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتوں سے نوازا تو اس نے یہ خلعت اتار پھینکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان اس کے در پے ہو گیا اور وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعے سے اٹھاتے لیکن وہ پستی ہی کی طرف مائل اور اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے پڑا رہا تو اس کی مثال کتے کی ہو گئی کہ اگر اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور اگر اس کے حال پر چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے ہی رہتا ہے۔

پست ہمتی و بے صبری

اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جتنے کام بھی اعلیٰ و اشرف ہیں وہ مشقت طلب، صبر آزما اور عموماً کڑوے کسیلے ہیں ان کو انجام دینے کے لیے انسان کو ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ برعکس اس کے گھٹیا قسم کے جو کام ہوتے ہیں وہ نہایت سہل، بے مشقت اور نفسانی تقاضوں کو فوری تسکین بہم پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے انسان کو کوئی چڑھائی چڑھنے کی بجائے صرف نیچے کی طرف ڈھلک جانا ہوتا ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ نماز اور تلاوت کے مقابلہ میں گپ شپ کرنا، مطالعہ کرنے کے بجائے سو رہنا، فلسفہ پڑھنے کے بجائے ناول اور افسانے پڑھنا، ضبطِ نفس اور تربیت و تزکیہ کا درد سر مول لینے کے بجائے اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس

کی زد پر چھوڑ دینا، عام آدمیوں کے لیے نہایت سہل اور لذیذ کام ہیں۔ میدان میں ڈٹ کر لڑنے کے بجائے اگر فرار اختیار کرنا ہو اور موجوں اور بادِ مخالف سے نبرد آزمائی کی جگہ، کشتی کو موجوں ہی کے حوالے کر دینا ہو تو آخر اس کے لیے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دینے کے سوا اور کس سلیقہ یا محنت کی ضرورت ہے؟ اعلیٰ کاموں کے مقابل میں ادنیٰ کاموں کی یہی فطرت ہے جو ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے جو اپنے اندر ہمت اور اولوالعزمی نہیں رکھتے اور جو محنت و مشقت کے بجائے کاہلی اور سہل پسندی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کے اسی فرق کو ایک حدیث نبویؐ میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے کہ حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کمال کی منزل مشکلات و مصائب سے گھری ہوئی ہے اور اہلِ خسران کی منزل خواہشاتِ نفس سے گھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص جنت حاصل کرنا چاہے تو اس کو بے شمار مشکلات و مصائب سے لڑنا اور ان پر غالب آنا پڑے گا برعکس اس کے اگر کوئی شخص دوزخ میں گرنا چاہے تو اس کا معاملہ نہایت سہل ہے وہ کسی مزاحمت کا مقابلہ کیے بغیر اپنی خواہشات کے سبز باغوں میں پھرتا پھراتا وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کے مزاج کا یہی اختلاف ہے جس کے سبب سے انسان نیکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے کیونکہ اس راہ میں اس کو گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور قدم قدم پہ اپنے نفس کی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن نے اس راہ کے سفر کو "اقتحامِ عقبہ" سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی گھاٹی کو پار کرنا فرمایا ہے:

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ	اور ہم نے اس کے لیے بدی اور نیکی دونوں کی راہیں کھول دیں تو اس نے گھاٹی کو پار نہیں کیا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ غلام کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا علاوہ ازیں ان لوگوں کے زمرہ میں سے بننا جو ایمان لائے اور جو ایک دوسرے کو صبر

تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۔ اور ہمدردی کی نصیحت کرتے رہے یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خوش نصیب ہوں گے۔

برعکس اس کے جو شخص بدی کے گڑھے میں گرنا چاہتا ہے وہ اپنی منزل بڑی تیزی سے طے کرتا ہے وہ بدی کا رُخ کرتے ہی خود بخود لڑھکتا ہوا اپنے پسند کردہ قعرِ ذلت کی گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کا اشارہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ میں "سافلین" کے لفظ سے نکل رہا ہے۔ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہشاتِ نفس کے پیرو کو اس کی خواہشات کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اخلاقی پستی کی آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔

اس موقع پر نفسِ انسانی کی اس خصوصیت کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے جس کی طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اشارہ فرمایا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو خلافت کی ذمہ داریاں سپرد کرتے وقت جو قیمتی نصیحتیں فرمائیں ان میں ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ اس بات کو یاد رکھنا کہ نفس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی اگر ایک ناجائز خواہش پوری کر دی جائے تو پھر وہ دوسری کے لیے ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے یعنی ایک کمزوری دوسری کے لیے اور ایک برائی دوسری برائی کے لیے خود راہ کھول دیتی ہے۔ اس وجہ سے بہتری اسی میں ہے کہ نفس کو اس جانب ڈھیل ہی نہ دی جائے ورنہ اگر ایک مرتبہ وہ اس راہ پر چل پڑا تو پھر اس کو اس سے موڑنا آسان نہیں رہے گا۔ ایک چراگاہ کے بعد دوسری چراگاہ اس کے سامنے آتی رہے گی اور وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہاں پہنچ جائے گا جہاں پہنچ کر واپس آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ادنیٰ پرستوں کی کثرت

اعلیٰ کے مقابل میں ادنیٰ کے ترجیح دینے کی ایک بڑی وجہ دنیا میں ادنیٰ پرستوں کی کثرت بھی ہے۔ آدمی اسی راہ پر چلنے میں سلامتی دیکھتا ہے جو قافلوں سے بھری ہوئی ہو۔ جس کام کو اکثریت کر رہی ہو اس کے کرنے کے لیے صرف یہی نہیں کہ دل میں تحریک پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ چیز اس کے ایک اعلیٰ اور عمدہ کام ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل بھی بن جاتی ہے۔ تاریخ کے جس دور میں جس چیز کا بھی زور ہوا ہے اس نے دنیائے عام کی طرح ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور متاثر کیا ہے اور اس تاثر میں اوّل تو اس کی واقعی قدر و قیمت

پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے اور اگر کچھ لوگوں نے غور بھی کیا تو بالآخر انہیں بھی وقت کی عام بدمذاقی کے آگے سپر ڈال دینی پڑی۔ بنی اسرائیل کے بگاڑ کی تاریخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ جب ان کے اندر خرابیاں پھیلنی شروع ہوئیں تو ابتدا میں ان کے علماء نے ان کو ان سے روکنا چاہا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وقت کے رجحان عام کے آگے ان کے لیے بند باندھنا مشکل ہے تو وہ خود بھی اسی رجحانِ عام کی رو میں بہنے کے لیے تیار ہو گئے جس کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے بگڑے ہوئے لوگوں کے دلوں کی سیاہی ان کے دلوں پر بھی تھوپ دی۔ خود ہماری اپنی تاریخ پر بھی غور کیجیے تو کچھ یہی صورتِ حال یہاں بھی نظر آئے گی۔ صدرِ اوّل کو چھوڑ کر جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اعلیٰ اقدار کا حقیقی احترام باقی رہا، بعد کے ادوار کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ جس دور میں جو چیز بھی ذہنوں اور دماغوں پر چھا گئی ہے اسی کا کلمہ سب پڑھنے لگے ہیں۔ جس دور میں شعر و ادب کا زور ہوا سب اسی رنگ میں مست نظر آنے لگے، جب یونانی علوم کی گرم بازاری ہوئی تو ان علوم کے آگے سارے علوم ہیچ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے اعزاز و احترام میں کتاب و سنّت کی بساط بھی لپیٹ کر رکھ دی گئی۔ اسی طرح جب تصوف کا چرچا پھیلا تو کتاب و سنت کی تعبیریں بھی اسی کی روشنی میں کی جانے لگیں، گویا یہ اصل ہے اور کتاب و سنّت اس کی فرع ہیں۔ اب اس زمانہ کو دیکھیے تو مغربی علوم و فنون نے ہر شخص کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ کسی کو ہوش ہی نہیں کہ ان کے سوا کوئی اور علم بھی ہے جس کے سیکھنے سکھانے کی ضرورت ہے اور زندگی میں اس کی بھی کوئی قدر و قیمت ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی وہی ہے جس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے بغیر تو یہ سارے علوم و فنون انسانیت کے حقیقی فائدہ کے نقطۂ نظر سے مضر رساں زیادہ اور مفید بہت کم رہ جاتے ہیں لیکن ہماری تاریخ میں بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے اس ہمہ گیر فتنہ کے اندر اپنے ذہنی توازن کو قائم رکھا اور جو نہ تو زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اتنے عاجز اور بے بس ہوئے کہ وقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور نہ اتنے جامد ثابت ہوئے کہ سیلاب ان کے اوپر سے گزر جائے اور وہ اپنی جگہ ہی پتھر کی طرح پڑے رہ جائیں۔ درحقیقت یہی گنتی کے افراد ہیں جنہوں نے تمام طوفانوں اور تھپیڑوں کے اندر امت کے سفینہ کی ناخدائی کی ہے اور اس کو

غرق ہونے سے بچایا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آج ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوتا کہ ہماری تاریخ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پر جا کر ختم ہوئی، ہم صحرا میں ایک کھوئے ہوئے قافلہ کی مانند ہوتے جسے کچھ پتہ نہیں کہ کدھر سے آئے ہیں، اور کدھر جانا ہے۔

علاج اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے ان چاروں اسباب پر نگاہ ڈالیے تو ان کی تہ میں یا تو شعور کی کمی نظر آئے گی یا ہمت کی۔ جو لوگ وقت اور زندگی کی ناقدری کے سبب سے یہ روش اختیار کر لیتے ہیں ان کے اندر شعور اور بیداری کا فقدان ہے اور جو لوگ مشکلاتِ کار یا ہمہ گیر بگاڑ سے مرعوب ہو کر وبائے عام میں مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر عزم اور یقین ناپید ہے۔ شعور کو بیدار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ مفید چیز صالح لٹریچر کا مطالعہ اور ذی شعور لوگوں کی صحبت ہے، آدمی کو برابر ایسی چیزیں پڑھتے رہنا چاہیے جن میں زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو دل کو بیدار کرنے والی اور کانوں اور آنکھوں کو کھولنے والی ہیں جو عقل کو جلا دیتی اور روح کو گرماتی ہیں، جن سے ایمان کو غذا ملتی ہے اور اس عالمِ فانی کی جگہ عالمِ باقی کی محبت پیدا ہوتی ہے، جن کے اندر معرفت کا نور اور علم حقیقی کی روشنی ہے۔ ایسی چیزوں میں سب سے اونچا درجہ کتاب اللہ اور احادیثِ رسول ﷺ کا ہے۔ ان کے حرف حرف اور سطر سطر کے اندر خالص حقیقت اور بالکل بے آمیز علم ہے، ان کے بعد زبور، انجیل، امثالِ سلیمان اور صالحین و مصلحینِ امت کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں یا پھر ایسے حکیموں اور فلسفیوں کی چیزیں ہیں جنہوں نے فی الواقع زندگی کے مسائل پر غور کیا ہے اور اس کے حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے ان چیزوں کے اندر کچھ ملاوٹیں اور آمیزشیں بھی ہیں اور جگہ جگہ ان میں فکرِ انسانی کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن جو لوگ ان کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھتے ہیں وہ نہایت آسانی سے ان کے حق و باطل میں خود امتیاز کر لیتے ہیں۔

ہمت اور عزیمت پیدا کرنے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں سے اکثر تو ایسی ہیں جن کا تعلق عمل سے ہے اور ہم ان کی تفصیل آگے چل کر تزکیۂ عمل کے باب میں کریں گے یہاں جس بات کا بتانا مناسب اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک حقیقت، جیسی کچھ بھی وہ ہے، پہلے آدمی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینی چاہیے۔ ایک حقیقت کو ٹھیک ٹھیک

سمجھ لینا ان تیاریوں میں بہت معین ہوا کرتا ہے جو آدمی کو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کرنی پڑتی ہیں۔

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جتنی بھی اعلیٰ قدریں ہیں وہ فطرت کو محبوب ہوتے کے باوجود، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، مشقت طلب اور صبر آزما ہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ان کے چاہنے والے تو ہمیشہ زیادہ رہے ہیں لیکن عملاً ان کے اختیار کرنے والے ہمیشہ تھوڑے ہی نکلے، ان کی خوبیوں اور برکتوں کے گن تو بزدلوں اور پست ہمتوں نے بھی گائے لیکن ان کے حاصل کرنے کے لیے جن قربانیوں کی ضرورت تھی، ان کے پیش کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔ اس صورتِ حال کی وضاحت اس راہ کے داعیوں نے ہمیشہ خود ہی کر دی ہے تاکہ وہی لوگ اس میں قدم رکھیں جو اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اندر کچھ دم خم رکھتے ہوں۔ جو لوگ اس وادیٔ پر خار کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے بہتر ہے کہ وہ اس کا رخ ہی نہ کریں ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کا راستہ فراخ ہے اور اس کے چلنے والے بہت ہیں"۔

اسی حقیقت کو قرآن نے اپنے الفاظ میں اسی طرح بیان فرمایا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ	کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی جانچ نہیں ہوگی، حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو جانچا جو ان سے پہلے گزرے تو اللہ ضرور چھانٹے گا ان لوگوں کو جنہوں نے سچ کہا اور ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔
(عنکبوت : ۲-۳)	

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس دنیا میں اگرچہ

خبیث اور خباثت پسندوں کی اکثریت ہے اور یہ اکثریت کمزوروں اور پست ہمتوں کو خباثت پسندی پر اکساتی بھی ہے لیکن خدا کی میزان میں بہر حال وزن طیب ہی کا ہے اور فلاح پانے والے وہی ہوں گے جو خبیث کی اس کثرت سے مرعوب ہوں بلکہ طیب کو اختیار کریں، اگرچہ یہ خود بھی کم ہو اور اس کے لیے بازیاں کھیلنے والے بھی کم ہی ہوں۔

قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ	کہہ دو خدا کی میزان میں خبیث اور طیب
وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ	برابر نہیں ہوں گے، اگرچہ خبیث کی کثرت
فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ	تم کو کتنا ہی فریفتہ کیوں نہ کرے تو اللہ سے
(مائدہ: ۱۰۰)	ڈرتے رہو اے عقل رکھنے والو۔

ان تنبیہات کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص حقیقت کو، جیسی کچھ وہ ہے، اچھی طرح سمجھ لے، کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ ادنیٰ کے مقابل میں اعلیٰ کی طلب کوئی آسان بازی ہے جس کو ہر شخص کھیل سکتا ہے، اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ چاہنے کی چیز اگر کوئی ہے تو یہی ہے، کرنے کا کام کوئی ہے تو یہی ہے۔ کامیابی اور فلاح کی راہ ہے تو یہی ہے، انسان کے شرف و عزت کے مطابق اور اس کے مرتبہ اور درجہ کے شایانِ شان کوئی چیز ہے تو یہی ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ اس راہ کے خطرات کا مقابلہ کرنا اور اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونا ہر بوالہوس اور ہر مدعی کا کام نہیں ہے، اس میں کامیابی انہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو ایک عاشقِ صادق کا جنون اور ایک مردِ مجاہد کا عزم و حوصلہ رکھتے ہوں۔

اس صورتِ حال کو سمجھ لینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی جس کام کے لیے اٹھے اگر اس کے تقاضوں اور اس کے نتائج سے پوری طرح باخبر ہو اور اس کے لیے اپنے عزم و ارادہ کو اچھی طرح تول کے اٹھے تو مشکلات سے لڑنے اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت اس کے اندر بہت بڑھ جاتی ہے لیکن اگر اس طرح کے کسی معرکے کے لیے وہ بالکل بے خبرانہ اٹھ کھڑا ہو تو پہلی ہی چوٹ میں وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اگر ایک شخص شیر کے شکار کے ارادہ سے نکلے اور اس کو شیر سے سابقہ پیش آ جائے تو وہ خطرات میں اپنے حواس بجا رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص گیدڑ کے شکار

کے لیے نکلے اور اس کو سابقہ پیش آ جائے شیر سے تو وہ کس طرح اپنے اوسان قائم رکھ سکتا ہے؟

اس حقیقت نفس الامری سے کما حقہٗ واقفیت کے علاوہ دوسری چیز جو آدمی میں عزم و ہمت پیدا کرتی ہے وہ مردانِ حق کی معیت و رفاقت ہے۔ یہ معیت و رفاقت ذہنی طور پر بھی حاصل کی جاتی ہے اور عملی طور پر بھی۔ ذہنی طور پر اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی سیرتوں کا برابر مطالعہ کیا جاتا رہے جنہوں نے راہِ حق میں مصیبتیں جھیلی ہیں جنہوں نے اعلیٰ اقدار کی طلب میں دنیا کی جھوٹی عزتوں اور شہرتوں کو نہایت حقارت سے ٹھکرایا ہے، جو نیکی اور سچائی کی راہ پر چلنے کے لیے یکہ و تنہا اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنے عزم و حوصلہ سے انہوں نے دوسروں کے لیے اس راہ پر چلنا آسان کر دیا ہے، جنہوں نے جہل کی ظلمت میں علم کے دیے جلائے ہیں اور ان کو باد حوادث سے محفوظ رکھا ہے، جنہوں نے باطل کے غوغائے عام میں حق کا نعرۂ مستانہ بلند کیا اور پھر یا تو باطل کو مغلوب کر لیا ہے یا اس سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنا نقشِ قدم ایک نشانِ ہمت کی حیثیت سے یادگار چھوڑا ہے۔ ایسے لوگوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ آدمی کے اندر ہمت پیدا بھی کرتا ہے اور پیدا شدہ ہمت کو برقرار بھی رکھتا ہے۔

عملی طور پر اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو ایسے لوگوں کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو اس راہ میں اس کی راہ نمائی کر سکیں اور اگر راہنمائی نہ کر سکیں تو کم از کم رفاقت ہی کا حق ادا کر سکیں یہ دنیا جب تک قائم ہے اس میں جس طرح برے لوگ موجود رہیں گے، اسی طرح اچھے لوگ بھی موجود رہیں گے۔ اگر بروں کو لیڈر بھی مل جاتے ہیں اور ساتھی بھی میسر آ جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک خیر کے طالب کو ساتھی اور راہنما نہ مل سکیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی خلوص کے ساتھ تلاش کرے اور جب پا جائے تو ان کی معیت و رفاقت حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت دینے پر تیار ہو جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے لیے آدمی کو گھر بار اور ملک وطن بھی چھوڑنا پڑ جائے تو یہ بازی بھی وہ جی کڑا کر کے کھیل ہی ڈالے۔ یہ خدا کی راہ میں اس کی ہجرت ہو گی اور ہجرت کی راہ آدمی کے لیے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔ ہجرت کا اصلی مقصد ہمیشہ

یہی رہا ہے کہ ایک اعلیٰ نصب العین کی خاطر ایک ناسازگار ماحول کو چھوڑ کر ایک سازگار ماحول تلاش کیا جائے۔ یہ ماحول زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا اثر عامل ہے جس کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ماحول ناسازگار ہو تو بسا اوقات بڑی اعلیٰ صلاحیتیں بھی برباد ہو کے رہ جاتی ہیں اور اگر ماحول سازگار مل جائے تو معمولی صلاحیتیں بھی جلا پاکر ذرّہ سے آفتاب بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام تک کا یہ حال رہا ہے کہ انہوں نے اچھے ماحول، اور اچھے ساتھیوں کے لیے دعائیں کی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی بازیاں کھیل ہیں۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام اپنی عزیمت واستقامت کے اعتبار سے بجائے خود ایک عالم رہے ہیں، انہوں نے دُوسروں کو اپنی حرارت سے گرمی پہنچائی ہے، کبھی دُوسروں سے حرارت حاصل کرنے کے محتاج نہیں ہوئے اور اپنی ذات سے اپنے ماحول کو روشن کیا ہے، کبھی ماحول سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ان کو نہیں پیش آئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آدمی کی صلاحیت اگر قوی ہو تو بسا اوقات وہ تاریکی سے بھی روشنی حاصل کر لیتا ہے اور راہ کی ٹھوکروں سے بھی اس کو راہ نمائی مل جاتی ہے۔ علامہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ابراہیم نامی ایک چور کے لیے اکثر دعائے خیر فرماتے رہتے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ آپ ایک چور کے لیے دعائے خیر کیوں فرماتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میرے ابتلا کے زمانہ میں اس نے اپنے عمل نمونہ سے مجھے نہایت قیمتی درس دیا تھا۔ جب مجھے بیڑیوں میں جکڑ کر اونٹ پر سوار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو یہ شخص ایک جگہ راہ میں مجھے ملا اور اس نے مجھ سے کہا: ابن حنبل! چوری کے جرم میں مجھے اتنی بار قید وبند کی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں اور اتنے سو درّے میری پیٹھ پر برسے ہیں، تاہم میں اپنی اس حرکت سے باز نہیں آیا۔ اگر میں شیطان کی راہ میں یہ مصائب جھیل کر اس طرح استوار رہ سکتا ہوں تو حیف ہے اگر تم خدا کی راہ میں ان مصائب کو پامردی سے نہ برداشت کر سکو۔ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ اس کی اس جرأت وصلابت سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اسی طرح جو لوگ اپنے اندر اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں، ان سے یہ توقع بعید نہیں ہے کہ وہ ان جانبازیوں سے راہِ حق کے لیے درس حاصل کریں جو آج باطل کے علم بردار باطل کو سربلند کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں۔ لیکن ایسے غیر معمولی عزم وحوصلہ کے لوگ

زیادہ نہیں ہو سکتے، زیادہ لوگ تو ایسے ہی ہو سکتے ہیں، جن کو اچھے ساتھی ملیں تو اچھے بن سکتے ہیں، لیکن اگر بُرے ساتھی مل جائیں تو اندیشہ ہے کہ اُن کی برائیاں ان پر غالب آجائیں۔ اس وجہ سے انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ اپنی خوبیوں کو پروان چڑھانا چاہتے ہوں وہ سازگار ماحول اور اچھے ساتھیوں کی تلاش سے غافل نہ رہیں۔

آخری چیز جو اس مقصد کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے وہ بندے کا اللہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے اگر دل کا سفینہ اس لنگر کے ساتھ بندھا ہوا ہو تو خواہ کیسی ہی بادِ مخالف چلے اور کیسی ہی خطرناک موجیں اٹھیں لیکن کشتی ہچکولے کھا کر بھی سلامت رہتی ہے اور طوفانوں کے اندر سے گزرتی ہوئی ساحل مراد پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ راہنما غلطی کر سکتے ہیں اور رفقا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں، لیکن خدا کبھی ان لوگوں کو نہیں چھوڑتا جو بہر حال اور بہر صورت خدا کو پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ اس نے خود فرمایا ہے کہ جو لوگ میری راہ پر چلنا چاہتے ہیں اور اس راہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، میں ان کے لیے مشکلات کے اندر سے راہ پیدا کرتا ہوں۔

اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

اور اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو لوگ اس راہ کی مشکلات کے مقابل میں ثابت قدم رہنا چاہتے ہیں ان کو یہ چیز اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ میرے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط و استوار رکھیں اور میری یاد سے غافل کبھی نہ ہوں۔

وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

اور تم ثابت قدمی نہیں حاصل کر سکتے مگر اللہ کے تعلق سے۔

کتمانِ علم کے اسباب اور اس کا علاج

علم، خواہ ہمارے اپنے تجربات کا حاصل کردہ ہو یا خدا کا نازل کردہ، بندوں کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس امانت کا پہلا حق تو یہ ہے کہ ہر نسل اس کی پوری پوری حفاظت کرے، اس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھائے، اس کو اپنے امکان کی حد تک ترقی دے۔ اور دوسرا حق یہ ہے کہ پوری احتیاط و دیانت کے ساتھ اس کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کر دے۔ اسی دیانت دارانہ توریث و توارث پر اس دنیا کی تمام مادی و روحانی خوشحالیاں اور ترقیاں مبنی ہیں۔ اگر اس میں خلل اور فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا مادی اعتبار سے جو باغ و بہار نظر آ رہی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ پچھلی نسلوں نے جو تجربات جمع کیے تھے وہ ہم تک منتقل ہوتے رہے اور ہم نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا اور ان کو ترقی بھی دی۔ اگر یہ ہم تک منتقل نہ ہو پاتے یا ہم نے ان کو حاصل کرنے یا اُن کو ترقی دینے کا اہتمام نہ کیا ہوتا تو یہ دنیا آج ہے اس سے بہت پیچھے ہوتی۔

اسی طرح ضروری ہے کہ جو روحانی اور اخلاقی علوم اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں وہ بھی صحیح طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتے رہیں اگر ان کے منتقل ہوتے رہنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ روشنی کی جگہ تاریکی نے اور اسلام کی جگہ جاہلیت نے

اپنا تسلط جما لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امّت کو بھی اپنی شریعت کا علم دیا اس پر جہاں یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ اس پر اخلاص کے ساتھ عمل کرے، وہیں یہ ذمّہ داری بھی ڈالی کہ وہ اس کو پوری دیانت کے ساتھ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل بھی کرے۔ چنانچہ اہل کتاب کو جب اللہ تعالیٰ نے اس علم کی امانت سونپی تو ان سے یہ عہد لیا کہ:

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران: ۸۷)

تم اس کو لوگوں پر کھول کر واضح کروگے، اور اس کو چھپاؤگے نہیں۔

اسی طرح انہیں یہ حکم بھی دیا گیا:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو، حق کو چھپانے کے لیے درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔

یہود نے جب اس عہد اور اس تنبیہ کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے محض طمع دنیا میں خدا کے اس علم کو چھپایا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ۔ (بقرہ: ۱۵۹)

جو لوگ ان واضح آیات اور اس ہدایت کو چھپاتے ہیں جو ہم نے اتاری ہیں، بعد اس کے کہ ہم نے ان کو کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر دیا ہے، وہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ۔ (بقرہ: ۱۷۴)

جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت وصول کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا اور کچھ نہیں بھر رہے ہیں۔

اور ان سے یہ امانت چھین کر امتِ مسلمہ کے سپرد کی اور اس پر یہ ذمّہ داری ڈالی کہ جس طرح اللہ کے آخری رسول نے ان کو خدا کا یہ دین پہنچایا ہے اسی طرح یہ اس کو دوسروں تک پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ اس امت کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ: ۱۴۳)

چنانچہ ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی ایک امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسول تم پر اس دین کی گواہی دے۔

اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس علم پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں پر بھی قیامت تک اس کی شہادت دیتی رہے اور اگر اس میں کوئی کوتاہی کرے تو عنداللہ اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

اس ذمہ داری سے فرار اختیار کرنے یا اس میں کوتاہی کرنے کے بھی کچھ خاص اسباب ہیں جو ہم یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یہ اسباب بجائے خود ایسے ہیں کہ ان کے نگاہوں کے سامنے آجانے کے بعد توقع ہے کہ ہر شخص جس کے اندر ایمان کی کوئی رمق ہے وہ ان سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کے اسباب کا جان لینا ہی ان کے علاج کے لیے کافی ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی شخص صحت کا سچا طالب ہو۔

معاشرہ کی ذمہ داری سے بے خبری

اس کتمانِ علم کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ سرے سے معاشرہ کی اصلاح و درستگی سے متعلق اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتے ہی نہیں ان کے نزدیک آدمی پر جو کچھ بھی ذمہ داری ہے وہ صرف اس کے اپنے نفس کی ہے، اگر اس کو اس نے ٹھیک رکھنے کی کوشش کی ہے تو اس نے دین اور علمِ دین کا حق ادا کر دیا، اس بات سے اس کی دینداری میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ جس معاشرہ میں وہ رہ رہا ہے اس کا کیا حال ہے اور اس کو دین سے باخبر رکھنے میں اس نے کوئی حصہ لیا ہے یا نہیں، وہ اس کو ایک پرایا جھگڑا سمجھتے ہیں جس میں اپنی ٹانگ نہ پھنسانا ہی ان کے نزدیک تقویٰ ہے، بعض لوگوں کے اندر تو یہ تصور اس طرح جم جاتا ہے کہ وہ زندگی کا ایک بالکل ہی راہبانہ نقطۂ نظر اختیار کر لیتے ہیں اور معاشرہ کے بُرے اور بھلے سے ایک قلم کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اس حد تک تو معاشرہ سے بے تعلقی نہیں اختیار کرتے لیکن وہ بھی اس ذمہ داری کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو فی الواقع دین میں اس

کی ہے، ان کے نزدیک اگر یہ نیکی ہے تو ایک نفل نیکی ہے جس کے کرنے سے آدمی کے اجر و ثواب میں کچھ اضافہ تو ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ نہ کرے تو اس کو کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔ اس طرح کے کسی کام کو اگر وہ کرتے بھی ہیں تو اس کو وہ خود اپنے فرائض کا کوئی جزء نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کے فرائض کا ایک حصہ سمجھتے ہیں جس کو تبرعاً یہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ رائے رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ نہ تو کوئی شخص معاشرہ کی جہالت اور اس کے بگاڑ کا حقیقی دکھ محسوس کر سکتا اور نہ لوگوں کے ذہن و فکر اور ان کے اعمال و اخلاق کے بدلنے کے لیے کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز جدوجہد ہی کر سکتا ہے، اوّل تو وہ کچھ کرے گا ہی نہیں اور اگر کرے گا بھی تو اس کی نوعیت محض چھدا اتارنے کی ہو گی۔ وہ لوگوں کو ان کی حقیقی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور ان کے بگاڑ کے اصلی اسباب سے پردہ اٹھانے کے بجائے ہمیشہ کچھ اُوپری قسم کی لیس پوت کر کے اپنی مصلحیّت کی دھونس جمانا چاہے گا۔ ایسے شخص کے لیے یہ نہایت مشکل ہے کہ وہ لوگوں کی کسی ایسی بُرائی کو بُرائی کہنے کی جرأت کر سکے جس کو لوگ بھلائی بنائے ہوئے بیٹھے ہوں اور جس کو بُرائی کہنے سے وہ غضب ناک ہوتے ہوں، بالخصوص ان برائیوں کو برائی کہنا تو ایسے شخص کے لیے بالکل ہی محال ہے جن کے جواز کا فتویٰ وقت کے ارباب افتدار نے دے رکھا ہو، جن کو وہ عملاً اپنائے ہوئے ہوں۔ ایسے لوگ قرآن بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں، حدیث بھی سکھاتے ہیں اور فقہ و تصوف کے رموز بھی بتاتے ہیں اور یہ سب کچھ بظاہر وہ علم دین کی اشاعت ہی کے لیے کرتے ہیں لیکن یہ ساری چیزیں وہ اس طرح سکھاتے اور پڑھاتے ہیں گویا یہ ماضی بعید کی حکایتیں ہیں جن کا کوئی حرف بھی حال پر منطبق نہیں ہوتا۔

بہت سے لوگ جان بوجھ کر یہ روش اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے اختیار کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگ معاشرہ سے متعلق اپنی ذمہ داری کی حقیقی نوعیت سے آگاہ ہی نہیں ہیں۔ وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اسلام نے ہر شخص پر اصلاح کی دُہری ذمہ داری ڈالی ہے۔ ایک خود اس کی اپنی ذات سے متعلق ہے اور دوسری اپنے علم و استعداد کی حد تک، اپنے کنبہ، اپنے قبیلہ اور اپنے معاشرہ کی اصلاح سے متعلق ہے اور اس ذمہ داری کی اہمیّت اس قدر ہے کہ ایک شخص

خود اپنی تعلیم و تربیت سے بے پروائی کی سزا جس طرح دنیا میں بھگتنا ہے اور آخرت میں بھگتے گا، اسی طرح اگر وہ معاشرہ کی اصلاح اور اس کی تعلیم و تربیت سے بے پروائی اختیار کرے تو اس کی سزا دنیا میں بھی بھگتے گا اور آخرت میں بھی۔ ہم یہاں چند حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے اس فرض کی حقیقی اہمیت واضح ہوگی۔

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ جو شخص بھی تم میں سے کوئی بگاڑ دیکھے تو اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے اگر زبان سے بھی اس کی اصلاح کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے (مسلم)

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے پیغمبر بھی مجھ سے پہلے گزرے ہیں، ان کی اُمتوں میں اُن کے جاں نثار اور ان کے صحابی ہوتے رہے ہیں جو ان کی سنت کی پیروی اور ان کے احکام کی اقتداء کرتے رہے ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین پیدا ہوئے جو کہتے تھے وہ کچھ جو کرتے نہیں تھے اور کرتے تھے وہ کام جن کا ان کو حکم نہیں ملا ہوا تھا تو ایسوں سے جس نے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن، جس نے ان سے دل سے جہاد کیا وہ مومن اور جس نے ان سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن، اس کے نیچے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔" (مسلم)

"نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حدود الٰہی کے معاملہ میں سستی کرنے والے اور ان کے اندر جا پڑنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر اور نیچے کے حصوں پر قرعہ ڈالیں، کچھ کے حق میں نیچے کا قرعہ نکلے اور وہ نچلے حصہ میں بیٹھیں اور کچھ اس کے اوپر والے حصہ میں بیٹھیں، نیچے والوں میں سے کسی کو پانی کی ضرورت پیش آئے تو اس کو اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑے، جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں، یہ دیکھ

کہ کوئی نیچے والا کلہاڑا اٹھا کر کشتی کے پیندے ہی میں سوراخ کرنا شروع کر دے۔ جب اوپر والے آ کر پوچھیں کہ یہ کیا، تو وہ جواب دے کہ ہمارے اوپر جانے سے آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور ہمارے لیے ناگزیر ہے تو اس کے سوا کیا چارہ کار۔ پس اب اگر اوپر والے اس کا ہاتھ پکڑ لیں تو اس کو بھی بچائیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچائیں گے اور اگر اس کو آزاد چھوڑ دیں گے تو اس کو بھی ہلاک کریں گے اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کریں گے۔" (بخاری)

"ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ایسے لوگ حاکم بنائے جائیں گے جن سے معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں صادر ہوں گی، تو جس نے ان کی بری باتوں کو برا سمجھا تو وہ تو بری ہوا اور جس نے ان کی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی وہ سلامت رہا، البتہ ان کی خیر نہیں ہے جو راضی رہا اور جس نے ان کی پیروی کی۔ (مسلم)

"حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم نیکی کی طرف دعوت دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا، ورنہ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر تم اس کو پکارتے رہو لیکن تمہاری کوئی شنوائی نہ ہو۔" (ترمذی)

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے اعلیٰ جہاد کسی حق سے ہٹے ہوئے بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہہ گزرنا ہے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

"حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ ط (یعنی اس آیت سے تم یہ غلط استدلال کرتے ہو کہ آدمی پر بس اپنے ہی نفس کی اصلاح کی ذمہ داری ہے، دوسروں کی کوئی ذمہ داری اس کے سر نہیں ہے)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں لیکن اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ان پر کوئی ایسا عذاب بھیج دے جس کی لپیٹ میں سب ہی آجائیں۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے لیکن اس نے چھپائی تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام لگائی جائیگی"

(احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ان حدیثوں پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ دین کی باتوں کو آشکارا کرنا، لوگوں کی جہالت کو دور کرنا، مخالفِ اسلام حرکتوں کے خلاف خطرات سے بے پرواہ ہو کر آواز اٹھاتے رہنا اور جو کچھ حق ہے بے خوف لومۃ لائم لوگوں کو بتاتے رہنا، صرف ایک نفل نیکی نہیں ہے بلکہ ہر شخص پر اس کی استعداد اور صلاحیّت کے لحاظ سے یہ واجب ہے۔ اگر کوئی شخص علم اور صلاحیت رکھتے ہوئے برائیوں کی اصلاح کی کوشش نہیں کرے گا تو وہ مجرم اور اس کی سزا دونوں میں اصلی مجرمین کا شریک ٹھیرے گا۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہوگا جو ہاتھ اور زبان سے اصلاح کی سرے سے طاقت ہی نہ رکھتا ہو، ایسے اشخاص سے اسلام کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ وہ برائی کو برائی سمجھتے رہیں اور اپنے آپ کو اس سے دور رکھیں۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص محض خیالی اندیشوں یا محض معمولی مشکلات و خطرات کا بہانہ بنا کر اپنے آپ کو اصلاحِ معاشرہ کی ذمہ داریوں سے بری نہیں ٹھیرا سکتا، اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض اوقات معاشرہ اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے ایسی صورت میں اگر ایک شخص اصلاح کی کوشش نہ کرے تو اس کو معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن معاشرہ کا ہر درجہ کا بگاڑ وہ بگاڑ نہیں ہے جس کی آڑ لے کر ایک شخص گھر میں بیٹھ رہے اور یہ اعلان کر دے کہ لوگوں کے حالات اس درجہ خراب ہو چکے ہیں کہ ان کی اصلاح و تعلیم میں وقت ضائع

لے اے ایمان والو تم اپنے آپ کو سنبھالو، اگر تم راہ یاب ہو تو وہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جو گمراہ ہو گئے۔

کرنے کے بجائے اب خانہ نشین ہو جانے اور صرف اپنے ایمان و اسلام کے سنبھالنے کا وقت آ گیا ہے، اسلام نے معاشرے کے بگاڑ کی وہ حد خود بتا دی ہے جس کے بعد ایک شخص کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ عوام کی اصلاح کی ذمہ داری سے کنارہ کش ہو کر صرف اپنے ہی دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرے، وہ حد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے دین کی کوئی رمق باقی ہی نہ رہ گئی ہو، ہر شخص حقوق ادا کرنے کے بجائے حرص و طمع کو معبود بنائے بیٹھا ہو، شریعت کے بجائے ہر جگہ خواہشات کی پیروی ہو رہی ہو ہر جگہ دین پر دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہو، ہر شخص اپنی اپنی رائے اور اپنے اپنے خیال میں مگن ہو اور کسی کی بہتر سے بہتر بات بھی سننے کے لیے تیار نہ ہو، یہاں تک کہ یہ بات نہایت واضح طور پر نظر آنے لگے کہ اب اس معاشرہ کو بدلنا تو ممکن نہیں ہے البتہ یہ خطرہ نہایت قوی ہے کہ آدمی اگر اس کے اندر پڑا رہا تو خود تبدیل ہو جائے گا، ایسی صورت میں ایک شخص کے لیے بے شک یہ بات جائز ہے کہ وہ لوگوں کو چھوڑ کر صرف اپنا ایمان بچانے کی کوشش کرے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے:

> ابو ثعلبہؓ سے عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ والی آیت کے بارے میں روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا (سوال غالباً یہی ہوگا کہ لوگ عام طور پر اس آیت سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ ہر آدمی پر صرف اس کے اپنے ہی نفس کی ذمہ داری ہے) تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو معروف کی تعلیم دو اور منکر سے روکو، ہاں جب دیکھو کہ بخل مسلط ہو چکا ہے، خواہشات کی پیروی ہو رہی ہے دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے، ہر صاحب رائے اپنی رائے پر فریفتہ ہے اور تمہیں یہ بھی صاف نظر آنے لگے کہ اب تمہیں خود اپنے ایمان کے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے تو بس اپنے کو بچاؤ اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔
>
> (ترمذی، ابن ماجہ)

ایک اور حدیث میں یہ حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے:

"عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تم کیا کرو گے جب تمہیں ایسے لوگوں کے اندر زندگی گزارنی پڑے گی جو بالکل بھوک کی مانند ہوں گے، نہ ان کے اندر عہد کا کوئی احساس ہوگا نہ امانت کا، اور ان کے اندر جھگڑے اور اختلافات برپا ہو جائیں گے جس کے سبب سے وہ اس طرح (ہاتھ کے اشارے سے آپ نے سمجھایا) ہو جائیں گے۔ عبداللہ بن عمرو نے پوچھا "ایسے حالات کے لیے آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟" آپ نے فرمایا: جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو جو معروف ہے اس پر عمل کرو اور جو منکر ہے اس سے بچو۔ اپنی ذات کی فکر کرو اور عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔" (ترمذی)

اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہی بات اجمال اور تفصیل کے مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ آدمی کو عوام کی اصلاح سے بے تعلق ہونے کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ اب لوگوں کے اندر کوئی اچھی بات سننے اور قبول کرنے کی سرے سے کوئی صلاحیت باقی ہی نہیں رہ گئی ہے اور ان کو پانے کی کوشش میں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ خود اپنے آپ کو نہ کھو بیٹھے۔

اُوپر والی حدیث میں حثالہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بھوک، چھلکے، بھوسی اور ایسی ردی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے اب کچھ حاصل ہونے کی توقع نہ ہو، یعنی لوگ بالکل ہی بے جان اور بے رُوح ہو کر رہ گئے ہوں۔

خوف اور طمع

دوسری چیز جو آدمی کو جانتے بُوجھتے امرِ حق کے اظہار و بیان سے روک دیتی ہے وہ طمع یا خوف ہے، جن لوگوں سے آدمی اپنا کوئی دنیوی مفاد وابستہ کر لیتا ہے یا جن سے اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ان کی خواہشات کے خلاف اس نے کوئی بات زبان سے نکالی تو وہ اس کو نقصان پہنچا دیں گے، ان کے سامنے کسی ایسے حق کا اظہار جو ان کو پسند نہ ہو ایک کمزور آدمی کے لیے نہایت دشوار ہے۔ ہمارے اندر کتنے واعظ اور خطیب ہیں جو مسجدوں کے منبروں پر چڑھ کر گھنٹوں دادِ خطابت دیتے ہیں،

لیکن وہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کرتے جس کو ان کے سامعین پسند نہ کرتے ہوں، اگرچہ دین کے اندر وہ بات کتنی ہی پسندیدہ اور مسلّم حقیقت کیوں نہ ہو۔ کتنے عالمانِ دین ہیں جو دین کی فروعی باتوں پر تو زورِ مباحثے اور مناظرے کے مورچے قائم کرتے پھرتے ہیں، لیکن جانتے بُوجھتے ان مخالفتِ دین بلکہ ہادمِ دین سرگرمیوں کے مقابل میں بالکل گونگے بہرے بن جاتے ہیں جن کے متعلق ان کو اندیشہ ہو کہ اگر ان کے خلاف زبان ہلائی تو اربابِ اقتدار کی ناراضگی مول لینی پڑے گی، کتنے دینی مدارس ہیں جو کھولے تو جاتے ہیں دین کی تعلیم و تبلیغ کے نام پر لیکن وہ اصل دین کے علاوہ ان لوگوں کی خوشنودی اور رضاجوئی کا اہتمام کرتے ہیں جو ان کو چندہ دیتے ہیں اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں، یہی حال عام طور پر مصنّفوں اور مؤلفوں کا ہے۔ یہی رنگ ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کا ہے، حد یہ ہے کہ یہی انداز عام طور پر تزکیۂ نفس کرنے والے مزکیوں اور مرشدوں کا بھی ہے، وہ بھی اپنے روحانی مریضوں کے علاج اور پرہیز دونوں میں استیصالِ مرض سے زیادہ مریضوں کی پسند و ناپسند اور ان کی خواہشوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور ان باتوں کو بیماری کہنے کے بجائے صحت ہی کہنا پسند کرتے ہیں، جن کو بیماری کہنا کم از کم ان کے مالدار اور با اثر مریدوں کو ناگوار ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں حق پوشی کی اصلی وجہ صرف طمع ہے۔ چنانچہ حضرتِ کعبؓ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ علماء کے سینوں سے علم کو کس چیز نے نکالا؟ انھوں نے جواب دیا کہ طمع نے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ دارمی)

اس تمام کتمانِ علم کو مصلحت بینی پر محمول کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس جہل و فساد کے زمانہ میں لوگوں کو سارا دین بتانے کی کوشش کی جائے تو لوگ اس کا بوجھ سہار نہ سکیں گے بلکہ اندیشہ ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ بھی چھوڑ بیٹھیں۔ بعضوں کے نزدیک دین کے ان اجزاء کا بیان کرنا جن کو اربابِ اقتدار پسند نہیں کرتے ان سے ٹکر لینے کے ہم معنی ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی خارجیت ہے۔ بعض حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ جن امور میں مسلمان ایک خاص پہلو پر جم چکے ہیں اگرچہ وہ غلط ہی سہی اب ان پر کلام کرنا لوگوں کے ذہنوں کو تشویش میں ڈالنا ہے۔ الغرض مختلف مصلحتیں ہیں جن کو اس علم پوشی کے لیے بہانہ بنایا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہی جھوٹی مصلحت پرستیاں اور بہانہ بازیاں ہیں جنھوں نے معاملہ کو اس حد تک

خراب کیا ہے۔ مصلحت کی اہمیت سے ہم کو انکار نہیں ہے لیکن دین کی مصلحت اور اپنی ذاتی مصلحت میں بڑا فرق ہے، دین کی مصلحت پر نگاہ رکھنے والے تو یہ سوچتے ہیں کہ اللہ اور رسولؐ کی ہر بات بہرحال ہمیں لوگوں تک پہنچانی ہے، البتہ یہ لحاظ رکھنا ہے کہ ہر بات صحیح وقت پر، صحیح طریقہ سے، صحیح مخاطب کو پہنچے لیکن جو لوگ صرف اپنی ذاتی مصلحتوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں وہ ہمیشہ سے یہ دیکھتے ہیں کہ کن باتوں کا بتانا اور سکھانا ہمارے مصالح کے موافق ہوگا اور کن باتوں کے اظہار سے ان مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روش خدا کے دین کے ساتھ صریح چالبازی ہے اور اگر کوئی شخص اس کو مصلحت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو درحقیقت صریح منافقت کو مصلحت کا نام دینا چاہتا ہے۔

مسلمانوں سے اللہ کے رسولؐ نے جن باتوں پر عہد لیا ہے، عبادہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق ان میں ایک نہایت اہم بات یہ بھی شامل ہے کہ:

وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم۔	اور اس بات پر ہم سے بیعت کی کہ ہم حق کہیں جہاں کہیں بھی ہوں اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کریں۔

(ریاض الصالحین بحوالۂ مسلم و بخاری)

اس حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے معاشرہ کے ان لوگوں کے حالات کا جائزہ لیجیے جن پر حق کے اظہار و اعلان کی اصلی ذمہ داری ہے کہ وہ کس حد تک اس کو نباہ رہے ہیں۔ یہ حدیث تو منبر سے لے کر دار تک اور مدرسہ و مسجد سے لے کر بادشاہوں کے دربار تک ہر جگہ حق کے اعلان کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن یہاں حال یہ ہے کہ لوگ دین کے معاملہ میں بڑی بڑی دھاندلیاں دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ دھاندلی ہے، ظلم ہے، بہتان ہے لیکن ان کے خلاف محض اس اندیشہ سے زبان نہیں کھولتے کہ کہیں اپنے گروہ اور برادری سے خارج نہ کر دیے جائیں یا اپنے حلقہ کے لوگوں کے طعن و تشنیع کا ہدف نہ بننا پڑے۔

مشکوٰۃ میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے ایک طویل حدیث ترمذی کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے جس کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:

ولا یمنعن احدا منکم هیبة الناس ان یقول بحق اذا علمه۔	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ایک حق کو جانتے ہو تو لوگوں کا خوف اور رعب تمہیں اس کے اظہار سے مانع نہ ہو اور
وفی روایة ان رای منکرا ان یغیرہ۔ فبکی ابو سعید وقال قد رأیناہ فمنعتنا هیبة الناس ان نتکلم فیه۔	دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس کی اصلاح سے لوگوں کا خوف مانع نہ ہو۔ ابوسعیدؓ یہ بیان کر کے رونے لگے کہ آج ہم منکر باتیں دیکھ رہے ہیں لیکن لوگوں کے خوف نے ہیں ان کے بارے میں زبان کھولنے سے روک دیا ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ اس زمانہ کے حالات پر نگاہ کر کے رونے لگے جب کہ حق کی پامالی اور مظلومی کے واقعات کہیں شاذ و نادر ہی مشاہدہ میں آتے تھے اور اگر آتے بھی تھے تو جان کی بازیاں کھیل کر اس حق کی حمایت و نصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے والے بھی معاشرے میں کم نہیں تھے بنو امیہ کے دور میں بعض سفاکوں کی خوں آشامی ضرب المثل رہی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حق کے لیے اتنے بے شمار سر کٹنے کے لیے موجود نہ ہوتے تو ان سفاکوں کی خوں آشامی کو یہ شہرتِ دوام کہاں سے حاصل ہوتی ؟ البتہ رونے کا زمانہ آج ہے جب کہ حق پوشی ہی کو دین بنا لیا گیا ہے اور ملعون وہ نہیں کیے جاتے جو حق کو قتل کرتے یا اس کو چھپاتے ہیں بلکہ وہ لوگ کیے جاتے ہیں جو حق کے اظہار و اعلان کی جرأت کرتے ہیں۔

بے حمیّتی

کتمانِ علم یا کتمانِ حق کا ایک سبب بے حمیّتی اور بے غیرتی بھی ہے۔ حق اور علم حق ایک متاعِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ہر شخص کے اندر ان کی حفاظت اور ان کی حمایت و نصرت کے لیے غیرت و حمیت ہونی چاہیے۔ اللہ اور رسولؐ نے علم و عرفان کے جو چراغ جلائے ہیں وہ بلا تخصیص و امتیاز سب کی ہدایت و راہنمائی کے لیے ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان میں سے کوئی چراغ بھی گل کیا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ

سب کو روشنی سے محروم کیا جارہا ہے۔ پس ہر شخص کا فرض ہے کہ ان چراغوں کی حفاظت کرے اور اگر دیکھے کہ کوئی شخص ان کو گل کر رہا ہے تو یہ سمجھے کہ گویا اس کے اپنے ہی گھر کا دیا گل کیا جارہا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو حقوق قائم کر دیے ہیں، جو حدود مقرر کر دیے ہیں اور ہماری سلامتی کے لیے جو قوانین بنا دیے ہیں وہ سب بھی متاع مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی بقاء میں سب کی بقا اور ان کی بربادی میں سب کی بربادی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے امکان کی حد تک ان کی حفاظت کرے اور ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دے۔ اگر ایک شخص کا مال لٹتا ہے لیکن پاس پڑوس کے لوگ اس کی حمایت کے لیے نہیں اٹھتے، ایک شخص اگر قتل کر دیا جاتا ہے لیکن علم رکھنے والے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی مدد نہیں کرتے، اگر ایک عفیفہ کی آبرو سر بازار لٹتی ہے لیکن دیکھنے والے دم سادھ لیتے ہیں، نہ مظلومہ کو بچانے کے لیے اٹھتے ہیں اور نہ ظالم کے مقابل میں شہادت ہی دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں، اگر دین و شریعت کے اصولوں کی بھری مجلس میں توہین ہو رہی ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے لیکن مجلس کے بڑے بڑے ثقات کے کانوں پر بھی غیرت کی جوں نہیں رینگتی تو صاف الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے اندر خود اپنی غیرت، خود اپنے ناموس اور خود اپنی جان و مال کے لیے بھی کوئی احساس غیرت باقی نہیں رہا ہے اور وہ اس بات پر راضی ہیں کہ خود ان کی ماؤں یا بہنوں یا بیٹیوں کی عزت و آبرو خود ان کے سامنے لٹے اور وہ اس تماشہ کو دیکھیں۔ قرآن نے حق کے متاع مشترک ہونے کے اسی اصول کی بنیاد پر یہ فرمایا ہے کہ:

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ	جس نے کسی شخص کو قتل کیا بغیر اس کے
نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا	کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں
قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ	فساد برپا کیا ہو تو گویا کہ اس نے سب کو
اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا	قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا اس
النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (مائدہ: ۳۲)	نے سب کو زندہ کیا۔

غور کیجیے کہ قاتل اگر کسی کو ناحق قتل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ سب کو کس طرح قتل کر دیتا ہے اور اگر ایک شخص کسی کو ناحق قتل ہونے سے بچا لیتا ہے تو وہ سب کو کس

طرح زندہ بچا لیتا ہے؟ وہ اسی طرح کر درحقیقت حرمت جان کے اس مقدس اور بنیادی قانون کو تسلیم کر دیتا ہے جو سب کی جانوں کا محافظ ہے اور ایک بچا لینے والا اس قانون کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت میں سب کے لیے امان ہے اس سے یہ بات لازمی طور پر نکلتی ہے کہ کسی معاشرہ کے اندر ہر قتل، ہر بے آبروئی اور ہر ظلم کو انفرادی حیثیت میں دیکھنے کے بجائے اس کو اجتماعی حیثیت میں دیکھا جانا چاہیے، گویا ہر شخص قتل ہوا، ہر شخص کی بے ناموسی ہوئی، ہر شخص پر ظلم ہوا اور پھر اسی حیثیت سے اس کے خلاف پورے معاشرے کے اندر ایک کھلبلی پائی جانی چاہیے۔ اگر یہ کھلبلی نہ پیدا ہو تو یہ چیز پورے معاشرہ کی بے حسی اور بے حمیتی کی دلیل ہے۔ اور ایسے معاشرہ کے اندر نیکی اور سچائی کے تمام نشانات یکے بعد دیگرے معدوم ہو کے رہتے ہیں اور پھر سب کے سب ظلم، جہالت اور تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر گھر جاتے ہیں۔

یہ بے حمیتی مختلف صورتوں میں معاشرہ پر چھاتی ہے۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور وہ بتدریج ہر شعبۂ زندگی پر چھانے لگتا ہے لیکن وہ لوگ جو بگاڑ کی اصلاح کر سکتے ہیں، اپنے انفرادی تزکیہ میں لگے رہتے ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے ہر طرح کے فسق و فجور کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے مسند و سجادہ کے حدود سے باہر جھانک کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اللہ کی شریعت کی ہر جگہ علانیہ بے حرمتی ہوتی ہے لیکن یہ اپنے حال میں مست پڑے رہتے ہیں، ان کی پیشانی پر غیرت کی ایک لہر بھی نہیں اٹھتی۔ جب معاملہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے معاشرہ پر اپنا غضب نازل فرماتا ہے اور پھر اس وقت جس طرح اصل مجرمین پر خدا کا غضب بھڑکتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ان اتقیاء و زہاد پر یہ غضب بھڑکتا ہے جن کی ناک کے نیچے یہ سارا فساد پرورش پاتا رہا اور وہ گونگے بہرے بنے ہوئے اس کا تماشہ دیکھتے رہے، ایک حدیث ملاحظہ ہو:

عن جابر قال قال رسول اللہ	حضرت جابرؓ سے حکایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اوحی	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

اللہ عزّ وجل الیٰ جبریل علیہ السّلام ان اقلب مدینۃ کذا وکذا باھلھا۔ فقال یارب ان فیھم عبدک فلانا لم یعصک طرفۃ عین قال فقال اقلبھا علیہ وعلیھم فان وجھہ لم یتمعر فی ساعۃ قط	نے جبریلؑ کو حکم بھیجا کہ فلاں بستی کو اس کے باشندوں سمیت اُلٹ دو، جبریلؑ نے عرض کی کہ اے رب، اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی، حکم ہوا کہ اس پر اور تمام دوسروں پر اس کو اُلٹ دو کیوں کہ اس شخص کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر تھوڑی دیر کے لیے بھی تمتمایا نہیں۔

اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتے دیکھ کر جو لوگ اس کی اصلاح کی صلاحیت رکھنے والے ہوتے ہیں وہ اصلاح کے لیے اُٹھتے تو ہیں لیکن ان کے اندر وہ لگن نہیں ہوتی جو اس میدان میں اترنے والوں کے اندر ہونی چاہیے۔ وہ اس راہ کی مشکلات کے مقابلہ کے لیے اپنے اندر دم داعیہ نہیں رکھتے، ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی اصلاح تو ہو لیکن اس طرح کہ نہ تو کسی کی ناراضگی مول لینی پڑے اور نہ کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔ وہ سانپ کو تو مارنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے اپنی عصائے مقدس کو قربان نہیں کرنا چاہتے، ان کی عام روش یہ ہوتی ہے کہ وعظ کی مجلسوں میں وہ وعظ فرما دیتے ہیں، درس کے حلقوں میں قرآن وحدیث کا درس دے دیتے ہیں، معاشرہ کی بُرائیوں پر کبھی کبھی پھبتے ہوئے، کچھ طنز بھی فرما جاتے ہیں کبھی کبھی مرشدانہ انداز میں کچھ دردمندانہ نصیحتیں بھی سنا جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے اسی رو میں بہے چلے جاتے ہیں جس رو میں سب بہہ رہے ہوتے ہیں۔ ان کے بہنے اور دوسروں کے بہنے میں اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو بس یہ ہوتا ہے کہ دوسرے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو بہاؤ کے رُخ پر ڈال دیتے ہیں اور یہ بہنے والوں کے ساتھ بہتے ہوئے کبھی کبھی یہ بھی یاددہانی کرتے جاتے ہیں کہ "ہم کہتے نہ تھے کہ یہ تم غلط سمت میں بہے جا رہے ہو"۔ ظاہر ہے کہ اگر اصلاح کی محض خواہش ہی خواہش ہو، برائیوں کے خلاف حق کی حمایت کے لیے وہ سچی حمیت نہ ہو، جو آدمی کو اس بات پر مجبور کر دے کہ اگر لوگ غلط سمت میں بگٹٹ

چلے جا رہے ہیں تو وہ ھذا فراق بینی و بینک کہہ کر اپنی راہ بدل لے اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرے کہ اس کے کن کن مفادات پر زد پڑتی ہے تو اس خواہشِ اصلاح کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ اور وہ اپنے آپ کو اس انجام سے کس طرح بچا سکتا ہے جو اس طرح کے بگاڑ کے لیے مقدر ہے؟

اس حقیقت کو مندرجہ ذیل حدیث سے سمجھیے:

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں بگاڑ کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب کوئی شخص کسی ایسے شخص سے ملتا جو کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا تو وہ اس سے کہتا کہ اے فلاں، اللہ سے ڈرو اور یہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باز آؤ، یہ بات تمہارے لیے جائز نہیں ہے، لیکن جب وہ دوسرے دن اس سے ملتا اور دیکھتا کہ وہ اپنی اسی روش پر قائم ہے تو اس کے اندر اتنی غیرت نہ پیدا ہوتی کہ وہ کھانے پینے اور مل بیٹھنے میں اس کا ساتھی بننے سے انکار کر دے۔ جب لوگوں نے یہ کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک کے دل کی سیاہی دوسرے کے دل پر بھی تھوپ دی۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ ...... (الی قولہ)	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔ کبھی منکر سے جس کو وہ کر رہے ہوتے تھے، باز نہیں آتے، کیا ہی برا تھا وہ کام جو وہ کر رہے تھے) تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ انہی کو دوست رکھتے ہیں جنہوں نے کفر کیا، کیا ہی برا ہے وہ توشہ جو انہوں نے

فَاسِقُوْنَ۔ اپنے لیے فراہم کیا۔

لفظ "فاسقون" تک حضورؐ نے یہ آیت پڑھی۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں، یا تو یہ ہوگا کہ تم نیکی کا حکم دو گے، بُرائی سے روکو گے، ظالموں کا ہاتھ پکڑو گے اور انہیں حق پر قائم رہنے پر مجبور کرو گے یا یہ ہوگا کہ تم میں سے ایک کے دل کی سیاہی دوسرے کے دل پر بھی چھا جائے گی۔ پھر اللہ تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی۔"

یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں، یہی حدیث ترمذی میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے:

"جب بنی اسرائیل برائیوں میں مبتلا ہونے لگے تو شروع شروع میں ان کے علماء نے ان کو روکا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو باز ہی نہیں آتے تو انہوں نے ان کی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ نے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی دوسرے گروہ کے دلوں پر بھی تھوپ دی اور ان کی نافرمانی اور زیادتی کی پاداش میں داؤد اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے، یہ فرماتے ہوئے آپؐ اٹھ بیٹھے اور پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے جب تک تم انہیں حق کی طرف موڑ نہ دو اس وقت تک تم خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔"

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جس طرح وہ شخص بے حمیت اور خدا کی لعنت کا مستحق ہے جو سرے سے معاشرے کے اندر اُبھرنے والی برائیوں کے خلاف زبان ہی نہیں کھولتا اسی طرح وہ شخص بھی بے حمیت اور غضب الٰہی کا مستحق ہے جو زبان تو برائیوں کے خلاف کھولتا ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی تنقیدیں لوگوں کا رُخ پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ غیرت کا ثبوت دے اور ان سے اپنے آپ کو علیحدہ کرے، انہی کا ہم نوالہ و ہم پیالہ بن جاتا ہے، اس طرح کے لوگ حق کا اظہار تو دبی زبان سے کرتے ہیں لیکن باطل کی تائید اپنے کھلے عمل سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں ان کی

ان بے جا تقیدوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ ان کا شمار بھی کاتمینِ حق ہی میں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جتنا کتمانِ حق اس طرح کے لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے اتنا شاید دوسروں کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔

مداہنت کتمانِ حق کا چوتھا سبب مداہنت اور چشم پوشی ہے، آدمی جن لوگوں سے قرابت و رشتہ داری رکھتا ہے، جن سے اس کے دوستانہ روابط ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے خاندان اور برادری کا سمجھتا ہے یا جن کے لیے اس کے دل میں احترام و عقیدت کا جذبہ ہوتا ہے، بسا اوقات ان کے سامنے وہ اظہارِ حق میں کمزور پڑ جاتا ہے، وہ ایک معاملہ میں صاف جانتا ہے کہ حق کیا ہے لیکن محض اس وجہ سے وہ سچی شہادت دینے سے یا تو کترا جاتا ہے یا صریح جھوٹ بول دیتا ہے کہ معاملہ اس کے کسی عزیز و قریب یا دوست یا خاندان کے آدمی کا ہے۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے ایک کھلی ہوئی کمزوری بلکہ صریح نافرمانِ اللہ اور رسول کی دیکھتا ہے لیکن چپ سادھے رہتا ہے کیوں کہ معاملہ اس کے اپنے بیوی بچّوں اور عزیزوں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ صاف جانتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس کے شیخ یا استاد یا مرشد سے صریح زیادتی ہو رہی ہے لیکن وہ محض اس وجہ سے ٹوکنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اپنے استاد یا مرشد کو کیا کہے اور کیسے کہے۔

اس طرح کے لوگوں کے ذہن کا اور ان کے اس طرزِ عمل کا تجزیہ کیا جائے تو چند باتیں نہایت آشکارا ہو کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح کے لوگ سچی خیر خواہی اور جھوٹی محبت میں امتیاز نہیں کرتے، دوسری یہ کہ یہ خدا کے مقابل میں شیطان پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں، تیسری یہ کہ یہ ارادت و عقیدت کے تقاضوں کو حق سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں۔

ایک شخص اگر اپنے کسی بچے یا کسی عزیز میں ایک خطرناک مرض کے آثار پا رہا ہو لیکن وہ محض اس خیال سے اس کو زبان پر نہ لائے یا اس کے علاج کی فکر نہ کرے کہ یہ چیز اس کی طبیعت پر بار ہوگی اور اس کو انجکشن اور آپریشن کے تکلیف دہ مراحل سے گزارنا پڑے گا تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ محبت کا تقاضا تو ہے لیکن یہ محض ایک جھوٹی محبت

ہے جس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں سچی محبت یا بالفاظِ دیگر سچی خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کا نوٹس لیا جائے، اور قبل اس کے کہ اس کی بیماری لاعلاج ہو جائے اس کا علاج کر ڈالا جائے۔ اگرچہ یہ علاج کتنا ہی تکلیف دہ اور ناگوار کیوں نہ ہو۔ اسی حقیقت کو قرآنِ حکیم نے اس طرح سمجھایا ہے کہ بجائے اس کے تمہاری مداہنت اور چشم پوشی سے بگڑ کر تمہارے اہل و عیال خدا کے سخت گیر ملائکہ کی گرفت میں آئیں اور دوزخ کا ایندھن بنیں تمہاری سچی خیر خواہی اور سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ تم خود ہی اپنے احتساب اور اپنی تادیب کے نیچے رکھ کر ان کو خدا کی رحمت کا مستحق بناؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ
غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ
مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا
يُؤْمَرُوْنَ ۝ (تحریم - ۹)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے
اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کے
ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے جس پر سخت
گیر اور مضبوط فرشتے مامور ہوں گے جو خدا
کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے، وہی
کریں گے جو انہیں حکم ملے گا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے خدا اور اس کے قانون سے فرار اختیار کیا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم اس کے معاملہ میں جھوٹی شہادت دے کر یا سچی شہادت کو چھپا کر اس کو اللہ سے اور دور کر دیں اور خدا کے مجرم کی حمایت کر کے خود ہمارے لیے بھی یہ ہے کہ ہم اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کریں۔ اگر ہم اس کو خدا کے قانون سے بچانے کی ناجائز کوشش کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اس کے معاملے میں خدا سے زیادہ شیطان کے اوپر اعتماد رکھتے ہیں اور اس کو شیطان کے حوالہ کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت کے الفاظ پر خوب اچھی طرح غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جائے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا
قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ
وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

اے ایمان والو! عدل کی محافظت کرنے
والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت
دیتے ہوئے اگرچہ یہ شہادت تمہاری

وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا	اپنی ذات کے یا تمہارے والدین کے یا تمہارے
اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا	رشتہ داروں کے خلاف ہی پڑے، کوئی
فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا	شخص امیر ہو یا غریب، اللہ کا حق ان دونوں
وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ	پر سب سے زیادہ ہے، تو خواہش کی پیروی
اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	کرکے انصاف سے نہ ہٹو اگر تم کسی کی طرف
خَبِیْرًا ٥	جھک گئے یا کسی سے اعراض برتو گے تو یاد
	رکھو کہ اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس کی خبر
	رکھنے والا ہے۔

یعنی تمہاری شہادت بالکل بے لاگ لپیٹ ہونی چاہیے۔ اس میں اس وجہ سے کوئی فرق ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شخص تمہارا عزیز اور رشتہ دار ہے اور دُوسرا شخص نہیں ہے یا ایک شخص غریب ہے اور دوسرا مالدار ہے، کوئی شخص یگانہ ہو یا بیگانہ، امیر ہو یا غریب، خدا کا حق دونوں پر یکساں ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق پر مقدم ہے، اس وجہ سے بجائے اس کے کہ غربت و امارت اور یگانگی و بیگانگی کا لحاظ کرکے کسی پر خدا کا قانون چلایا جائے شہادتِ حق کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں پر اس کو یکساں چلایا جائے کیوں کہ خدا کے قانون کے تحت مرجانا اس جینے سے کہیں بہتر ہے جو خدا کے قانون کے تحت نہ ہو۔

یہی حقیقت مخزومیہ عورت کے اس واقعہ سے واضح ہوتی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مخزومیہ عورت نے چوری کی، تو قریش کو اس کی بڑی فکر ہوئی، وہ اس امر پر غور کرنے لگے، کہ اس کے بارے میں کوئی شخص رسول اللہؐ سے گفتگو کرے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بھلا ایسے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اُسامہ بن زید کے سوا کس کی مجال ہے کہ حضورؐ کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت کرسکے، چنانچہ حضرت اسامہؓ نے حضورؐ سے گفتگو کی حضورؐ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے باب میں سفارش کرنے آئے ہو؟ اس کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم سے پہلی اُمتوں کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ جب ان کے اندر کوئی معزز آدمی چوری کرتا

تو اس سے چشم پوشی کر جاتے اور اگر کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے لیکن خدا کی قسم میں تو اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔“

(مسلم و بخاری)

اب ان لوگوں کے معاملے کو لیجیے جو شیخ یا استاذ یا مرشد یا لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کو جانتے بوجھتے نظر انداز کرنے کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر وجہ پر غور کیجیے گا تو آپ خود محسوس کریں گے کہ ایک سے ایک بڑھ کر افسوس ناک بلکہ شرمناک ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ محسوس کریں کہ اپنے شیخ یا استاذ یا لیڈر سے نہایت سخت قسم کی زیادتی ہو رہی ہے لیکن محض اس کا لحاظ اور احترام آپ کے لیے اس زیادتی کے خلاف زبان کھولنے سے مانع ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ استاذ یا شیخ کا احترام حق سے بھی زیادہ کرتے ہیں اور شیخ اور استاذ کے احترام کے تقاضوں کو خدا کے اور رسولؐ کے صریح مطالبات سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے کسی بزرگ میں کوئی غلطی صریحاً دیکھ تو رہے ہیں لیکن آپ کی کوئی چھوٹی یا بڑی غرض اس بزرگ سے وابستہ ہے جس کے سبب سے آپ کے منہ میں لگام لگی ہوئی ہے اور آپ اس کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر رہے ہیں۔ اگر یہ وجہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی غرض اور اپنے مطلب کو حق اور سچائی اور خدا اور رسولؐ سب پر مقدم رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو اپنے شیخ یا استاذ کے علم اور تقویٰ پر اتنا بھروسہ اور اس کی رائے پر اتنا گہرا اعتماد ہے کہ آپ محسوس تو کرتے ہیں کہ اس کا فلاں فعل یا فلاں قول بالکل حقیقت کے خلاف ہے لیکن محض اس خیال سے اس کو ٹوکنے سے احتراز کریں کہ ایک ایسا صاحب علم و تقویٰ کوئی غلط کام کس طرح کر سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں اس وجہ سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ اگر یہ وجہ ہے تو یہ وہی اندھی تقلید ہے جس میں مبتلا ہو کر لوگوں نے اپنے بزرگوں اور مشائخ کو ہم پایۂ خدا یا بالفاظ دیگر ارباباً من دون اللہ بنا ڈالا اور اس کے نتیجہ میں حق شناسی کی نعمت سے ایسے محروم ہوئے کہ سورج کی طرح چمکتا ہوا حق بھی ان کو نظر نہ آسکا۔ اس کی چوتھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے لیڈر یا مرشد کی غلطی اور کوتاہی جاننے کے باوجود محض سہل انگاری کے سبب سے حق نصیحت سے

تغافل برت رہے ہوں۔ اگر یہ سبب ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا حق آپ پر سب سے بڑا ہے آپ اسی کے معاملے میں مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔ ایک شخص نے آپ کو تعلیم دی، آپ کی تربیت کی، آپ کو راہ پر لگایا لیکن جب اس نے خود کہیں ٹھوکر کھائی تو بجائے اس کے کہ آپ اس کو دوڑ کر سنبھالتے اور جھپٹ کر اٹھاتے اس کو چھوڑ کر چلتے بنے۔ یہ ایک کھلی ہوئی ناسپاسی اور احسان فراموشی ہے۔ پانچویں اور آخری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اس کے ٹھوکر کھا کر گرنے ہی کے متمنی رہے ہیں اور جب کہ وہ گر چکا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتے اس کو کیچڑ میں لت پت اور دلدل میں پھنسا ہوا دیکھ کر آپ مطمئن ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو یہ ایک بدترین خیانت اور سنگین ترین بے وفائی ہے جو کوئی شخص اپنے کسی بزرگ یا اپنے لیڈر کے ساتھ کر سکتا ہے۔

بہر حال ان میں سے جو وجہ بھی ہو اور انہی میں سے کوئی نہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے، ہر وجہ نہایت افسوسناک اور نہایت شرمناک ہے، بلکہ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ عقیدے کے اعتبار سے ان کے ڈانڈے شرک سے ملتے ہیں اور اخلاقی گراوٹ کے پہلو سے دیوثیت ہے۔ پھر جب آدمی ان پر اس پہلو سے نگاہ ڈالتا ہے کہ ایک مرشد یا ایک پیشوا اور لیڈر کی غلطی محض ایک شخص ہی کی غلطی اور کرتا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ہزاروں اور لاکھوں کی غلطی اور خرابی کی موجب ہے، اس سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں، جماعتوں کی جماعتیں گمراہی کے راستے پر چل پڑتی ہیں، اور بالآخر قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں تو ان کی سنگینی سو گنی بلکہ ہزار گنی بڑھ جاتی ہے۔

بدعت' اس کے اسباب اور اس کا علاج

بدعت کی تعریف

بدعت نام ہے اس چیز کا کہ جو دین کی نہیں ہے وہ دین میں لا گھسائی جائے۔ کسی چیز کے دین کی چیز ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ قرآن میں بیان ہوئی ہو۔ اگر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو کسی قابل اعتماد حدیث ہی میں آئی ہو، اگر حدیث میں بھی نہ ہو تو کم از کم قیاس و اجتہاد سے یہی ثابت ہو کہ یہ بات قرآن و حدیث سے موافقت اور مناسبت ہی رکھتی ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی تعلق بھی اس کا کتاب و سنّت سے ثابت نہ پایا جائے تو پھر یہ بات دین کی بات نہیں ہو سکتی۔ اگر دین کے ساتھ اس کا خواہ مخواہ جوڑ ملانے کی کوشش کی گئی تو یہ بدعت ہوگی اور اس طرح کی ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے۔

اس امر کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس طرح کی کوئی بات بدعت اسی صورت میں قرار پائے گی جب اس کا پیوند دین سے لگانے کی کوشش کی جائے اگر دین سے اس کا جوڑ نہ ملایا جائے تو اس پر بدعت کا اطلاق نہ ہوگا۔ فرض کیجیے ایک شخص گانا سنتا ہے لیکن وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ یہ چیز دین کا کوئی جزء ہے یا معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ ہے یا شریعت

سے یہ ثابت ہے تو اس کے اس فعل کو بدعت نہیں کہیں گے کیوں کہ اس نے اس چیز کا جوڑ دین سے نہیں ملایا ہے۔ اس کو شریعت کے احکام کی روشنی میں جانچیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز، اور اگر ناجائز ہے تو کس درجہ میں ناجائز ہے لیکن اگر وہی شخص اپنے اسی گانے سننے کے متعلق یہ دعوے کر بیٹھے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا کوئی ذریعہ یا تزکیۂ نفس و اصلاحِ باطن کا کوئی نسخہ ہے تو اس سے سوال ہو گا کہ اس نے کتاب و سنت کی کس دلیل یا ان کے کس اشارہ سے یہ بات اخذ کی ہے؟ اگر وہ کسی نص یا اشارہ کا حوالہ دے گا تو اس کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہو گا اور اگر وہ کوئی حوالہ نہ دے سکے بلکہ محض اپنے وجدان یا ذوق یا تجربہ کو اس کی دلیل ٹھیرائے تو یہ بدعت ہو گی کیونکہ وہ دین کے حرم میں ایک ایسی چیز گھسا رہا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

یہاں سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے اس میں کوئی اضافہ یا ایجاد یا کوئی نئی راہ نکالنا یا نئی طرح ڈالنا بدعت کے تحت نہیں آتا۔ اس دائرے میں ہم آزاد ہیں کہ جو چاہیں اضافے کریں اور جس طرح کی چاہیں کمیاں کریں۔ لیکن یہاں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں دین اور دنیا کی اس قسم کی کوئی تفریق ہے بھی؟ اگر ہے تو ان کے درمیان وہ حدِ فاصل کیا ہے جس سے ایک شخص بغیر کسی اشتباہ کے معلوم کر سکے کہ یہ دین کے حدود ہیں اور یہاں سے دنیا کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

دین اور دنیا کے حدود

اس سوال کے پہلے حصہ کا جواب تو یہ ہے کہ اسلام میں اس معنی میں تو دین اور دنیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے جس معنی میں عیسائیت میں ان کے درمیان تفریق ہے کہ شخصی زندگی کے ایک نہایت محدود گوشے کے سوا بقیہ ساری اجتماعی و سیاسی زندگی دین کے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ اسلام اس پہلو سے تو ایک کلیت پسند دین ہے کہ اس نے ہماری زندگی کے ہر حصے سے بحث کی ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا سماجی یا سیاسی لیکن اس پہلو سے اس میں بھی دین اور دنیا کی تفریق موجود ہے کہ وہ ہمارے ہر گوشۂ زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات سے بحث نہیں کرتا بلکہ صرف ان کے چاروں گوشے متعین کر دیتا ہے، ان کو متعین کر دینے

کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ان کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی رائے اور فکر کی آزادی استعمال کریں اور اپنی قوتِ ایجاد و اختراع کا مظاہرہ کریں۔

اس بات کو چند مثالوں سے سمجھیے:

ہماری زندگی سے ایک بڑا قریبی تعلق رکھنے والا مسئلہ، کھانے پینے کا مسئلہ ہے۔ اس میں اسلام نے دخل تو دیا ہے لیکن اس دخل کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ پہلے ساری کھانے پینے کی چیزوں کی تفصیل سنائی ہو، پھر یہ بتایا ہو کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں جائز ہیں اور کیا کیا چیزیں ناجائز۔ پھر ان کے پیدا کرنے، ان کے سنبھالنے اور ان کے پکانے اور محفوظ رکھنے کی تدبیریں بتائی ہوں۔ اسلام کو ان تفصیلات سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اس نے صرف یہ کیا ہے کہ چند متعیّن چیزوں کو جو حرام ہیں بتا دیا کہ یہ حرام ہیں، ان کو کھانا پینا ناجائز ہے، اب جو چیزیں ان کے حکم میں آتی تھیں وہ آپ سے آپ ان کے تحت حرام یا مکروہ ہوگئیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی ساری چیزوں کو انسان کی طلب، اس کے ذوق اور اس کی قوتِ اکتساب و ایجاد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی طبعی ضرورتوں اور اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرے۔

اسی طرح ہمارے لباس کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں اس نے یہ کیا کہ چند اخلاقی نوعیت کی حدیں مقرر کر دیں مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو۔ مردانہ لباس مثلاً ریشم کا استعمال نہ کریں۔ لباس سے شہدپن اور غنڈہ پن کا اظہار نہ ہو مثلاً تہمد یا شلوار زمین پر گھسٹتی ہوئی یا ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ عورتیں مردوں کا سا، یا مرد عورتوں کا سا لباس نہ پہنیں۔ بس اس طرح کی چند شرطیں عائد کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا کہ ہم جس طرح کے کپڑے چاہیں ایجاد کریں۔ جس طرح کے چاہیں سلوائیں، اور جس طرح ڈھب سے انہیں چاہیں پہنیں۔ ان سارے امور کا انحصار ہمارے ملک کی آب و ہوا، ہماری قومی روایات، ہمارے فطری ذوقِ آرائش اور ہماری قابلیتِ اختراع و ایجاد پر ہے۔ مذہب ان چیزوں میں کوئی دخل نہیں دیتا۔

اسی طرح ہمارا معاشرتی مسئلہ ہے اس میں بھی اسلام نے چند اصول دے دیے ہیں مثلاً یہ کہ اس کی بنیاد جائز رشتۂ مناکحت پر ہو، اس میں مرد کی قوامیت کے ساتھ عورت

اور مرد دونوں کے لیے حقوق اور دونوں کے اُوپر ذمہ داریاں ہوں، اولاد کی پرورش و تربیت ایک مشترک ذمہ داری ہو، اگر اس رشتہ کو توڑنے کی نوبت آئے تو وہ یوں ہی واقع نہ ہو جائے بلکہ طلاق، عدت، مہر اور رضاعت کے چند متعین ضوابط کے تحت ہو۔ عورتوں اور مردوں کو آزادانہ اختلاط کی اجازت نہ ہو بلکہ گھروں کے اندر بھی اور گھروں کے باہر بھی چند معلوم حدود کی پابندی کی جائے۔ ان چند اصولی باتوں کے بعد ازدواجی زندگی کو خوشگواری کے ساتھ گزارنا اور اجمال میں تفصیل کا رنگ بھرنا میاں اور بیوی کا اپنا کام ہے، اسلام اندرونِ خانہ کی روزمرّہ زندگی کی جزئیات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔

اسی طرح ہماری سیاسی زندگی کا معاملہ ہے اس کے متعلق بھی اسلام نے چند بنیادی باتیں طے کر دی ہیں، مثلاً یہ کہ اسلام کا نظامِ حکومت خدا کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی ہو۔ اس میں قانون کا ماخذ خدا کی شریعت ہو، اس کے چلانے والے تقویٰ اور صلاحیت کے اوصاف سے متصف ہوں جہاں شریعتِ الٰہی کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو، وہاں سارے معاملات شوریٰ کے ذریعے سے طے کیے جائیں، یہ اور اسی طرح کے چند بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک سیاسی نظام کو بنانا اور چلانا اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق اس کو ڈھالنا اور ترقی دینا ہمارا اپنا کام ہے۔ اسلام ان تفصیلات میں نہیں پڑتا جو بالکل انتظامی نوعیت کی ہیں اور جن کا شعور ہر معاشرے کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔

یہ چند چیزیں محض بطورِ مثال ذکر کی گئی ہیں۔ ہمارا مقصود یہاں نہ تو تمام شعبہ ہائے زندگی کا استقصاء کرنا ہے اور نہ ان اصولوں کی تفصیل کرنا ہے جو ان شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اسلام نے دیے ہیں۔ یہ چیزیں ہر صاحبِ علم، قرآن اور حدیث سے اخذ کر سکتا ہے، ہم تو یہاں صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اگر ایک کلیت پسند دین ہے تو وہ کس معنی میں کلیّت پسند ہے۔ وہ کلیت پسند تو بے شک ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اس کلیّت پسندی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق وہ بنیادیں متعیّن کر دیتا ہے جن پر اس کو مبنی ہونا چاہیے۔ یہ معنی اس کلیّت پسندی کے نہیں ہیں کہ وہ ، شعبۂ زندگی سے متعلق ساری جزئیات و تفصیلات بھی بتاتا ہو۔ یہی حقیقت ہے جس کو ہمارے فقہاء اس طرح تعبیر

کرتے ہیں کہ اصل ہر چیز میں اباحت ہے یعنی ہر شعبۂ زندگی کے اندر اسلام کچھ حدود متعیّن کر دیتا ہے، اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ ان حدود کا پُورا پُورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے فکر و عمل کی وہ صلاحیتیں استعمال کریں جو ہمارے اندر ودیعت ہیں۔

حد بندی اور اباحت، پابندی اور آزادی کا یہی وہ امتزاج ہے جو اسلام کو نہ صرف دوسرے مذاہب پر فوقیت بخشتا ہے بلکہ اس کو ایک ابدی دین کا مقام عطا کرتا ہے۔ ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو چند پابندیوں کے ساتھ یہ جو باندھ دیا گیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ خواہ اس پہ کتنے ہی تغیرات اور حوادث طاری ہوں لیکن وہ ان حقائق سے منحرف نہ ہونے پائے جو فطرت کے اٹل حقائق ہیں۔ یہ حقائق اگر قائم ہیں تو زندگی کا ہر تغیّر اسلام ہی کے تحت ہے اس تغیّر سے معاشرہ یا تمدّن یا سیاست میں کسی فساد کے پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن اگر وہ حقائق اپنی جگہ قائم نہ رہ سکیں تو پھر ہماری زندگی اس جہاز کے مانند ہے جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس چٹان سے جا ٹکرائے۔ اور یہ جو ایک وسیع دائرۂ آزادی کا رکھا گیا ہے جس کے اندر ہم خود اپنی فکری و عملی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں تو یہی وہ چیز ہے جو اسلام کے اندر وہ لچک پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ زمانہ کے ہر اس صالح تغیّر کو اپنا لیتا ہے جو اس کے بنیادی اصولوں سے بے جوڑ نہیں ہوتا۔ یہ چیز آپ نہ موسائیت میں پائیں گے اور نہ مسیحیت میں اور نہ دنیا کے کسی اور مذہب یا دھرم میں۔

اس روشنی میں غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام ایک طرف تو ہماری ساری زندگی پہ حاوی بھی ہے اور دوسری طرف اس میں دین اور دنیا کے الگ الگ دائرے بھی ہیں، ان میں سے ایک دائرہ کے اندر ہم پابند ہیں اور دوسرے دائرہ کے اندر ہم آزاد۔

یہی دائرہ جس کے اندر ہم آزاد ہیں، قرآن کے بعض مقامات اور متعدد احادیث میں دنیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دنیا کا لفظ یوں عام طور پہ تو آخرت کے مقابل میں آتا ہے اور اس وقت اس سے عالمِ باقی کے مقابل میں عالمِ فانی مراد ہوا کرتا ہے لیکن جب اس خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو یہ لفظ دین کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔

اور اس وقت اس سے مراد ہماری زندگی کا وہ دائرہ ہوا کرتا ہے جس کی چاروں حدیں متعین کر دینے کے بعد ہمیں اس میں آزادی بخشی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا	اور اگر تمہارے والدین اس بات کے درپے ہوں کہ تم کسی ایسے کو میرا شریک بناؤ جس کے حق میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو تم ان کی بات نہ مانیو لیکن دنیوی معاشرت کے دائرہ میں ان کے ساتھ دستور کے مطابق سلوک کرتے رہنا۔

اس آیت میں فِي الدُّنْيَا کا لفظ " دین " کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد ہماری معاشرتی زندگی کا وہ دائرہ ہے جس کے اندر خدا نے ہمیں آزاد چھوڑا ہے کسی حکم یا ممانعت کے ذریعہ سے ہماری آزادی پر کوئی پابندی عاید نہیں کر دی ہے اس دائرہ میں ہمیں ہدایت ہے کہ ہم والدین کے ہر حکم کی اطاعت کریں کیوں کہ یہاں ان کی اطاعت اور خدا کی اطاعت میں کسی تصادم کا اندیشہ نہیں ہے۔ تابیر نخل والی مشہور حدیث میں حضورؐ نے یہ جو ارشاد فرمایا:

انتم اعلم بامور دنیاکم	تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔

تو اس سے ہماری زندگی کا یہی دائرہ مراد ہے۔

اب مذکورہ بالا سوال کے دوسرے حصہ پر آئیے یعنی اس سوال پر کہ ہمارے دین اور ہماری دنیا کے درمیان وہ حدِ فاصل کیا ہے جو ان دونوں دائروں کو اس طرح ایک دوسرے سے نمایاں اور ممتاز کر دے کہ دونوں میں کوئی التباس اور اشتباہ باقی ہی نہ رہ جائے تاکہ ہم اپنے اختیار اور اپنی آزادی کے استعمال میں حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے

مجرم نہ ٹھیریں بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی دائرے کے اندر اپنی آزادی استعمال کریں جس کے اندر ہمیں اس کے استعمال کا حق ملا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا سے مراد وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں ہمیں خدا اور رسولؐ کی طرف سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت نہ دی گئی ہو اور دین سے مراد وہ امور و مسائل ہیں جن میں خدا اور رسولؐ کی جانب سے نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی ہدایت دی گئی ہو۔ یہ ہدایت خواہ قرآن کے ذریعے سے دی گئی ہو یا حدیث کے ذریعے سے یا قرآن و حدیث کے کسی اشارے یا کسی اجتہاد و استنباط سے نکلتی ہو۔ جس طرح کی بھی ہدایت ہو، وہ جس امر سے متعلق موجود ہو وہ دین کا دائرہ ہے، اس میں ہمارے فکر و عمل کی آزادی بس اس حد تک ہے کہ ہم اچھی طرح جانچ پرکھ کر دیکھ لیں کہ جو نص ہے وہ اپنے مفہوم و مدعا میں واضح ہے یا نہیں؟ جو حدیث ہے وہ ثابت ہے یا نہیں اور جو استنباط و اجتہاد پیش کیا گیا ہے وہ اپنی کوئی اساس رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ان پہلوؤں سے اس میں کوئی ضعف نہیں ہے تو اس سے انحراف، دین سے انحراف ہے۔

بدعت کا دائرہ

یہی دائرہ ہے جس میں بغیر کسی شرعی دلیل کے محض اپنے جی سے کوئی اضافہ کر دینا اسلام کی اصطلاح میں بدعت ہے اور اس بدعت کو اسلام نے گمراہی اور ضلالت قرار دیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ:

اما بعد، فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم و شر الامور محدثاتھا و کل بدعۃ ضلالۃ۔	یاد رکھو کہ بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے اور بدترین چیزیں وہ بے جوڑ اضافے ہیں جو ان میں کر دیے جائیں، اس طرح کی ہر چیز بدعت ہے

اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

ایک دوسری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں مروی ہے:

قالت قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
علیہ وسلم من احدث	کہ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز
فی امرنا ھذا ما لیس منہ	گھسائی جو اس میں کی نہیں ہے تو وہ شے
فھو رد (متفق علیہ)	مردود ہے۔

یہی بات مسلم شریف میں بایں الفاظ وارد ہوئی ہے:

من عمل عملا لیس	جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کی تائید میں
علیہ امرنا فھو رد	ہمارے دین کی کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ بات
(مسلم)	مردود ہے۔

عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

و ایاکم ومحدثات الامور	اور بدعت کی باتوں سے بچو، کیوں کہ ہر بدعت
فان کل بدعۃ ضلالۃ	گمراہی ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
علیہ وسلم ابغض الناس	کہ تین قسم کے آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک
الی اللہ ثلاثۃ، ملحد	سب سے زیادہ غضب کے مستحق ہیں،
فی الحرم ومبتغ فی	ایک وہ شخص جو عین حرم میں کسی بے دینی
الاسلام سنۃ الجاھلیۃ	کا ارتکاب کرے، دوسرا وہ شخص جو اسلام
ومطلب دم امرئ مسلم	کے اندر جاہلی طریقہ گھسانے کی کوشش
بغیر حق یھریق دمہ	کرے، تیسرا وہ شخص جو ناحق کسی مسلمان
	کی جان کے درپے ہو تاکہ اس کا خون
	بہائے۔

بلال بن حارث مزنیؓ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احیا سنۃ من سنتی قد امیتت فان لہ من الاجر مثل اجور من عمل بہا من غیر ان ینقص من اجورھم شیئًا و من ابتدع بدعۃ ضلالۃ لا یرضاھا اللہ و رسولہ کان علیہ من الاثم مثل اٰثام من عمل بہا لا ینقص ذٰلک من اوزارھم شیئًا۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری سنتوں میں سے کوئی ایسی سنت زندہ کی جو ختم کر دی گئی تھی تو اس کو ان لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو اور جس نے کوئی ایسی بدعت ضلالت ایجاد کی جو اللہ اور رسولؐ کو پسند نہیں ہے تو اس کو اس پر عمل کرنے والوں کے برابر برابر گناہ ہوگا اور اس سے عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

دین کے دائرہ کے اندر اس نوع کی کسی مداخلت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو بات دین کی ہے وہ تو نکال باہر کی جائے اور اس کی جگہ یہ نو ایجاد چیز لے لے جس کے لیے دین میں کوئی سند نہیں ہے۔ اس وجہ سے ایک بدعت کرنے والے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے ہاتھ کا گھر پھینک کر اس کے بجائے کوئی مینگنی اٹھا لے یا اپنے ہاتھ کی مچھلی چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی سانپ پکڑ لے۔ اس حقیقت کی طرف ایک حدیث میں حضورؐ نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلہا من السنۃ فتمسک بسنۃ خیر من احداث بدعۃ۔

(مشکوٰۃ بحوالہ احمد)

جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند ان کے اندر سے ایک سنت اٹھا لی گئی تو ایک سنت کو تھامے رکھنا ایک بدعت ایجاد کر لینے سے کہیں بہتر ہے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بدعت دین کی تخریب کا دوسرا نام ہے جو شخص ایک بدعت قائم کرتا ہے تو گویا ایک سنّت کو ڈھا دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں جس طرح بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے، اسی طرح کسی صاحب بدعت کے ساتھ احترام اور محبت کے تعلق کو ہدمِ اسلام سے تعاون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

من وقر صاحب بدعة فقد	جس نے کسی صاحبِ بدعت کی عزت
اعان علی هدم الاسلام	کی تو گویا اس نے اسلام کے ڈھانے میں
(مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)	تعاون کیا۔

اس تفصیل سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بدعت کا مفہوم کیا ہے؛ یہ ہماری زندگی کے کس دائرہ کے اندر ظہور کرتی ہے؛ شریعت میں یہ کس درجہ کا جرم ہے؛ اور یہ کس طرح علم حق کے آثار اور اس کی نشانیوں کو مٹانے والی ہے۔ اب ہم آگے اس کے اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

بدعت کے دو بڑے سبب

ہمارے نزدیک بدعت کے بڑے سبب دو ہیں۔ ایک غلو پسندی اور دوسرے خواہشات نفس کے لیے شرعی جواز پیدا کرنے کی خواہش۔ اب ہم ان دونوں اسباب کی کتاب و سنّت کی روشنی میں وضاحت کرتے ہیں۔

غلو پسندی

انسان کے اندر یہ ایک عام کمزوری پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق محض عقلی ہی نہیں، بلکہ جذباتی بھی ہوتا ہے، ان کے معاملے میں وہ بسا اوقات غیر متوازن اور غیر معتدل ہو جایا کرتا ہے۔ آدمی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے تو صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس محبت میں وہ ایسا اندھا ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ عداوت بھی کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس اندھے پن میں اس کو خدا کے حقوق کا بھی کچھ ہوش نہیں رہ جاتا۔ اگر اسے اپنے قبیلہ یا قوم یا ملک سے محبت ہے تو ان کی عصبیت اس پر بسا اوقات اتنی غالب آ جاتی ہے کہ وہ ان کے لیے پوری انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کی

حمایت میں خود خدا سے بھی لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے یہی چیز مذہب کے دائرہ میں آکر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کیوں کہ مذہب کے ساتھ اولاً تو عام لوگوں کا تعلق عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے اور اگر عقلی ہوتا بھی ہے تو بھی اس معاملے میں انسان کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عقل کے لیے ان کو ضبط میں رکھنا آسان کام نہیں ہوتا یہ جام وسنداں کی بازی کھیلنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ اس دائرہ کے اندر ایسا بہت ہوتا ہے کہ آدمی کو جس حد پر رک جانا چاہیے وہاں آکر وہ نہیں رکتا بلکہ اس حد کو لانگ کر آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اگر ایک شخص اس کا مرشد ہے تو وہ اس کو مرشد ہی کے درجہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ کسی طرح اس کو رسالت کے مرتبہ پر فائز کر دے۔ اسی طرح اگر ایک ذات کو خدا نے منصب رسالت سے سرفراز فرمایا ہے تو یہ اپنے جوش عقیدت میں یہ چاہے گا کہ اس کو خدا کی صفات میں بھی کچھ نہ کچھ شریک کر دے۔ اگر اس سے کسی کام کا مطالبہ پاؤ سیر کیا گیا ہے تو وہ چاہے گا کہ وہ اس کو بڑھا کر سیر بھر کر دے۔ اس غلو پسندی نے دنیا میں بڑی بڑی بدعتوں کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اسی کے سبب سے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا، اسی کے سبب سے انہوں نے اپنے صوفیوں اور عالموں کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کا درجہ دیا اور یہی چیز تھی جس نے ان کو رہبانیت کے فتنہ میں مبتلا کیا چنانچہ قرآن نے ان کی اس غلو پسندی پر کئی جگہ ان کو ملامت کی ہے۔

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ	اے اہل کتاب، اپنے دین کے معاملے
دِيۡـنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ	میں غلو نہ کرو اور اللہ پر کوئی ایسی بات نہ
اِلَّا الۡحَـقَّ‌ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى	لگاؤ جو حق نہ ہو مسیح عیسیٰ بن مریم تو بس
ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ‌ ۚ	اللہ کے ایک رسول اور اس کے ایک
اَلۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ	کلمہ ہیں اس کلمہ کو اس نے مریم کے اندر ڈالا
مِّنۡهُ‌، فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌،	اور اس کی طرف سے ایک روح ہیں تو
وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ‌ ؕ اِنْتَهُوۡا	اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ
خَيۡرًا لَّـكُمۡ‌ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ	اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس سے باز آؤ

إِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (نساء : ۱۷۱)	یہ تمہارے لیے بہتر ہے ۔ اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے وہ اس عیب سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو ، اسی کے قبضے میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کافی ہے بھروسہ کے لیے ۔

اللہ کی رضا جوئی ہر دین میں بحیثیت اصل نصب العین کے پیش نظر رہی ہے اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ہر مذہب نے ایک معتدل ، اور متوازن پروگرام ، جو قوم کے مناسب حال ہو ، خود تجویز کر دیا ہے ۔ یہ پروگرام نصاریٰ کے پاس بھی موجود تھا اور وہ اس پر کاربند ہو کر اس نصب العین کو حاصل کر سکتے تھے لیکن ان کے علماء اور صوفیاء اتنے ہی پر قانع نہیں ہوئے جتنا حضرت مسیحؑ ان کو بتا گئے تھے بلکہ انھوں نے اپنی حد اس سے آگے بڑھ کر قائم کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں انھوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا ، قرآن نے ان کی اس بدعت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے :

وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۔ (حدید : ۲۷)	اور رہبانیت ، جس کی بدعت انھوں نے خود ایجاد کی ، ہم نے یہ چیز ان کے اوپر فرض نہیں کی ، ان کے اوپر جو چیز فرض کی گئی وہ تو صرف خدا کی رضا جوئی تھی لیکن انھوں نے اس کے حدود کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا ، اور رہبانیت میں مبتلا ہو گئے ۔

مسلمانوں کو اس غلو پسندی کی بیماری سے بچانے کے لیے ایک طرف تو نصاریٰ کی تاریخ سنائی گئی کہ وہ کس طرح اس بیماری کے سبب سے بدعتوں میں مبتلا ہوئے اور پھر اس کے نتیجے میں دین حق کی نعمت سے محروم ہو گئے ، دوسری طرف قرآن و حدیث دونوں میں ان کو افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی ۔

چند احادیث ملاحظہ ہوں :

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین جماعتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو آپ کی عبادت کا حال بتایا گیا تو انہوں نے اس کو اپنے گمان و توقع سے بہت کم پایا۔ وہ بولے کہ ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ، آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب بولے: "میں تو رات بھر نمازیں پڑھا کروں گا۔" دوسرے صاحب نے کہا: "میں برابر روزے رکھوں گا، کبھی افطار نہ کروں گا۔" تیسرے صاحب نے فرمایا: "میں عورتوں سے ہمیشہ دور رہوں گا۔ کبھی شادی نہ کروں گا۔" اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا، "تمہی لوگ تھے جو یہ یہ باتیں کر رہے تھے؛ خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کے حدود کا پاس کرنے والا ہوں، لیکن روزے بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نمازیں پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بیاہ بھی کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقے سے انحراف اختیار کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم و بخاری)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً بعض کام کیے، پھر آپ نے ان کے بارے میں لوگوں کو رخصت دے دی، کچھ لوگوں نے اس رخصت سے فائدہ اٹھانا کچھ اچھا نہیں سمجھا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی تو آپ نے ایک خطبہ دیا، جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا، بعض لوگوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کے کرنے سے احتراز کرتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں؛ خدا کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ اس کا ڈر رکھتا ہوں۔"

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ دین کے معاملے میں اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی، یہ انہی کے بقایا ہیں جن کو تم گرجوں اور خانقاہوں میں دیکھ رہے ہو۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا۔ (الآیۃ)"

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

اس آخری حدیث کے یہ الفاظ کہ: "تم دین کے معاملے میں سختی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے" ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندوں کو نیکی اور تقویٰ کے انہی پیمانوں سے ناپنا چاہتا ہے جو اس نے خود مقرر کر دیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ان پیمانوں کو حقیر ٹھیرا دے اور خود اپنی ایجاد سے کچھ نئے پیمانے بنالے جو اس کے زعم میں خدا کے پیمانوں سے بڑے ہوں تو پھر خدا بھی اس کو ان ہی پیمانوں سے ناپے گا اور اگر وہ خود اپنے ہی مقرر کیے ہوئے پیمانوں پر پورا نہیں اترے گا تو پھر بغیر کسی رعایت کے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ اگر کسی شخص نے زہد، توکل، صبر، رضا اور محبت وغیرہ کے ایسے معیارات بنا لیے ہیں جو خدا اور رسول سے مقرر کیے ہوئے معیارات سے اونچے ہیں تو وہ انہی معیارات سے جانچا جائے گا اور اگر ان پر پورا نہ اترے گا تو کھوٹا قرار پائے گا۔ یہ مطلب ہے اس بات کا کہ "انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی"

لیکن ان نہایت واضح تاکیدات و تنبیہات کے باوجود مسلمانوں کے اندر بھی غلو پسندی کی یہ بیماری پھیلی اور اس سے ہمارے فکر و عمل کے ہر گوشے میں مختلف قسم کی بدعتیں داخل ہو گئیں۔ اس سے عقائد بھی متاثر ہوئے، احکام و قوانین بھی متاثر ہوئے اور عبادات و اخلاق بھی اس کی زد میں آ گئے۔

عقائد و نظریات میں یہ فتنہ بیشتر علم کلام کی راہ سے گھسا اور عبادات و اخلاق میں زیادہ تر تصوف کی راہ سے۔ اس طرح کی ساری چیزوں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتے

کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم صرف مثال کے طور پر اشاعرہ کے جبر، معتزلہ کے نظریۂ اختیار مطلقہ و مجسمہ کے نظریات تعطیل و تجسیم اور حضرات صوفیہ کے نظریہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نجات کے معاملے میں خوارج کی تنگ گیری اور مرجیہ کی بے قیدی اور اباحت بھی اسی قبیل میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلق قرآن کے جس فتنہ کے سبب سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اسی طرح فقہ میں بعض خود ساختہ اصولوں کو اساس بنا کر تخریج در تخریج کا جو سلسلہ شروع ہوا اور خیالی صورتیں فرض کر کر کے جو مسائل پیدا کیے گئے، اس کے سبب سے ہماری فقہ میں بھی ہر باب کے تحت ایسی بے شمار جزئیات داخل ہو گئیں جو زندگی کو بالکل تنگ کر دینے والی اور آدمی کے فکر و عمل کی آزادی کو بالکل سلب کر لینے والی ہیں۔ جو باتیں شریعت نے ہر آدمی کی سمجھ بوجھ پر چھوڑی تھیں اور جن میں وہ اپنی عقل سے کام لے کر ان کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی اختیار کر سکتا تھا ان کی ایک خاص شکل معین کر دی گئی، اور اس کو اس درجہ اہمیت دے دی گئی کہ اس سے معمولی انحراف خود دین سے انحراف سمجھا جانے لگا۔

اس غلو پسندی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان مسائل میں ہوا ہے جو مختلف فقہی مذاہب میں کسی سبب سے مابہ النزاع بن گئے ہیں، یہ مسائل ہیں تو بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے لیکن ہر مسلک کی کتابوں میں اتنی شدومد سے ان پر بحثیں ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اصلی مسائل یہی ہیں اور انسان کی نجات کا تمام تر انحصار انہی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے پر ہے۔ یہ بحثیں ہر مسلک کے حامیوں کی طرف سے تصنیفات و تالیفات میں بھی پورے زور و قوت کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں اور انہی پر ایک ایک مسجد اور ایک ایک مدرسہ میں آئے دن مناظرہ کی مجلسیں بھی گرم ہوتی رہتی ہیں بلکہ بسا اوقات ان کے سبب سے مسلمانوں کے اندر جنگ و جدل، تکفیر و تفسیق، گرفتاری و مقدمہ بازی اور قتل و آتش زنی تک نوبتیں پہنچتی ہیں۔

غلو کے سبب سے عبادات و اخلاق میں زیادہ تر بدعتیں تصوف کی راہ سے آئی

ہیں۔ صوفیہ نے تزکیۂ نفس، تقرب الٰہی اور ذکر و عبادت کی بعض ایسی صورتیں ایجاد کی ہیں جن کا کتاب و سنت میں کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ پُرمشقت ریاضتیں، چلّہ کشی اور عملیات ان کے ہاں ایسی شالیں موجود ہیں جن کا دین میں بہتر ہونا تو درکنار، ان کا جواز بھی مشکل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ ان میں سے بعض کے تو بدعت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک پاؤں سے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ اس طرح کی چیزیں صرف بدعت پسند صوفیوں ہی کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ جو صوفیہ کتاب و سنّت پر عامل ہیں ان کے ہاں اس طرح کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ خیال اگر حقیقت کے مطابق ثابت ہو جائے تو مجھے اس سے نہایت خوشی ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تصوّف کا جو حصہ پاکیزہ ہے بعض چیزیں اس میں بھی ایسی ملتی ہیں جن کے بدعت ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ تصوّرِ شیخ کو محبتِ الٰہی کا ایک زینہ سمجھا گیا ہے اور ہمارے صوفیانہ لٹریچر میں اس کی جو توجیہہ عموماً کی گئی ہے اس کی روشنی میں یہ کتاب و سنت کے صریح خلاف نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے قائل بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لائقِ احترام ہونے میں کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔

صوفیانہ لٹریچر میں اس غلو کا سب سے زیادہ مظاہرہ اس حصے میں ہوا ہے جہاں یہ حضرات صبر، شکر، زہد، قناعت، توکّل، انابت، عبودیت، خشیت اور محبّت و رضا وغیرہ کی تحقیق بیان کرتے ہیں۔ یہ بحثیں آپ تصوّف کی کسی قابلِ اعتماد کتاب میں پڑھیے، میں اس کے لیے رسالۂ قشیریہ، یا قوت القلوب یا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم کے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صوفیانہ لٹریچر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اصلاحِ نفس کے نقطۂ نظر سے ان کتابوں کو نہ صرف پڑھنا بلکہ بار بار پڑھتے رہنا نہایت ضروری ہے، ان کتابوں میں جب آدمی ان مباحث کو پڑھتا ہے تو پہلی نظر میں ان کی دل کشی مسحور کر لیتی ہے لیکن جب آدمی ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے کہ ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی ہے تو پھر وہ اکثر جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں اگرچہ بڑی ہی اعلیٰ، بڑی ہی پاکیزہ اور بڑی ہی زرّیں ہیں لیکن ان کو اپنانا صرف ان ہی بزرگوں کا

کام تھا جنہوں نے یہ لکھی ہیں یا جو گزر چکے ہیں۔ اس زمانے میں انسان کا یہ ظرف نہیں ہے کہ وہ ان مقامات تک پہنچ سکے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے بشری تقاضوں سے دست کش ہوئے بغیر شاید ان کو اپنا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن قیمؒ نے مدارج السالکین میں سلوک کے مقامات پر بحث کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے جو اربابِ تصوف پیش کرتے ہیں تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس مقام کو صحابہؓ بلکہ انبیاء بھی حاصل نہ کر سکے۔

ابن قیمؒ کی مدارج السالکین، جیسا کہ میں اوپر کہیں عرض کر چکا ہوں، ایک مشہور صوفی شیخ ابو اسمٰعیل ہروی کی کتاب منازل السائرین کی شرح اور اس پر ایک قسم کا تبصرہ ہے شیخ ابو اسمٰعیل نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ کی شرح میں یہ طریق اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے تین درجے بیان کرتے ہیں (ہم اس کی بعض مثالیں اس کتاب کی پچھلی فصلوں میں نقل کر آئے ہیں) پہلا درجہ عوام کا، دوسرا درجہ خواص کا، تیسرا درجہ اخص الخواص یا بالفاظ دیگر کاملین و عارفین کا، عموماً پہلے درجے ہی کا معیار وہ ایسا بلند قائم کرتے ہیں کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ قرآن آدمی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے وہ تو بس یہیں تک ہے اور اگر اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر ہے تو دوسرے میں تو وہ بہرحال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف ایک مافوق بشریت درجہ معلوم ہوتا ہے جو شیخ کے نزدیک تو کاملین کا درجہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کتاب و سنّت کو معیارِ کامل مان کر اس کا تجزیہ کرے تو عموماً اس کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس درجے یا اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے تو وہ صرف شیخ کے ذہن میں ہے، نہ کتاب و سنّت میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ عقل اور قیاس کی وہ گرفت میں آتا ہے۔

یہ صورتِ حال آدمی کو سخت حیرانی میں ڈال دیتی ہے اگر وہ یہ مانتے کہ یہ ایک مقام ہے تو سہی لیکن کتاب و سنّت میں اس کا بیان اس وجہ سے نہیں ہوا ہے کہ وہ صرف متوسط درجہ کے لوگوں ہی کی تعلیم کے لیے ہیں جیسا کہ صوفیہ کے ایک گروہ کا خیال ہے۔ تو اس پر کسی ایسے شخص کا دل مطمئن نہیں ہو سکتا جو کتاب و سنّت اور انبیائے کرام ہی کو معیارِ کامل مانتا

ہے۔ اگر وہ خیال کرے کہ اس درجہ کا بیان تو کتاب وسنّت میں ہوا ہے لیکن مدلکلِّ ظھر بطن، کے صوفیانہ نظریہ کے مطابق یہ حقائق کتاب وسنّت کے پردوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں کہ ان تک صرف خاص خاص لوگ ہی پہنچ سکے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے ان تک رسائی نہیں حاصل کی جا سکتی تو اس سے بھی دل کو اطمینان نہیں ملتا کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نظریہ اور باطنیت کے درمیان فرق کیا ہے؟ اگر وہ یہ فرض کرے کہ یہ معیارات بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے تو انبیائے کرام ہی کے ہیں لیکن امت میں ان کے منتقل ہونے اور پھیلنے کے ذریعے سیفنے نہیں بلکہ خواص کے سینے ہیں تو یہ چیز اور بھی متوحش کرتی ہے کیونکہ یہ چیز پورے نظام دین ہی کو ڈھا دیتی ہے۔ اگر وہ مانے کہ ان کے معلوم کرنے کا ذریعہ وحی نہیں بلکہ کشف ہے تو اس سے اور بھی الجھن بڑھتی ہے، کیوں کہ کسی کشف کو وحی کی کسوٹی پر جانچے بغیر بجائے خود سند مان لینا اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو اپنے دین وایمان کے معاملے میں اتنا بے پروا ہو کہ وہ ان کو ہر خواب اور ہر وسوسہ پہ قربان کر سکتا ہو۔

اگر ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں مانی جا سکتی تو آخر اس کے سوا کیا چارۂ کار ہے کہ آدمی یہ مانے کہ جس مقام کی تشریح وتوضیح میں کتاب وسنت کے قائم کردہ معیار سے تجاوز کیا گیا ہے یہ محض غلو کا نتیجہ ہے چنانچہ جگہ جگہ علامہ ابن قیمؒ نے تنقید کر کے دکھایا ہے کہ شیخ ابو اسمٰعیل کے قائم کردہ معیارات کتاب وسنت کے معیارات سے اونچے ہیں اور چوں کہ صحیح انسانی فطرت کے مطابق معیارات وہی ہو سکتے ہیں جو کتاب وسنت میں قائم کیے گئے ہیں اس وجہ سے لازماً یہ معیارات غلط ہیں۔

اس غلو کے سبب سے صوفیائے کرام کے ان معیارات سے یا تو آدمی پہ مایوسی طاری ہو جاتی ہے اور وہ ان کو اپنانے کی ہمت ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو علمی پہلو سے وہ تفلسف اور باطنیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اور عملی پہلو سے جوگ اور رہبانیت کا، علم ومعرفت کی بحث میں ابو اسمٰعیل ہروی کی کتاب سے چند اقتباسات میں اوپر پیش کر آیا ہوں، وہ میرے خیال کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ یہ تو تصوف کے صرف ایک خاص سکول کی ترجمانی ہوئی۔ دوسرے صوفیاء کرام کا طرز فکر اس سے مختلف

ہے تو میری جانب سے اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ جن صوفیائے کرام کا طرزِ عمل اس سے مختلف ہے، جو کتاب و سنت ہی کو معیارِ کامل مانتے ہیں، مجھے ان پر اعتراض نہیں ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ کوئی ایسی کتاب منتخب کیجیے، جس میں ہر مکتبِ خیال کے صوفیوں کی ترجمانی کی گئی ہو اور اس کو اس نقطۂ نظر سے پڑھیے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پھر دیکھیے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔ میرے خیال میں اس مقصد کے لیے رسالہ قشیریہ ایک موزوں کتاب ہے، اس میں ہر باب کے تحت تقریباً اکثر اکابر تصوف کے اقوال و افکار موجود ہیں، اس کو تنقید کے ساتھ پڑھیے تو اس میں بھی قدم قدم پر وہ بے اعتدالی موجود ملے گی، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ میں اس کتاب سے بعض مثالیں پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر واضح کر سکتا ہوں۔ لیکن چونکہ آگے یہ ساری بحثیں تزکیۂ عمل اور تزکیۂ تعلقات و معاملات کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ آ رہی ہیں اس وجہ سے یہاں بیچ راستہ میں ناظرین کو روکنا نہیں چاہتا۔

خواہشاتِ نفس کی پیروی

بدعت کا دوسرا سبب خواہشاتِ نفس کی پیروی ہے۔ انسان کے اندر یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ بسا اوقات وہ ایک نظریہ یا ایک رویہ اختیار تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس کی خواہشاتِ نفس کے مطابق ہوتا ہے، اس سے اس کے کسی مخفی منصوبے کی تکمیل ہو رہی ہوتی ہے، اس سے کسی ایسے شخص کی خوشنودی اسے حاصل ہوتی ہے جس کی خوشنودی اسے اپنے دنیوی اغراض کے نقطۂ نظر سے مطلوب ہوتی ہے، اس سے اس کے وہ ارمان پورے ہوتے ہیں جو نفس کی اکساہٹ سے اس کے اندر ہر وقت گدگدیاں پیدا کر رہے ہوتے ہیں، لیکن وہ اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتا کہ ان چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ صاف صاف نفس پرستی اور دنیا پرستی کے نام سے میدان میں اُترے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی اس دنیاداری اور نفس پرستی کے لیے دین داری کی کوئی آڑ بھی تلاش کرے تاکہ رند کا رند بھی رہ سکے اور ہاتھ سے جنت نہ جانے پائے اس خواہش کے تحت وہ مختلف قسم کے نظریات بناتا ہے اور ان کو مذہب کے اندر گھسانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر گھسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ان سے اپنی

خواہشوں کے بند دروازوں کے کھولنے میں کلید کا کام دیتا ہے۔ یہ خواہشاتِ نفس کے تحت فتویٰ لکھتا ہے اور ان کو کتاب وسنّت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ بعض سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بہت سے کام کرتا ہے اور ان کو معرفتِ الٰہی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بتاتا ہے۔

یہود نے جب چاہا کہ اپنی نفس پرستیوں کے لیے کوئی شرعی سندِ جواز پیدا کریں تو انہوں نے یہ نظریہ بنایا کہ ہم چونکہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں، اس وجہ سے ہم خواہ کچھ بھی کر گزریں، ہمارے لیے دائمی عذابِ دوزخ نہیں ہے اوّل تو ہم دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے لیکن اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ اپنے اس نظریے کو، جو محض نفس پرستی کی تحریک سے پیدا ہوا تھا، انہوں نے اپنے دین میں گھسا دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی ساری شریعت ان کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھل گئی، اس کے اندر جو حقوق اور جو درجے اور مرتبے ان کے لیے بیان ہوتے تھے ان کا تو وہ اپنے آپ کو پورا پورا موروثی حق دار سمجھتے تھے لیکن جو ذمّہ داریاں اس میں بیان ہوئی تھیں، ان کی سرے سے ان کو کوئی پرواہی نہیں رہ گئی تھی، وہ اپنے مذکورہ نظریہ کی بدولت جزا اور سزا اور دوزخ کی فکر سے بالکل فارغ البال ہو گئے تھے، اس وجہ سے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کو اپنی خواہشوں کا ایک مجموعہ سمجھ رکھا ہے جس میں وہی باتیں لکھی ہوئی ہیں جو ان کے نفس کو پسند ہیں۔

اسی طرح جب ان کے اندر سود کا رواج ہوا تو انہوں نے یہ نظریہ پیدا کیا کہ سود اگر حرام ہے تو خود اپنی قوم کے افراد یعنی بنی اسرائیل سے لینا حرام ہے نہ کہ دوسری کافر قوموں سے، اس نظریہ کو انہوں نے اپنے دین میں گھسایا اور پھر اس راہ سے انہوں نے اپنے سارے سودی کاروبار کو جائز کر لیا۔

اسی طرح عیسائیوں میں پال نے جب رومیوں میں عیسائیت کو مرغوب و مقبول بنانا چاہا تو اس نے سود اور شراب کو جائز قرار دے دیا اور اس کے لیے دلیل یہ دی کہ سود اور شراب کی حرمت اگر وارد ہے تو تورات میں وارد ہے نہ کہ انجیل میں، اس وجہ

سے بنی اسرائیل کے افراد کے لیے تو یہ چیزیں بے شک ناجائز ہیں لیکن دوسری قوموں کے جو لوگ مسیحیت قبول کریں، ان کے لیے اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسلمانوں پر اتباعِ ہوا کے تحت بدعتوں کا حملہ مختلف طرف سے ہوا سب سے زیادہ یہ جنس باطنیہ نے پیدا کی، انہوں نے شریعت کی تمام قیود سے اپنے آپ کو آزاد کر لینے اور خواہشاتِ نفس کی پوری پوری چھوٹ دے دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شریعت کی تمام اصطلاحات کا مفہوم ہی یکسر بدل کے رکھ دیا ان کی تعریف کے لحاظ سے نہ نبی نبی رہا، نہ قرآن قرآن اور نہ روزہ روزہ رہا اور نہ نماز نماز، ہر چیز کے ظاہر و باطن کو انہوں نے اس طرح مسخ کر دیا کہ شریعت کا پورا حلیہ ہی بگڑ کے رہ گیا۔ مثلاً نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوتِ قدسیہ کا فیضان ہوا، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف لوٹ آنا ہے۔ جنابت سے مراد افشائے راز ہے غسل سے مراد تجدید عہد ہے۔ زنا سے مراد علمِ باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا ہے جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہبِ باطنیہ کے سوا ہر مذہب سے برأت ہے صلوٰۃ سے مراد امامِ وقت کی طرف دعوت زکوٰۃ سے مراد ذی صلاحیت لوگوں میں علم کی اشاعت ہے۔ فرقہ اسمٰعیلیہ اور بابیوں بہائیوں کا سارا انتظام اسی طرح کے عجائب و غرائب پر کھڑا ہے۔ شیعوں کے ہاں متعہ اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ قادیانیوں نے بھی باطنیہ سے بہت کچھ لیا ہے۔

لیکن اس زمانہ میں باطنیہ کے حقیقی وارث منکرینِ حدیث ہیں۔ انہوں نے سنت کا انکار کرنے کے بعد تمام شرعی اصطلاحات، روزہ، نماز، حج، قربانی، جنت، دوزخ اور آخرت وغیرہ کی جو تاویلیں کرنی شروع کی ہیں، ان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے مقصد اور باطنیہ کے مقصد، ان کے طریقِ تاویل اور باطنیہ کے طریقِ تاویل میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔ آپ باطنیہ کے نظریات و عقائد اور ان کے نظریات و عقائد، ان کی تاویلیں اور باطنیہ کی تاویلیں آمنے سامنے رکھ دیجیے تو یہ حقیقت آپ پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک ہی اب وجد کی اولاد اور ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔

اسی اتباعِ ہوا کا ایک مظہر ہمارے بعض اہل علم کا یہ نظریہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے جرموں اور گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ اسی دنیا کے مصائب و شدائد کے ذریعہ سے پوری کر دیتا ہے، دوزخ کی سزا ان کے لیے نہیں ہے، نیز بے علم اور کم عقل عوام کے ساتھ آخرت میں وہ معاملہ ہوگا جو کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کو جزا و سزا کی اس کسوٹی پر نہیں پرکھا جائیگا جس کا ذکر قرآن و حدیث میں ہوا ہے

یہ نظریہ یہودیوں کے اس نظریہ سے بالکل مشابہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہم کو دوزخ کی آگ چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی اور اس نظریہ نے ان کو شریعت کی حدود توڑنے کے لیے بالکل بے خوف و بے باک بنا دیا تھا، اسی طرح ہمارے ان نئے متکلمین نے بھی یہ نظریات عوام کو ان کی بیخبری اور شریعت سے بے پروائی پر مطمئن رکھنے کے لیے ایجاد فرمایا ہے تاکہ لوگ جس غلط روش پر ہیں، اس پر جمے رہنے کے لیے ان کو ایک عقیدہ کا سہارا فراہم کر دیا جائے اور آخرت کی باز پُرس کی جو خلش بعض اوقات ستاتی رہتی ہے اس سے کم از کم حیلہ جو طبیعتوں کو بالکل ہی رہائی مل جائے۔

رخصت اور غنیمت کا فلسفہ بھی کم از کم اپنی موجود صورت میں، اتباعِ ہوا کا ایک مظہر ہے۔ دین کے اکثر مطالبات کے جواب میں آج بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان مطالبات کے دین کے مطالبات ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن حالات و مصالح کے تحت اسلام نے آخر رخصت سے بھی تو فائدہ اُٹھانے کا حق دیا ہے، موجودہ زمانہ چونکہ ان باتوں کے لیے سازگار نہیں ہے، اس وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

حلقہائے تصوف سے وابستہ لوگوں کی جو بدعتیں اتباعِ ہوا کے تحت آتی ہیں وہ یوں تو بہت سی ہیں لیکن دو چیزیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو ساز کے ساتھ نغمہ کی بدعت، دوسری یہ بدعت کہ بہت سے لوگ اس وسوسہ میں مبتلا ہو کر کہ وہ خدا رسیدہ ہو چکے ہیں، اپنے آپ کو شریعت کی تمام پابندیوں اور ذمہ داریوں سے یک قلم آزاد کر لیتے ہیں۔ خانقاہوں اور

مزارات پر اور عرسوں میں جو صریح منکر باتیں ہوتی ہیں ان کا حوالہ میں اس وجہ سے نہیں دیتا کہ ان چیزوں کی ذمہ داری تصوف کے حامیوں کی طرف سے عمومًا عوام پر ڈال دی جاتی ہے لیکن مذکورہ دونوں چیزوں کے متعلق تو یہ عذر کسی طرح نہیں پیش کیا جا سکتا۔

فقہی طرز کی جو بدعتیں آج محض ہوا پرستی کی تحریک سے سامنے آ رہی ہیں ان کا ایک بہترین نمونہ عائلی کمیشن کی وہ رپورٹ ہے جو مسلمانوں کے ازدواجی مسائل سے متعلق حکومت پاکستان کے ایک مقرر کردہ کمیشن نے پیش کی ہے۔ اس رپورٹ کے مرتبین نے دعویٰ تو قدم قدم پر یہ کیا ہے کہ اس میں انہوں نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام تر کتاب و سنت پر مبنی ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس میں بیشتر مغربی ملکوں کے ازدواجی قوانین کی نقالی کی گئی ہے اور ان کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے شرعی احکام کو پوری بیباکی کے ساتھ توڑا مروڑا گیا ہے۔

علاج

بدعت کے اسباب واضح ہو جانے کے بعد اس کا علاج خود بخود سامنے آ گیا وہ یہ کہ آدمی پوری مضبوطی کے ساتھ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت پر قائم رہنے اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے کا اہتمام و التزام کرے۔ جس چیز کی جو حد کتاب و سنت میں قائم کر دی گئی ہے اس میں نہ کوئی زیادتی کرے نہ کوئی کمی جس کا جو مرتبہ شریعت میں متعین کر دیا گیا ہے اس سے اس کا مرتبہ نہ اونچا کرنے کی کوشش کرے نہ نیچا، جو چیز دین میں جتنی مقدار میں مطلوب ہے اس میں محض اپنے جی سے نہ کوئی اضافہ کرے نہ کوئی تخفیف ــــــ اسی طرح اپنی خواہشوں میں سے کسی خواہش کو شریعت کا جامہ پہنانے کی کوشش نہ کرے، اپنے من گھڑت نظریات کو، دین میں نہ گھسائے، اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کو قرآن و حدیث کے نام سے پیش کرنے کا خواہش مند نہ بنے ــــــ یہ کام کہنے میں آسان ہے لیکن کرنے میں بڑا مشکل ہے۔ اس زمانہ میں حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ شریعت نے جن چیزوں کو منکر قرار دیا ہے وہ سوسائٹی میں معروف بن چکی ہیں اور جن چیزوں کو شریعت نے معروف بنایا ہے وہ منکر قرار دے دی گئی ہیں۔ اس فساد حال کے سبب سے اگر کوئی شخص صحیح سنت پر قائم رہنا چاہے تو وہ سوسائٹی میں بالکل نکو بن کے رہ جاتا ہے، ہر جگہ اس کا

مذاق اڑایا جاتا ہے، ہر مجلس میں وہ خود بھی اپنے آپ کو اجنبی اور بے گانہ محسوس کرتا ہے اور دوسرے بھی اس کو اجنبی اور بے گانہ محسوس کرتے ہیں اور اگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اصلاح کی بھی کوشش کرے تو یہ بے گانگی فوراً اختلاف اور کشمکش کی صورت اختیار کر لیتی ہے پھر ہر جگہ اس کے خلاف ایک محاذِ جنگ قائم ہو جاتا ہے، یگانے اور بے گانے دونوں ہی اس سے الجھتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں، عزیز اور دوست دشمن بن جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں جو یا تو پہلے سے اس کے ہم خیال و ہم مسلک ہوں یا اس کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اس کے ہم خیال بن چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا معمولی عزم و ہمت کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دوسروں کی ناراضگیاں مول لے سکتے ہیں جو حق کے لیے رشتوں اور قرابتوں سے بے پروا ہو سکتے ہوں، جو اللہ کے لیے ہر طرح کا نقصان گوارا کر سکتے ہوں اور جو بدعت کے مقابل میں سنت کی حمایت و نصرت کے لیے پہاڑ کی طرح مضبوط ہو کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

اس راہ میں آدمی کو سب سے زیادہ قیمتی راہنمائی حضرات انبیاء علیہم السلام اور حضرات صحابہؓ کی زندگیوں کے عملی نمونوں سے ملتی ہے، اگر آدمی انبیاء اور صحابہؓ کے حالات کا برابر مطالعہ کرتا رہے تو بدعات سے لڑنے کے لیے اس کے اندر برابر حرارت قائم رہتی ہے۔ اس امت میں سنت کے اہتمام اور بدعت کی مخالفت کے پہلو سے صحابہؓ کے بعد میرے نزدیک سب سے اونچا درجہ حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ ان کی زندگی سراپا سنت ہے اور ان کا ایک ایک قول و فعل بدعت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت۔ جب آدمی ان کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے تو سنت کی حمایت اور بدعت کی مخالفت کے جذبہ سے اس کا دل سرشار ہو جاتا ہے جو لوگ اپنے اندر اس جذبہ کو زندہ رکھنا چاہیں، میں ان کو حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے کا مشورہ دوں گا۔

تزکیۂ عمل

تزکیہ عمل

علم کے تزکیہ کے بعد عمل کے تزکیہ کی باری آتی ہے۔ عمل کے تزکیہ سے مطلب یہ ہے کہ عمل بجائے خود بھی ٹھیک ہو اور اس کا محرک بھی ٹھیک ہو، محرک کو کسی عمل کی پاکیزگی میں سب سے زیادہ دخل ہوا کرتا ہے۔ بسا اوقات ایک عمل ظاہر میں بڑا معصومانہ نظر آتا ہے لیکن تحقیق کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس کا محرک نہایت مکروہ، اور گھناؤنا ہے، اسی طرح بعض اوقات ایک ڈاکٹر ایک مریض کا کوئی عضو کاٹ کر اس کے جسم سے علیحدہ کر دیتا ہے بظاہر یہ فعل نہایت ظالمانہ ہے لیکن اس کے اس فعل کو کوئی شخص بھی برا نہیں کہتا کیونکہ اس نے یہ کام مریض کے بقیہ اعضاء کو عضوِ فاسد کے زہر سے بچانے کے لیے کیا ہے۔ کارپوریشن ایک بنی بنائی عمارت کو منہدم کرا دیتی ہے۔ بظاہر یہ ایک غلط اور نقصان رساں کام ہوتا ہے لیکن اس کے اس اقدام پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا کیوں کہ اس مکان کے انہدام میں ایک پورے شہر کی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اس کے برعکس ایک شخص یتیم خانہ قائم کرتا ہے، مسجد تعمیر کراتا ہے، مدرسے بنواتا ہے بظاہر میں یہ سارے کام دین کی اور قوم کی خدمت کے کام ہیں لیکن ثابت ہو جائے کہ یہ سارے کام محض دین بازی اور زر اندوزی کے لیے کیے گئے ہیں تو کسی شخص کی نظر میں بھی ان کاموں کی

کوئی وقعت نہیں ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اعمال کے بارہ میں نیّت کو بڑی اہمیت دی ہے کسی شخص کا نیک سے نیک عمل بھی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں پاتا اگر وہ نیت کی نیکی کے ساتھ انجام نہ دیا گیا ہو، اور ایک آدمی اپنے بُرے سے بُرے عمل کے مواخذہ سے بھی بچ جائے گا اگر وہ عمل اس سے بلا ارادہ و نیّت کے صادر ہو گیا ہو یا نیّت تو اچھی رہی ہو لیکن کسی غلطی کے سبب سے فعل غلط صادر ہو گیا ہو۔

انسان کے کسی قول و فعل سے متعلق نیّت اور محرک کا سوال ایک لازمی نتیجہ ہے اس کے ایک ذی ارادہ اور ذی اختیار ہستی ہونے کا۔ انسان کوئی پتھر، کوئی درخت یا کوئی جانور نہیں ہے کہ اس کی صرف ظاہری حرکتوں ہی کو دیکھا جائے۔ ان حرکتوں کے پیچھے جو محرکات ہیں، ان کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے اگر محرکات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک انسان اور ایک حیوان میں فرق ہی کیا رہا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں انسان کے صرف انہی اعمال کی اہمیت ہے جو ارادہ اور نیت کے تحت صادر ہوئے ہوں جو اعمال جبر و اکراہ یا سہو یا بلا کسی قصد و ارادہ کے صادر ہو جاتے ہیں، اسلام ان کی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہی اعمال ہیں جن کی خدا کے ہاں قبولیت یا عدم قبولیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر آدمی نے کسی کام کو نیک نیت اور نیک محرک کے تحت کیا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کے اس عمل کو قبول فرمائے گا اور اگر اس نے کسی کام کو بُرے محرک کے تحت کیا ہے تو خواہ وہ عمل بظاہر کتنا ہی اچھا ہو لیکن وہ اصل محرک کے کھاتے ہی میں محسوب ہو گا۔ یہی حقیقت بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

> حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیّت پر ہے، ہر آدمی کے سامنے اس کی نیت ہی آئیگی جس نے اپنی ہجرت اللہ اور رسولؐ کے لیے کی تو اس کی ہجرت فی الواقع اللہ اور رسولؐ کے لیے ہے لیکن جس کی ہجرت کسی غرض دنیوی کے لیے ہے جس کو وہ

حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کے لیے ہے، جس سے وہ شادی کا طالب ہے تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کے لیے اس نے فی الواقع ہجرت کی ہے۔ (ریاض الصالحین، باب الاخلاص)

اسلام میں اس نیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بسا اوقات ایک آدمی ایک برائی کا ارتکاب نہیں کرتا لیکن خدا کے ہاں وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لی جاتی ہے کیوں کہ وہ اس کے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اسی طرح بسا اوقات وہ ایک نیکی کے کرنے کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہے لیکن وہ بھی اس کے نامۂ اعمال میں درج ہو جاتی ہے کیوں کہ وہ اس کے کرنے کی دل سے آرزو رکھتا تھا لیکن کسی رکاوٹ کے سبب سے وہ اس آرزو کو پورا نہ کر سکا۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں جن سے ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے۔

"ابو بکرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ میں نے عرض کی کہ جو قاتل ہے اس کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے یا رسول اللہ! لیکن یہ مقتول کیوں جہنم میں جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا اس لیے کہ وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔"

(ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین۔ ص ۸)

دوسری حدیث جو نیک ارادہ سے متعلق ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے لوٹ رہے تھے کہ ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا حال یہ رہا ہے کہ ہم نے جو گھاٹی بھی پار کی اور جس وادی سے بھی ہم گزرے ہیں اس میں وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو کسی عذر کے سبب سے رکنا پڑا ہے۔"

(ریاض الصالحین)

(بحوالہ بخاری)

عمل کے محرکات

نیت اور محرک کی اس اہمیت کے واضح ہو جانے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنا اچھی طرح نفسیاتی تجزیہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ہمارے اندر وہ کیا کیا محرکات ہیں، جو ہمیں کسی عمل پر اکساتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ محرکات ظاہر میں تو بہت نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے ان کا جائزہ لیا جائے تو ان سب کو پانچ بنیادی محرکات کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں:

ضروریات، خواہشات، شہوات، جذبات، نفس ناطقہ۔ یا رُوحِ ملکوتی۔

مناسب ہو گا کہ اختصار کے ساتھ ان محرکات کا ہم تعارف بھی کرا دیں۔

ضروریات سے ہماری مراد زندگی کی وہ ابتدائی اور بنیادی ضروریات ہیں جن کے فراہم ہونے ہی پر ہماری ذات کا بقا منحصر ہے۔ یہ ضروریات انسان کو بہت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں، مثلاً اسے بھوک لگتی ہے تو وہ کھانا کھاتا ہے۔ پیاس لگتی ہے تو پانی پیتا ہے۔ تن ڈھانکنے کے لیے لباس پہنتا ہے۔ خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے اور اسلحہ تیار کرتا ہے۔ موسم کی ناہمواریوں اور ناسازگاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے غذا کے ذخیرے جمع کرتا ہے۔ سردی، گرمی اور برسات کی تکلیفوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے مکان بناتا ہے۔

خواہشات کی منزل ضروریات سے ایک قدم آگے ہے مثلاً کھانے پینے اور پہننے کی جہاں تک اصل ضرورت کا تعلق ہے وہ تو بہت معمولی غذا اور نہایت موٹے جھوٹے اور کھردرے کپڑوں سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن انسان کی فطرت کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ صرف کسی نہ کسی طرح پیٹ پال لینا ہی نہیں چاہتا بلکہ قسم قسم کے لذیذ کھانوں اور لذیذ مشروبات کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ وہ صرف تن ڈھانکنے ہی پر کفایت نہیں کرتا بلکہ آرائش و زیبائش کا ذوق و شوق بھی رکھتا ہے، وہ صرف گرمی اور برسات سے بچنے کے لیے اپنے سر پر ایک چھت ہی نہیں چاہتا ہے بلکہ آراستہ و پیراستہ کوٹھیوں اور بنگلوں کی خواہشیں

بھی رکھتا ہے۔ یہی خواہشیں ہیں جو انسان کو ہزاروں لاکھوں کام کرنے پر آمادہ کرتی ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو اس دنیا کی ساری چہل پہل انسان کی ان خواہشوں ہی کی پیدا کردہ ہے تعلیم و تہذیب، اور تمدن و ترقی کے ناموں سے آج جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب انہی خواہشوں کے جلوے اور کرشمے ہیں۔ آرٹ اور صنعت و حرفت کے جو مظاہر آپ دیکھ رہے ہیں سب کی تہہ میں یہی خواہشیں کام کر رہی ہیں، یہی خواہشیں ہیں جو ایک خاص قسم کے نظام اخلاق کو وجود میں لاتی ہیں جس میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ عزت و شہرت کی خواہش، بقائے دوام کی آرزو تفوق اور غلبہ کی کش مکش اور مقابلہ اور تنافس کی کشاکش کو حاصل ہوتی ہے۔

شہوات کو اگرچہ خواہشات کے عنوان کے تحت بھی لایا جا سکتا تھا لیکن ہم نے اس کا ذکر ایک مستقل محرک کی حیثیت سے اس وجہ سے کرنا مناسب خیال کیا کہ اس میں اصل خواہش جنس کی ہوتی ہے۔ اس مرکزی خواہش سے دوسری خواہشیں جو ابھرتی ہیں ان سب کی حیثیت اسی خواہش کے لوازم و توابع کی ہوتی ہے۔ اگرچہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں انسان کے وہ کیا کیا اقدامات ہیں جو محض اس کی شہوات کے مظاہر ہیں، کیونکہ اس میں بہت کچھ اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن اس بدیہی حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آج آرٹ میں، صنعت میں، ادب میں اور معاشرت و تمدن میں جو نمایاں مقام اس محرک کو حاصل ہے، شاید ہی کسی دوسرے محرک کو حاصل ہو۔

جذبات سے ہماری مراد محبت و ہمدردی، نفرت و عداوت، رشک و حسد، غیرت و حمیت، غصہ و انتقام وغیرہ کے جذبات ہیں۔ یہ جذبات نفسِ انسانی کے اندر بڑی گہری جڑیں رکھتے ہیں اور جب ظاہر ہوتے ہیں تو بڑے زور و قوت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ انسان کو کسی عمل پر ابھارنے میں ان جذبات کو نہایت مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے انسان کے بہت سے بھلے اور برے کام انہی جذبات کے مظاہر ہیں۔ ان کی مثال بھاپ کی سی ہے۔ بھاپ کو اگر صحیح طور پر کنٹرول میں رکھا جائے تو اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ اگر کنٹرول میں نہ رکھا جا سکے تو اس سے بہت سے خطرات بھی ظہور میں آ سکتے ہیں۔ جذبات بھی آدمی کے اندر بڑی طاقت ہیں، بشرطیکہ انسان ان پر قابو

رکھ سکے، اگر ان کو قابو نہ رکھ سکے تو پھر ان سے زیادہ مہلک بھی کوئی اور چیز نہیں۔

نفسِ ناطقہ یا روح ملکوتی سے ہماری مراد وہ نورِ یزدانی (DIVINE SPARK) ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ڈالا ہے، اور جس کو قرآن مجید میں نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (اور انسان میں میں نے اپنی روح پھونکی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی نورِ یزدانی سے مشرف ہونے کے بعد انسان فرشتوں کا مسجود بنا۔ یہی چیز ہے جس سے اس کو خیر اور شر کی معرفت حاصل ہوئی اور اس میں اعلیٰ اقدار کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ نور چونکہ انسان کو زمین سے نہیں بلکہ آسمان سے ملا ہے، اس وجہ سے اس کی لپک ہمیشہ خدا کی طرف رہتی ہے اور اگر نفس کے سفلی تقاضوں کے حجابات بہت سخت نہ ہوں تو یہ ہمیشہ انسان کو اوپر کی طرف اٹھاتا ہے۔ انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا، جو اس کو حیوانات سے ممتاز کرتے ہیں، سرچشمہ یہی ہے۔ اسی نور کی وجہ سے انسان عقل کی راہنمائی سے نوازا گیا اور وحی و الہام کی ہدایت کے لائق ٹھیرا۔ یہ ایک ملکوتی محرک ہے جو انسان کو اعلیٰ کاموں پر ابھارتا ہے اور جب انسان کوئی اعلیٰ کام انجام دیتا ہے تو اس پر اس کی تحسین کرتا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور اگر کوئی بُرا کام کر گزرتا ہے تو اس بُرے کام پر اس کو ملامت بھی کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو نفسِ لوامہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورۂ قیامۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اس کو ایک روزِ جزا و سزا کے ثبوت میں ایک نہایت اہم انفسی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جو لوگ ڈارون کے مادہ پرستانہ نظریۂ ارتقاء کے اندھے بہرے معتقد ہیں، وہ انسان کے اس باطنی نور سے بالکل بے خبر ہیں اور یہی بے خبری ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے بہت سے میلانات کی یا تو سرے سے کوئی توجیہہ کر ہی نہیں پاتے یا کرتے ہیں تو بالکل غلط کرتے ہیں۔ یہ لوگ ارتقاء کی بعض گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں حالانکہ اصل کڑی جس کی انہیں جستجو کرنی چاہیے یہ ہے جس کی نشان دہی قرآن کر رہا ہے۔

مذکورہ محرکات کی حیثیت

یہی محرکات ہیں جو انسان کی تمام عملی سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ اگر انسان کے اعمال کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کا ہر عمل انہی محرکات میں سے کسی نہ کسی محرک سے وابستہ نکلے گا۔

ان محرکات کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا انسان کے لیے

یہ عقلاً و اخلاقاً مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان محرکات کے حوالے کرے اور یہ اس کو جس جس کوچہ اور جس جس وادی میں لیے پھرے وہ پھرتا رہے اگرچہ دنیا میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنی باگیں اپنی خواہشوں اور اپنے جذبات ہی کے حوالہ کر چھوڑی ہیں لیکن کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے مذکورہ بالا سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا، بلکہ ہر شخص یہی جواب دے گا کہ ان میں کوئی محرک بھی ایسا قابلِ اعتماد نہیں ہے کہ آدمی آنکھ بند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اُوپر کے چار محرکات، ضروریات، خواہشات، شہوات، جذبات۔ تو بالکل اندھے واقع ہوئے ہیں۔ یہ صرف اپنے تقاضے کو پورا کرنا اور اپنے مطلوب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ جائز طریقہ سے حاصل کیے جائیں یا ناجائز طریقہ سے جائز و ناجائز اور حرام و حلال کی انہیں سرے سے کوئی تمیز ہی نہیں ہے۔ یہ صرف اپنی تشنگی کے لیے سیرابی اور اپنی بھوک کے لیے غذا چاہتے ہیں اور اسی طرح چاہتے ہیں جس طرح ایک بیل، ایک گھوڑا اور ایک گدھا چاہتا ہے، وہ اس چاہنے میں نہ کسی قانونی حد کے پابند ہیں نہ کسی اخلاقی حد کے۔ جس حوض اور جس چراگاہ سے بھی ان کی ضرورت پوری ہو جانے کا امکان نظر آئے یہ ان کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں۔ یہ قناعت و ایثار اور اعتدال وغیرہ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں جس طرح ایک گدھے کے پاس ہر چیز کے ناپنے اور تولنے کا پیمانہ صرف اس کا پیٹ ہی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہر چیز کو بطن اور فرج ہی کے پیمانے سے ناپتے اور تولتے ہیں جن لوگوں کی زندگیاں ان محرکات کے تحت گزرتی ہیں اور وہ ان سے بالاتر کسی شرعی و اخلاقی محرک کے قائل نہیں ہیں وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے کہ:

یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ۔ ان کا کھانا پینا اسی طرح ہے جس طرح چوپایوں کا۔

ان میں سے پانچواں محرک بلاشبہ اس اعتبار سے قابلِ اعتماد ہے کہ یہ ایک عقلی اور اخلاقی محرک ہے، اس کی روح ملکوتی اور اس کی پرواز ہمیشہ خدا کی طرف ہے۔ اس وجہ سے اس سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ انسان کو اس دنیا کی کسی دلدل میں پھنسا دے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام خوبیوں کے ساتھ ایک نقص اس کے اندر بھی ہے اور وہ ہے اس کے مزاج کا یک رخاپن۔ اپنے اس یک رُخے پن کے سبب سے اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی رو پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا جائے

تو یہ دوسرے محرکات کے ساتھ کوئی رواداری برتنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات ان کو نہ صرف نظر انداز کر کے بلکہ ان کو کچلتا اور پامال کرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اسی سے زندگی کے اندر وہ ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں جس کے مظاہر ہم جوگیوں، راہبوں اور درویشوں کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔

خامیوں کا علاج

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان محرکات میں سے کوئی محرک بھی ایسا نہیں ہے جس پر آدمی پورا پورا اعتماد کر سکے۔ بعض اعتبارات سے اگر ان میں خوبیاں ہیں تو دوسرے پہلوؤں سے ان میں خرابیاں بھی ہیں۔ ہماری زندگی کی گاڑی کو پیچھے سے دھکیلتے رہنے کے لیے تو ان کا وجود نہایت ضروری ہے لیکن گاڑی میں جو جگہ ڈرائیور کی ہے اگر اس جگہ بھی انہی کو مسلط کر دیا جائے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اندھے راہ دکھانے والے گاڑی کو کس کھڈ میں گرائیں۔

لیکن اگر یہ محرکات زندگی کے لیے ناگزیر بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر نقائص بھی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا طریقہ ہے کہ یہ اس افراط و تفریط سے پاک ہو سکیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے؟

افراط و تفریط سے پاک ہونے کے لیے اسلام نے دو باتیں ضروری قرار دی ہیں:

ایک یہ کہ ہمارے تمام محرکات کا حقیقی مطلوب اور اصلی نصب العین خدا کی رضا جوئی ہو۔ دوسری یہ کہ محرکات شتر بے مہار نہ ہوں بلکہ اپنی تمام سرگرمیوں میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدود اور اس کی اتاری ہوئی شریعت کے قوانین کے پابند ہوں۔

خدا کی رضا جوئی کے نصب العین بن جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے محرکات اپنے تمام مادی تقاضوں اور مطالبات سے دست بردار ہو جائیں گے، ان کے مادی تقاضے اور مطالبات بدستور قائم رہیں گے لیکن فرق یہ ہوگا کہ اب تک ان کی طلب اگر نفس کو خوش کرنے کے لیے تھی تو اب ان کی طلب خدا کو خوش کرنے کے لیے ہوگی۔ اب تک ہم جو کھاتے پہنتے تھے تو اس لیے کہ نفس کا مطالبہ ہے لیکن نصب العین کے تبدیل ہو جانے کے بعد اس لیے کھائیں گے اور پہنیں گے کہ ہمارے رب کا حکم ہے۔ اب تک بیوی بچوں سے دلچسپی تھی تو اپنے نفس کی لذت و راحت کے لیے تھی لیکن اب ہوگی تو اس لیے کہ اس سے خدا راضی ہو۔ اب تک اگر کسی سے نفرت یا محبت تھی تو اپنے لیے تھی۔ اب اگر محبت ہوگی تو وہ بھی خدا کے لیے اور نفرت ہوگی تو وہ بھی خدا کے لیے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ یہ تبدیلی ایک ظاہری تبدیلی ہے یا کوئی معمولی تبدیلی ہے۔ یہ بڑی اہم تبدیلی ہے جو فعل جس کی خاطر انجام دیا جائے گا اسی کا ذوق اور اسی کی پسند اس میں سب سے زیادہ نمایاں ہو گی۔ دوسروں کی پسند اور ناپسند کا لحاظ اس میں یا تو سرے سے ہو گا ہی نہیں یا ہو گا تو بس اسی قدر جس قدر کہ ان کی پسند اصل پسند کرنے والے کی پسند کے موافق ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ بڑا فرق ہے اس غصہ میں جو ہم اپنے نفس کا انتقام لینے کے لیے کسی پر ظاہر کرتے ہیں اور اس غصہ میں جو ہم خدا کے کسی قانون کی بے حرمتی اور اس کی شریعت کی کسی اہانت پر ظاہر کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے اسلام میں ہمارے افعال و اعمال میں سے صرف وہی اعمال و افعال مقبول ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے نصب العین کے تحت انجام دیے گئے ہوں۔ اگر نصب العین یہ نہ ہو تو ایک عمل ظاہر میں کتنا ہی پاکیزہ ہو لیکن خدا کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نصب العین کے ساتھ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنا بھی عبادت ہے لیکن اگر نصب العین بدل جائے تو جہاد بھی نری دنیاداری بن کے رہ جاتا ہے۔ دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

"جو کچھ بھی تم خدا کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرو گے، اس پر اللہ کے ہاں اجر پاؤ گے یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی اجر پاؤ گے جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔"

(ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین)

ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص شجاعت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے۔ دوسرا شخص حمیت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، تیسرا شخص ریا کی وجہ سے جنگ کرتا ہے، ان میں سے کس کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں صرف اس کی جنگ ہے جو اس لیے لڑے کہ خدا کے دین کا بول بالا ہو۔"

(متفق علیہ)

خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کے معنی یہ ہیں کہ ان محرکات کو بگٹٹ ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر آگے بڑھتے ہوئے چلے جانے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے بلکہ ان کے منہ میں شریعت کی لگام لگائی جائے اور ان کے پاؤں میں حدود الٰہی کی زنجیریں ڈالی جائیں۔ خدا نے کھانے

پینے پہننے، شہوانی تقاضے پورے کرنے، محبت کرنے، نفرت کرنے، حتیٰ کہ عبادت کرنے تک پر بھی بہت سی شرطیں اور قیدیں لگائی ہیں جو حلال و حرام اور مکروہ و مباح کے امتیازات قائم کرتی ہیں اور ہر چیز کے فرض یا سنت یا مستحب ہونے کے درجے متعین کرتی ہیں۔ ان قیدوں اور شرطوں کا احترام نہایت ضروری ہے۔ ان کے احترام ہی سے خدا کی رضا جوئی کے اعلیٰ نصب العین تک بندہ پہنچتا ہے اور زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ میں وہ اعتدال نمایاں ہوتا ہے جو انسان کے ہر قول و فعل کو عبادت بنا دیتا ہے اگرچہ وہ قول یا فعل بظاہر کتنا ہی دنیادارانہ ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ان محرکات کے اندھے پن کا علاج وہ سرمۂ بصیرت ہے جو خدا کی رضا جوئی کے نصب العین سے حاصل ہوتا ہے اور ان کی افراط و تفریط کی بیماری شریعت کی پابندی سے دور ہوتی ہے۔

حدودِ الٰہی کی پابندی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت

یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد زندگی کے محرکات کو صراطِ مستقیم پر برقرار رکھنے کے لیے رضائے الٰہی کی طلب اور حدود اللہ کی پابندی ضروری ہے۔ ایک نہایت اہم اور مشکل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان یہ مقام کس طرح حاصل کر سکتا ہے کہ خدا کی رضا جوئی کا نصب العین کبھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور زندگی کے تمام نشیب و فراز اور اس کے مخفی سے مخفی اور بعید سے بعید گوشوں میں بھی وہ حدود الٰہی کی نگہداشت قائم رکھ سکے۔

یہ مقام حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔

ایک ذکرِ الٰہی اور دوسری فکرِ آخرت۔ ان دونوں چیزوں پر مفصل بحث تو آگے اپنے اپنے مقام پر آئے گی لیکن مختصراً ان کا تعارف یہاں بھی ضروری ہے۔

ذکرِ الٰہی

ذکرِ الٰہی سے ہماری مراد ذکرِ الٰہی کی مداومت ہے۔ ہم چوبیس گھنٹوں میں جتنے موڑ بھی مڑتے ہیں، ہر موڑ پر خدا کو یاد کر لینا چاہیے اس سے ہمیں یہ تنبہ ہوتا رہے گا کہ ہم کہیں کوئی غلط موڑ نہ مڑ جائیں، نیز ہر کام کے دوران میں بھی بار بار اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے تاکہ دورانِ کار میں ہم بھول کر کہیں سے کہیں نہ جا نکلیں۔ یہ یاد بیداری، ہوشیاری اور فہم و شعور کے ساتھ ہونی چاہیے

تاکہ یہ زبان کی محض ایک ورزش بن کے نہ رہ جائے ۔ اس کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی تکرار کافی نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف صفات کی یادداشت کا ذہن نشین ہونا بھی ضروری ہے ۔ علاوہ ازیں ہر قدم پہ خدا سے راہنمائی اور مدد بھی طلب کرتے رہنا چاہیے اور لغزشوں اور کوتاہیوں پہ معافی بھی مانگتے رہنا چاہیے ۔ اس یاد سے آدمی کا دل خدا پر جما رہتا ہے اور اگر شیطان کی جھوٹ سے کبھی قدم لڑکھڑا نے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سنبھال لیتا ہے ۔

یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آدمی جب خدا کو بھول جاتا ہے تو خود اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے ۔ اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ وہ دنیا میں کیوں آیا ہے ؟ اس کو کس نے بھیجا ہے ۔ اس دنیا کی حیات چند روزہ کے بعد اس کو کہاں جانا ہے ؟ اس کو جو نعمتیں ملی ہیں وہ کس نے بخشی ہیں اور کیوں بخشی ہیں ؟ اس کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں وہ کس نے دی ہیں اور کیوں دی ہیں ؟ یہ اس کے شایانِ شان بھی ہیں یا نہیں ؟ خدا کو بھولتے ہی وہ ان ساری باتوں کو بھول جاتا ہے ۔ وہ اپنے نفس کی حقیر خواہشوں کے پیچھے پڑ کر حیوانات سے بھی نیچے اپنے آپ کو گرا دیتا ہے ۔ یہی حقیقت ہے جو قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ،

نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم (انہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے خود اپنے سے ان کو بے خبر کر دیا ۔)

برعکس اس کے جب آدمی خدا کو یاد رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی یاد رکھتا ہے وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کی قدر و قیمت اچھی طرح سمجھتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ میں خدا کا خلیفہ ہوں وہ باخبر ہوتا ہے کہ میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے مسجودِ ملائک ہوں ۔ اس پہ یہ حقیقت واضح رہتی ہے کہ اس حیات چند روزہ کے امتحان میں اگر کامیاب ہو گیا تو میں ایک ابدی لازوال خوشیوں اور مسرتوں کا حقدار بننے والا ہوں ۔ یہ چیز اس کو اپنی زندگی کے سارے معاملات میں نہایت بیدار بنا دیتی ہے وہ اپنی ایک ایک چیز کو اپنے رب کی امانت سمجھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے ۔

اس یاد کے لیے جیسا کہ عرض کیا گیا مداومت شرط ضروری ہے جس طرح ہماری مادی زندگی کے بقا کے لیے ہر وقت سانس کی آمد و شد ضروری ہے

اسی طرح ہماری روحانی زندگی کے بقا کے لیے یہ یادِ الٰہی ہر وقت ضروری ہے لیکن اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ آدمی زندگی کے سارے مشاغل چھوڑ کر بس یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جائے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک خدا کی اس یاد کے لیے زندگی کی کش مکشوں سے الگ تھلگ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس یاد کی اصل برکت فکرِ معاش کی بھاگ دوڑ، تعلقات و روابط کی الجھنوں اور اقامتِ دین کی عملی و علمی سرگرمیوں ہی کے اندر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور زندگی کے تمام فرائض انجام دیتے ہوئے ہونی چاہیے۔ قرآن مجید سے ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔

آلِ عمران کی اس آیت پر غور کیجیے۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔	جو خدا کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور آسمان و زمین کی صنعت پر غور کرتے ہیں کہ اے رب! یہ کارخانہ تو نے بے مقصد نہیں بنایا ہے تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی کام عبث کرے۔ پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات نکلتی ہے کہ ذکرِ الٰہی اور فکرِ آخرت دونوں ساتھ ساتھ ہوں تب یہ آدمی کو جادۂ حق پر استوار رکھنے میں معین ہوتے ہیں اور دوسری طرف قیاما و قعودا و علیٰ جنوبہم کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ ذکر ایک چلتی پھرتی زندگی میں مطلوب ہے۔ اس کے لیے آدمی کو پاؤں توڑ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے[1]۔

فکرِ آخرت

فکرِ آخرت، درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر کا ایک پہلو ہے، اللہ تعالیٰ کی یاد نتیجہ خیز اسی وقت ہوتی ہے جب بندہ اس ذکر کے ساتھ فکرِ آخرت کو بھی ملا لیتا ہے یعنی آدمی اس حقیقت کا دھیان کرتا ہے کہ یہ زندگی اور اس زندگی کی تمام نعمتیں اور لذتیں فانی ہیں جو پیدا ہوا ہے اس کے لیے مرنا ضرور ہے۔ یہ موت بچے کو بھی آتی ہے، جوان کو بھی آتی ہے

[1] یہاں ذکر سے متعلق ہم اس اصولی بحث ہی پر اکتفا کرتے ہیں آگے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی بحث میں اس کے فوائد، آداب، اس کے اقسام اور طریقوں پر مفصل بحث کریں گے۔

اور بوڑھے کو بھی آتی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس کی آخری گھڑی کب آجائے گی۔ شاہ و گدا، عالم اور جاہل، کمزور اور طاقتور سب ہی اس کے حملہ کے آگے بے بس ہیں۔ قبر کی تاریکی و تنہائی سے سب ہی کو سابقہ پیش آنا ہے، پھر خدا نے یہ دنیا اور یہ زندگی بے مقصد نہیں بنائی ہے کہ اسے ہم اچھی گزاریں یا بری، خدا کو اس سے کوئی بحث نہ ہو، وہ ضرور ہمارے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا حساب کرے گا۔ ہم کوئی چیز بھی اس سے چھپا نہ سکیں گے۔ ہماری ہر خیانت، ہر چوری، ہر بے ایمانی پکڑی جائے گی اور کسی کی سفارش بھی خدا کی اجازت کے بغیر ہمیں نجات نہ دلا سکے گی، ایمان دار اور عمل صالح کے سوا کوئی چیز بھی کسی کو خدا سے قریب نہ کرے گی۔ خدا جس طرح غفور و رحیم ہے اسی طرح عادل اور منصف بھی ہے اور آخرت میں جس طرح اس کی رحمت ظاہر ہوگی اسی طرح اس کا انصاف بھی ظاہر ہوگا۔ آخرت کی نعمتوں کی طرح اس کی سزائیں بھی ہمیشہ باقی رہنے والی ہوں گی اور جس طرح اس دنیا میں آخرت کی نعمتوں کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح آخرت کی سزاؤں کی شدت اور ہولناکی کا کوئی تصور بھی اس دنیا میں کرنا ممکن نہیں ہے۔

حجاباتِ ذکر و فکر

اگر اس ذکر و فکر کو آدمی برابر تازہ رکھ سکے تو نہ تو خدا کی رضا طلبی کا نصب العین اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا اور نہ حدود الٰہی کی نگہداشت میں اس سے بے پروائی ہوگی لیکن ہماری طبیعت کی بعض کمزوریاں ایسی ہیں جو اس ذکر و فکر کے لیے حجاب بن جاتی ہیں۔ ان حجابات میں سے سب سے زیادہ عام چیز غفلت ہے۔ دوسری چیز حیاتِ دنیا اور زخارفِ دنیا کی محبت ہے۔ تیسری چیز ہماری خواہشات و شہوات اور ہمارے جذبات کے مطالبے ہیں۔

ان تینوں قسم کے حجابات پر اس سلسلہ کے پچھلے مباحث میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے البتہ ان حجابات کو توڑنے کے لیے اسلام نے جو تدابیر بتائی ہیں ان پر مفصل گفتگو کی ضرورت ہے۔

غفلت کا علاج اسلام نے نماز بتایا ہے۔ محبتِ دنیا کا علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے، شہوات و خواہشات کا زور روزہ سے ٹوٹتا ہے، اور ان تمام امراض کا جامع اور آخری علاج حج ہے۔

اب ہم بالترتیب انہی پر گفتگو کریں گے۔

نماز اور آفاتِ نماز

خدا سے غفلت کو دور کرنے کا سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر نسخہ نماز ہے۔ یہ نسخہ خود اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے۔ اس نے خود فرمایا ہے کہ مجھے یاد رکھنا چاہو تو نماز قائم کرو۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ   میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

نماز کے شرائط، نماز کے اوقات، نماز کی صورت و ہیئت، نماز کی دعائیں، غرض اس کی ایک ایک چیز انسان کو بیدار کرنے والی اور جھنجھوڑنے والی ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص نماز کا اس کے تمام شرائط و آداب کے ساتھ اہتمام کرے اور اس کے دل پر غفلت کا میل کچیل باقی رہ سکے۔ نفسِ انسانی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے اور یہ جس طرح آدمی کو پاک اور بیدار رکھتی ہے اس کی حقیقت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں نہایت عمدہ تمثیل کے ذریعہ سے سمجھا دی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ پانچ مرتبہ روزانہ نہاتا ہو تو کیا ایسے شخص پر میل کچیل کا کوئی اثر باقی رہے گا؟ لوگوں نے کہا نہیں، یا رسول اللہؐ، ایسے شخص پر میل کچیل کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے، ان کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ بندے کے گناہوں کو دھو

رہتا ہے۔" (متفق علیہ)

انہی حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دوسری روایت ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص سوجاتا ہے تو شیطان اس کے سر کے پچھلے حصے میں تین گرہیں لگا دیتا ہے اور ہر گرہ پر یہ پھونک مار دیتا ہے کہ ابھی بڑی رات پڑی ہے، سوتے رہو۔ پھر اگر وہ جاگ جاتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ وضو کر ڈالتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے اور اگر وہ نماز پڑھ ڈالتا ہے تو ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اور وہ بالکل ہشاش بشاش اور چاق چوبند ہو جاتا ہے، ورنہ بالکل پژمردہ اور سست رہتا ہے۔"

(متفق علیہ)

نماز کے شرائط

نماز کی یہ تاثیر کسی ایک ہی چیز کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان تمام چیزوں کو اس تاثیر میں دخل ہے جن سے نماز عبارت ہے۔

اس کے شرائط میں سے پاکی اور وضو ہے، ان کے اہتمام سے آدمی تازگی اور نشاط حاصل ہوتا ہے طبیعت پر سے کسل کا گردوغبار دھل جاتا ہے اور آدمی کا عضو عضو خدا کی بندگی میں اس کے ساتھ آدمی کا ربط بڑھتا ہے اور دعا و عبادت میں ان کا تعاون حاصل ہوتا ہے جس سے دعا و عبادت میں برکت ہوتی ہے کیونکہ انفرادی دعا کے مقابل میں جماعت کی دعا خدا کی رحمت کو زیادہ متوجہ کرنے والی ہے۔

نماز کے اوقات

اس کے لیے جو اوقات مقرر ہیں۔ یہ بھی عبادت کے لیے موزوں، قبولیت دعا کے لیے سازگار، بندہ کے ذہن کے لیے سکون بخش، عناصر کائنات کے اوقاتِ تسبیح و تہلیل سے مطابق اور شمس و قمر اور شجر و حجر کے اوقاتِ رکوع و سجود سے ہم آہنگ ہیں۔ فجر، چاشت، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی وقت بھی ایسا نہیں ہے جو مذکورہ بالا اعتبارات سے ایک خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔

فجر کا وقت فراغ خاطر اور سکونِ قلب کا خاص وقت ہے۔ آدمی شب میں آرام کرنے کے بعد جب اٹھتا ہے تو اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوتا ہے۔ عبادت ایک نئی حرکت کا آغاز ہوتا ہے

زندگی ایک نئے عزم کی محتاج ہوتی ہے اور یہ نیا عزم خدا کی طرف سے تازہ توفیق اور تازہ ہدایت کا طلبگار ہوتا ہے۔ آدمی دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس وقت ایک اور حقیقت بھی نظر آتی ہے اور وہ بھی آدمی کو رکوع سجود کی دعوت دیتی ہے وہ یہ کہ اس وقت سورج جس کو نادانوں نے معبود کا درجہ دے کر مسجود بنایا، خود اپنے خالق کے آگے اپنی کمر خم کرتا ہے اور خود اپنے عمل سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق اور معبود نہیں بلکہ عابد ہے۔

عصر کا وقت ایک نئی حقیقت کی منادی کرتا ہے وہ یہ کہ ہر عروج کے لیے زوال، ہر جوانی کے لیے بڑھاپا اور ہر مد کے لیے جزر مقدر ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے صرف ایک ہی ذات ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس کے سوا کسی کے لیے بھی بقا نہیں۔ جس طرح دن چمکا اس کی دوپہر ہوئی اور اب غروب کے کنارے کھڑا ہے۔ اسی طرح یہ دنیا بھی پیدا ہوئی، شباب کو پہنچی اور ایک دن خاتمہ کے قریب جا لگے گی۔ عصر کے وقت یہ خاموش تذکیر، بندہ کو اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ آخرت کو یاد کرے اور توبہ و استغفار کے لیے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو۔

مغرب کے وقت زندگی ایک نئے دروازے میں داخل ہوتی ہے۔ یہ دروازہ حیات کے بعد موت اور زندگی کے بعد برزخ کے دروازہ سے مشابہ ہے۔ معرفت کائنات دن کی نشانی کے بعد رات کی نشانی، اور سورج کی تابانی کے بعد چاند کی چاندنی دکھاتا ہے۔ دن کے ہنگامے سرد پڑتے ہیں اور ستاروں کی بزم آراستہ ہوتی ہے، گرمی، لُو، اور دن کی شور اشوری کی تلخیاں کم ہوتی ہیں اور دن بھر کا تھکا ہارا انسان رات کی خنک، لوریوں میں ایک نئی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ بے حس اور بلید لوگ ممکن ہے کائنات کے اتنے بڑے الٹ پھیر کو کچھ محسوس کرتے ہوں جس کے اندر حس موجود ہوگی وہ اس سے بے خبر کیسے گزر سکتا ہے؟ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ آدمی اتنی بڑی قدرت و حکمت کا مشاہدہ کرے اور جس قدیر و حکیم نے یہ قدرت و حکمت دکھائی ہے، اس سے بالکل بے پروا اور بے نیاز رہ سکے اگر اس کے دل کے اندر زندگی کی کوئی رمق ہے تو وہ اس موقع پر ضرور متنبہ ہوگا اور اپنے اس خالق و مالک کے آگے اپنا سر نیاز جھکائے گا جس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اس نے آن کی آن میں پوری دنیا کو شب کی چادر میں چھپا دیا۔

عشاء کا وقت ایک احتساب کا وقت ہے۔ رات کی تاریکی بڑھ کر حرکت وعمل کے آخری آثار کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ آدمی ہر چیز سے کنارہ کش ہو کر سکون اور آرام کا طالب ہوتا ہے تاکہ آنے والی منزل کے سفر کے لیے تازہ ہو سکے۔ یہ وقت، اس بات کے لیے نہایت موزوں ہوتا ہے کہ آدمی بستر پر جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے رب کے حضور میں حاضری دے لے۔ ممکن ہے یہ فرصت، آخری فرصت ہی ہو اور آج کے سونے کے بعد اس کو جاگنا نصیب نہ ہو۔

تہجد کا وقت راز و نیاز اور سرگوشی و مناجات کا وقت ہے، پُرسکون اور سکون بخش ہونے کے لحاظ سے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ اس وقت سب سوئے ہوئے ہوتے ہیں، شاید شیطان بھی سو رہا ہوتا ہے صرف وہ رب غفار و کریم جاگتا ہے جو کبھی نہیں سوتا یا پھر وہ جاگتا ہے جس کا بخت بیدار ہوتا ہے۔ اٹھیے اور ستاروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو جائیے تو فی الواقع محسوس ہو گا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہوئے ہیں اور سمائے دنیا سے توبہ اور رحمت کی منادی ہو رہی ہے۔ اس وقت کی کیفیات ایسی واضح ہیں کہ اس کو دنیا دار اور دیندار، رند اور زاہد، دونوں ہی جانتے ہیں۔ سونے والے اس کو سونے کے لیے بہترین وقت سمجھتے ہیں اور جاگنے والے اس کو جاگنے کے لیے سب سے بہتر وقت سمجھتے ہیں اور فی الحقیقت ان دونوں کا سمجھنا صحیح ہے۔ جو وقت سونے کے لیے سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہو گا، وہی جاگنے کے لیے بھی سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہو گا۔ قربانی تو عزیز و محبوب ہی کی مقبول ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت کو اللہ تعالیٰ نے بھی مقربین کی نماز کے لیے خاص کیا ہے۔ جن کے پہلو اس وقت بستر کی لذت کو چھوڑتے ہیں اُن کی التجائیں اور دعائیں سننے کے لیے وہ خود سمائے دنیا پر اترتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں، ہے کوئی میری رحمت کا طالب کہ میں اس کو اپنی رحمت کے دامن میں چھپا لوں۔

یہ اوقات ہیں جو نماز کے لیے مقرر ہیں۔ غور کیجیے کہ ان میں سے ایک ایک وقت اپنے اندر کتنی معنویت اور کتنی تاثیر رکھتا ہے۔

نماز کی ہیئت

اب آئیے، نماز کی ہیئت وصورت پر ایک نظر ڈالیے۔
نماز کے لیے جب بندہ کھڑا ہوتا ہے تو عجز ونیازمندی کی تصویر بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ ہاتھ باندھے ہوئے، نگاہ نیچی کیے ہوئے، گردن جھکائے ہوئے پاؤں ٹکر کیے ہوئے، یمین وشمال اور آگے پیچھے سے بالکل بے تعلق، سنجیدگی اور خاموشی کی تصویر، ادب اور وقار کا مجسمہ، کبھی اپنے خالق ومالک کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ کبھی اپنی ناک اور پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے کبھی ہاتھ پھیلا کر اس سے دعا اور التجا کرتا ہے۔ غرض عاجزی اور تذلل کی جتنی شکلیں بندہ اختیار کر سکتا ہے، ادب اور وقار کے ساتھ ان ساری ہی شکلوں کو اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک نماز پڑھنے والے کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ صاف گواہی دیتی ہے کہ بندہ اپنے مالک ومولیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا ہے تو یہ یقین تو وہ ضرور رکھتا کہ اس کا مالک ومولیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی نماز ہے جس کو احسان کی نماز کہتے ہیں۔ یہ نماز فقہی نماز سے ایک مختلف مزاج رکھتی ہے۔ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے معتبر نماز یہی ہے۔ یہ نماز، نماز پڑھنے والے کے باطن کا عکس ہوتی ہے۔ اس نماز میں نمازی کے دل کا خضوع وخشوع جھلکتا ہے۔ اس میں خدا کے آگے بندہ کی صرف کمر ہی نہیں جھکتی بلکہ اس کا دل بھی جھک جاتا ہے۔ صرف اس کی پیشانی ہی خاک آلود نہیں ہوتی بلکہ اس کی روح بھی سجدہ ریز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص نفاق کی نماز پڑھتا ہے، اس کی کسل مندی، اس کی جمائیاں، اس کا بدن کو توڑنا مروڑنا، انگلیوں کو چٹخانا، سر کھجلانا، دامن اور گریبان سے کھیلنا، داڑھی کے بالوں سے شغل کرنا اور اس طرح کی دوسری حرکتیں صاف گواہی دیتی ہیں کہ اس کا جسم حاضر ہے لیکن اس کا دل غائب ہے۔ یہ آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہے۔ اس کا بدن مسجد میں ہے لیکن اس کی روح بازار میں گردش کر رہی ہے اور گو دوسروں کی دیکھا دیکھی یا رسم کی پابندی کی خاطر اپنی گردن یہ بھی جھکا دیتا ہے لیکن اس کا دل بدستور اکڑا ہی رہتا ہے۔

نماز کی دعائیں

اب ذرا ایک اجمالی نظر نماز کی دعاؤں پر ڈالیے:
نماز کا آغاز ابراہیمی[1] دعا سے ہوتا ہے جس میں بندہ سب سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے رب سے جڑنے کے عزم کا اظہار کرتا ہے جس میں وہ اپنی نماز اور اپنی قربانی اور

---

[1] اشارہ ہے انی وجہت وجھی للذی کی طرف۔

اپنی زندگی اور اپنی موت، ہر چیز کو صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ وہ اس خدا کی خدائی میں آسمان و زمین میں سے کسی کی شرکت تسلیم نہیں کرتا اور پورے عزم کے ساتھ شرک سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مسلم ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ یہ صرف ایک کلمہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس یادگار اعلانِ حق کی ایک پوری تاریخ ہے جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے کیا ہے اور ہر قسم کی دشمنیوں اور دوستیوں، ہر قسم کے فوائد و مصالح اور ہر قسم کے خطرات و مصائب سے بالکل بے پروا ہو کر کیا ہے۔ اس اعلانِ حق کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ اس میں انھوں نے خدا کے لیے ہر چیز سے جس دستبرداری کا اظہار فرمایا تھا، اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ان کو فی الواقع ہر چیز سے دامن جھاڑ کر اٹھنا پڑا اور وہ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوگئے۔ ان کو محض استعارہ کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں زندگی اور موت کی بازیاں بھی کھیلنی پڑیں اور وہ ان بازیوں میں بھی سو فی صدی کامیاب رہے۔

یہ یادگار کلمہ زبان سے ادا کر کے جب بندہ نماز میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عظیم معنویت اور اس کی عظیم تاریخ، اس کی روح کو ابراہیمی اخلاص اور ابراہیمی حنیفیت سے لبریز کر دیتی ہے، وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں صرف ایک مصلی ہی نہیں ہوں بلکہ ایک صف شکن مجاہد بھی ہوں۔ وہ اپنے رب کے آگے اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا عہد کرتا ہے لیکن یہ صرف وفاداری کا عہد ہی نہیں ہوتا بلکہ دنیا کے ہر باطل سے بغاوت کا اعلان بھی ہوتا ہے اور اس راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کا غیر متزلزل عزم بھی۔

اس دعا کے بعد بندہ خدا کی بڑائی کی گواہی دیتے ہوئے نماز میں داخل ہوتا ہے یہ گواہی وہ ڈرتے اور سہمے ہوئے نہیں دیتا بلکہ دونوں ہاتھ اٹھا کر گواہی دیتا ہے جس سے اس کے عزم کا اظہار اور اس کے یقین کا اعلان ہوتا ہے۔

پھر وہ سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے۔ یہ دعا وہ دعا ہے جس سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے کوئی اور دعا نہیں۔ یہ دعا خود خدا کی سکھائی ہوئی ہے اس میں بندہ جس طریقہ سے اپنے رب سے مانگتا ہے، اس سے بہتر طریقہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جو کچھ مانگتا ہے اس سے بہتر کوئی دوسری چیز مانگنے کی ہو ہی نہیں سکتی خدا نے خود ہی بتا دیا ہے کہ اس سے مانگنے کا طریقہ کیا ہے اور اسی نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اصلی مانگنے کی چیز کیا ہے جب سوال کی تمہید بھی ٹھیک ہو، جو چیز مانگی گئی ہے وہ بھی مانگنے کی ہو اور تمنا

اسی سے مانگنے کی موجیں سے مانگی جا رہی ہے اور دینے والا بھی تمام کریموں سے بڑھ کر کریم ہو تو پھر اس کی قبولیت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر بھی دی ہے کہ بندہ جب یہ دعا پڑھتا ہے تو رب کریم اس کے ایک ایک لفظ کو کس طرح شرف قبولیت بخشتا ہے۔ ہم اس حدیث کا ترجمہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے نماز کی دعا کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا آدھا حصہ میرے لیے ہے اور میرا بندہ جو کچھ مانگتا ہے وہ پاتا ہے جب بندہ الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میرا شکر ادا کیا۔ جب بندہ الرحمن الرحیم کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری تعریف کی جب وہ مالک یوم الدین کہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری بڑائی بیان کی جب وہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ حصہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندہ کو وہ دیا جو اس نے مانگا پھر جب بندہ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خاص میرے بندہ کا حصہ ہے اور میں نے اس کو بخشا جو اس نے مانگا۔" (مسلم)

آدمی نماز میں جب اس دعا کو پڑھتا ہے اور ساتھ ہی یہ خیال کرتا جاتا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کو مالک الملک کس طرح قبول فرما رہا ہے جس سے یہ دعا کی جا رہی ہے تو اس کی روح وجد میں آجاتی ہے۔ یہ خیال اس دعا کے ایک ایک لفظ کو لعل و گہر سے بھی زیادہ قیمتی بنا دیتا ہے اور ان کو اونگھتے ہوئے زبان سے نہیں ادا کرتا بلکہ وہ اس جوہری کی طرح ان کو آسمان و زمین کے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا ہے جس کو اس کے ایک ایک گہر کے بدلے ان کے حقیقی قدر دان کے ہاتھوں دولت کے خزانے ملنے والے ہوں۔

سورۂ فاتحہ کے بعد بندہ قرآن مجید کی کوئی سورۃ یا اس کا کوئی حصہ پڑھتا ہے۔ قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی پڑھا جائے، یہ اس کتاب کا اعجاز ہے کہ اس کے ہر حصہ میں وہ اصل چیز موجود ہوتی ہے جس کی تعلیم و دعوت کے لیے قرآن اُترا ہے۔ خدا کی صحیح تعریف، زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ، آخرت کا بیان، جزا و سزا کا ذکر اس کے ہر حصہ میں ملے گا۔ اسلوب اور انداز بیان بدلے ہوئے ہوں گے کہیں ایک بات قانون کی شکل میں ہوگی، کہیں موعظت کی شکل میں، کہیں قصہ کی شکل میں، کہیں تمثیل کے پیرایہ میں، کہیں دھمکی کا انداز ہوگا کہیں پیار و محبت کا لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھا یا سُنا جائے (تین آیتوں کے بقدر ہی سہی) اور آدمی کے سامنے نہایت مؤثر اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کی یاد دہانی نہ ہو جائے جو اس کی زندگی کے رُخ کو صحیح رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد رکوع و سجود کی تسبیحات ہیں۔ ان تسبیحات میں بندہ اپنے رب کا ہر عیب سے پاک ہونا اور اس کا سب سے بڑا ہونا اور اس پاکی اور بڑائی کا عملی اعتراف و اظہار اس طرح کرتا ہے کہ پہلے اس کے آگے زمین کے قریب تک جھک جاتا ہے اور پھر اپنی پیشانی اور اپنی ناک اس کے سامنے زمین پر رکھ دیتا ہے۔

خاتمۂ نماز پر بیٹھ کر بالعموم تین دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ التحیات، درود شریف اور استغفار۔ ان تینوں میں بندہ تین سب سے بڑے حقوق کو ادا کرتا ہے۔ بندہ پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے اس لیے پہلے التحیات میں وہ اس کے حضور میں سلامی اور نیاز کا تحفہ پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے نیک بندوں پر بھی سلام و رحمت بھیجتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد نبی صلی اللہ اور آپؐ کے ازواج و ذریات پر درود و سلام بھیجتا ہے۔

اس کے بعد ماں باپ، قرابت مندوں اور دوسرے دینی بھائیوں بہنوں کے حقوق ہیں چنانچہ آخر میں ان سب کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور اس کے بعد سلام پر اپنی نماز ختم کرتا ہے۔

یہ نماز کی وہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں جن کا ملحوظ رہنا نماز کی صحت اور اس کی افادیت کے لیے

ضروری ہے۔ یہ نماز اگر ایک شخص دن رات میں کم از کم پانچ مرتبہ پڑھتا ہے تو یہ ایک نہایت موثر واعظ اور زاجر ہے، اس کو بے حیائی اور برائی سے روکنے کے لیے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)۔ "روکتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں کم از کم پانچ مرتبہ آدمی کی زندگی کے رخ کو صحیح کرنے کے لیے یاد دہانی کرتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یاد دہانی نہایت مؤثر یاد دہانی ہے۔ بشرطیکہ آدمی نماز کو نماز کی طرح پڑھے اور نماز جو تذکیر کرتی ہے آدمی اس کو قبول کرے۔ اگر وہ نماز کو محض ایک رسم بنا کے رکھ دے اس کے اندر اٹھنا بیٹھنا محض ضابطہ کی خانہ پری رہ جائے اور اس کی دعائیں بے سمجھے بوجھے منتر کی طرح پڑھی جاتے لگیں تو پھر نماز ایک بالکل بے معنی اور بے مقصد چیز بن کے رہ جائے گی۔

نماز کی آفات

اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے نماز کی کیا اہمیت ہے اور وہ کون سی نماز ہے جو آدمی کو درست رکھتی ہے لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر ہم یہ نہ بتائیں کہ نماز کی وہ بیماریاں کیا ہیں جو اس کو بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کے رکھ دیتی ہیں اور ان بیماریوں کا علاج کیا ہے۔ اب ہم مناسب ترتیب کے ساتھ نماز کی چند معروف بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے علم کی حد تک ان کے علاج بھی بیان کریں گے۔

کسل

نماز کو برباد کرنے والی سب سے عام آفت کسل اور سستی ہے۔ یہ بیماری جب کسی شخص کو لاحق ہو جاتی ہے تو نہ وہ وقت کی پابندی برقرار رکھ سکتا ہے، نہ جماعت کا اہتمام قائم رکھ سکتا ہے اور نماز میں حضورِ قلب کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ ایسا شخص اول تو آہستہ آہستہ سرے سے نماز غائب ہی کر دیتا ہے لیکن پڑھتا ہے تو اس طرح کہ اس کی نماز ان تمام اوصاف سے خالی ہونے کے سبب سے جو نماز میں اثر پیدا کرتے ہیں، بالکل بے جان اور بے روح ہوتی ہے۔ اس کسل کا سبب ظاہر میں کئی چیزیں ہوتی ہیں، کبھی نیند ہوتی ہے، کبھی مشغولیت ہوتی ہے، کبھی بعض دنیوی دلچسپیاں ہوتی ہیں لیکن اگر معاملہ کی تہ میں اتر کر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ اسباب محض ظاہری اسباب ہیں، اس کا حقیقی سبب درحقیقت ان ظواہر میں نہیں بلکہ دل کے اندر مضمر

ایک کسل تو وہ ہے جو طبیعت انسانی کا خاصہ ہے، تعب، تھکان اور مشقت طلب مشغولیتیں مستعد سے مستعد آدمی کے اندر بھی کچھ نہ کچھ سستی پیدا کر دیتی ہیں۔ اس سستی پر ارادہ کی تھوڑی سی تربیت سے انسان آسانی سے قابو پا لیتا ہے لیکن ایک سستی وہ ہوتی ہے جو نفاق کا نتیجہ ہوتی ہے اس کا علاج مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے۔ قرآن نے سورۂ نساء میں اس کا ذکر کیا ہے، آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"منافق اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ ان کو دھوکہ میں ڈالے ہوئے ہے اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو سستی کے ساتھ اٹھتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔" (۱۴۲ ـ نساء)

جہاں تک نفاق کا تعلق ہے اس کا ذکر تو آگے اپنی جگہ پر آئے گا لیکن نماز کے سلسلہ میں عام کسل کو دور کرنے کے لیے چند چیزیں مفید ہیں، ان کا ذکر ہم بیان کرتے ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ نماز کی دین میں جو اہمیت ہے آدمی اپنے دل میں اس کو اچھی طرح جمائے۔ نماز ایمان کا پہلا مظہر ہے۔ ایمان سے پہلی ہی چیز جو پیدا ہوتی ہے وہ نماز ہے اور پھر نماز ہی سے سارا دین پیدا ہوتا ہے۔ دین جن ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں ایمان کے بعد سب سے پہلا ستون یہی ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس ستون کو ڈھا دے تو اس نے درحقیقت پورے دین کو ڈھا دیا۔ صحابہ کفر و ایمان کے درمیان نماز ہی کو حدِ فاصل سمجھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں اور عمال کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ تمہاری سب سے بڑی ذمہ داری نماز کا قیام و اہتمام ہے۔ جو شخص نماز کو ضائع کرے گا وہ بقیہ دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر دے گا۔ دین کا منبع اور سرچشمہ چونکہ نماز ہی ہے اس وجہ سے دین کی حفاظت میں اس کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ اسی چیز کے اہتمام سے آدمی اپنے پورے دین کی حفاظت کرتا ہے اگر اس میں سست پڑ جائے یا اس کو ضائع کر دے تو پھر وہ دین کی ساری حدیں توڑ کے رہتا ہے اور اپنی باگ شہوات کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اہل کتاب کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوات میں پڑ گئے۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دین میں ہر چیز کا ایک مقام ہے اور یہ مقام خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ جو چیز ستونِ دین کی حیثیت رکھتی ہے وہ بہر حال ستونِ دین ہے

جب تک اس کو قائم نہ کیا جائے گا دین کو قائم نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر کوئی شخص نماز کو قائم نہ کرے اور بزعم خویش دن رات اسلام کی خدمت میں لگا رہے تو اقامت دین کے نقطۂ نظر سے اس کی ساری کوشش لاحاصل رہے گی کیوں کہ وہ ایک عمارت بغیر بنیاد کے بنا رہا ہے جس طرح ایک عمارت میں بنیاد کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی اسی طرح دین میں نماز کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی ۔ اسی حقیقت کو حدیث میں یوں سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے نوافل کو اس وقت تک قبول نہیں فرماتا جب تک وہ فرائض نہ ادا کرے ۔

دوسری چیز جو اس کسل کو توڑنے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو سعی الی ذکر الٰہی کا عادی بنائے ۔ سعی الی ذکر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اذان کو خدا کی پکار سمجھے اور جونہی کانوں میں اذان کی پکار پڑے سارے کام چھوڑ کر نماز کے اہتمام اور مسجد جانے کی تیاریوں میں لگ جائے ۔ اس اہتمام اور تیاری کا انداز کسل مندانہ نہ ہو بلکہ ایک مستعد اور چاق و چوبند آدمی کا ہو جس طرح ایک فرماں بردار غلام آقا کے حکم کے لیے گوش بر آواز رہتا ہے اور اس کی پکار سنتے ہی دوسرے سارے دھندے چھوڑ چھاڑ کر تعمیلِ حکم کے لیے حاضر ہو جاتا ہے ، اسی طرح آدمی کو چاہیے کہ اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہو ۔ یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ نماز کے وقت سب سے زیادہ ضروری ، سب پر مقدم اور سب سے اہم فرض اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز ہی ہے اضطرار اور مجبوری کے حالات کے سوا کوئی دوسرا کام خواہ وہ دین ہی کا کام ہو اس پر مقدم نہیں ہو سکتا ۔ آدمی اگر کچھ عرصہ اذان کے سنتے ہی دوسرے سارے دھندوں کو چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی عادت ڈالے تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو اس کی ایک محبوب عادت بنا دے اور نماز کے معاملہ میں اس کی یہ کسل کی بیماری دور ہو جائے ۔

نیند سے جو کسل پیدا ہوتا ہے اس کا بہترین علاج حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے اور مضمون کے آغاز میں حضرت ابوہریرہؓ کے واسطہ سے ہم اس کو بیان کر آئے ہیں ۔ نیند اس وقت تک تو بلاشبہ بہت بھاری چیز ہے جب تک آدمی بستر پر پڑا انگڑاتا رہے لیکن جب ایک مرتبہ ہمت کر کے بستر چھوڑ دے پھر اللہ کو یاد کرے ۔ پھر وضو کرے اور نماز پڑھ لے تو درجہ بدرجہ وہ سستی کی بددلی اور بدحالی سے نکل کر خوشی و نشاط کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اگر

سونے کی حسرت نہیں رہ جاتی بلکہ اگر حسرت ہوتی ہے تو اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ جاگنے کی یہ لذت وراحت اس سے پہلے کیوں نہ حاصل کر سکا۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ آدمی نماز کے لیے اپنی نیند قربان کر کے کبھی پچھتائے گا نہیں۔ تھوڑے سے ہی عرصہ کی مشق کے بعد جاگنے کے بعد کی لذت کی یاد طبیعت پر اس قدر غالب ہوجاتی ہے کہ وہ گہری سے گہری نیند سے بھی آدمی کو اٹھا کھڑا کرتی ہے۔

وسوسہ نماز کی دوسری عام آفت وسوسہ ہے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی آدمی کے ذہن پر وسوسوں اور پراگندہ خیالات کا ہجوم ہوتا ہے جس طرح برسات کی بھیگی ہوئی راتوں میں کسی لیمپ پر پتنگوں کا ہجوم ہوتا ہے جو بات کبھی بھی یاد آنے والی نہ ہو وہ بھی نماز میں یاد آجائے گی اور پھر اسی ایک بات سے سینکڑوں باتیں پیدا ہو جائیں گی۔ بعض لوگ اس صورت حال سے بہت بد دل اور پریشان ہو جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاص ان کے اپنے دل کی خرابی ہے کہ اس طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں ورنہ نماز میں یہ بات نہیں ہونی چاہیے ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک نماز میں وسوسہ پیدا ہونے کا تعلق ہے اس سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی نماز سے جتنی ہی محبت ہے شیطان کو اس نماز سے اتنی ہی دشمنی ہے۔ اس وجہ سے آدمی جب نماز شروع کرتا ہے تو ابلیس کے کارندے اور ایجنٹ وسوسہ اندازی کا حملہ سب سے زیادہ سخت انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کے مقابل میں قوت ایمانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے شیطان کو کچھ زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی جو ان وسوسوں ہی کو غذائے روحانی سمجھتے ہیں۔ اگر شیطان ایک وسوسہ پیدا کرتا ہے تو وہ خود اپنے واہمہ کی خلاقی سے اس میں دس کا اور اضافہ کر لیتے ہیں۔

ان وسوسوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے تین باتیں مفید ہیں:

ایک عام بات تو یہ ہے کہ آدمی جس وقت یہ حالت محسوس کرے شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور اس آدمی کی طرح اپنی نماز کی حفاظت اور تکمیل کے لیے مستعد ہو جائے جس کو دشمن کے حملہ کی اطلاع ہو چکی ہو اور اس نے یہ عزم کر لیا ہے کہ وہ دشمن کے علی الرغم اپنی نماز پوری کر کے رہیگا اور ان وسوسہ اندازیوں کی کوئی پروا نہیں کرے گا۔ آدمی کی یہ مستعدی ہی لبسا اوقات شیطان کے سارے

طلسم کو باطل کر دیتی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ نماز کے کلمات صرف اپنے جی ہی جی میں نہ پڑھے بلکہ اس طرح پڑھے کہ وہ خود ان کو سن سکے اور ان کے معانی پر دھیان کر سکے البتہ احتیاط ضروری ہے کہ اس سے دوسرے پاس کھڑے ہوئے والے کی نماز میں خلل واقع نہ ہو۔ یہ چیز وسوسہ کو دور کرنے میں بہت مددگار ہوتی ہے۔ جب آدمی کا ذہن معانی کے پیچھے لگ جاتا ہے تو وسوسوں کی وادیوں میں بھٹکنے سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز جو سب سے زیادہ مفید اور کارگر ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی عام زندگی میں اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ اور بلند رکھنے کی کوشش کرے۔ وہ ہمیشہ ایسی چیزیں سوچے جو اس کے لیے بھی دین و دنیا میں نافع ہوں اور دوسروں کو بھی نفع پہنچانے والی اور ترقی دینے والی ہوں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کے ذہن کی چکی ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ اگر آدمی اس میں صاف ستھرا غلہ ڈالتا رہتا ہے تو وہ اس صاف ستھرے غلہ کو پیستی رہتی ہے اور اس سے نہایت عمدہ آٹا برآمد ہوتا رہتا ہے وہ موقع پاتے ہی اپنے کنکر پتھر کی مٹی بھر کر اس میں جھونک دیتا ہے اور یہ چکی اس کو دلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ چیز چکی کے نظام کو بالکل درہم برہم کر دیتی ہے، یہ حادثہ اگر بار بار پیش آنے لگے تو چکی اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ اس میں اچھا آٹا تیار کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ عمدہ سے عمدہ گندم بھی اس میں ڈالیے تو بھی آٹا کرکرا ہی نکلے گا۔

جو آدمی اپنے ذہن میں اچھے خیالات کی پرورش کا عادی ہو جاتا ہے نماز میں اس کو وسوسے کم لاحق ہوتے ہیں کیوں کہ وہ جس طرح کے خیالات سے مانوس ہوتا ہے اسی طرح کی روحانی غذا اس کو نماز میں بھی مل جاتی ہے اور اگر کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ایسے پست نہیں ہوتے کہ نماز کے بلند مقصد سے بالکل بے جوڑ ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ جیسے صاحب حضور وشہود کی نماز میں بھی کبھی کبھی خارجی حالات خلل انداز ہو ہی جاتے تھے۔ کبھی کبھی عین حالت نماز میں ان کا ذہن ایران وشام میں لڑنے والی فوجوں کی ترتیب میں مشغول ہو جاتا تھا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی تو ایک قسم کا کھو جانا ہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بھی ایک قسم کا کھو جانا ہے،

ہے لیکن بڑا فرق ہے اس کھو جانے میں جو کسی بغیر کی گلی میں ہو اور اس کھو جانے میں جو اسی کے کوچے میں ہو جس کے در کی تلاش ہے۔

اس وسوسہ ہی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں کو نہ اپنی طہارت پر اعتماد ہوتا ہے نہ وضو پہ اور نہ نماز پہ۔ وضو کے لیے بیٹھیں گے تو ہاتھ دھوتے ہی پہ لوٹے کے لوٹے پانی کے بہا دیں گے لیکن ان کا اطمینان نہیں ہوگا کہ ہاتھ دھویا گیا۔ نماز کے لیے کھڑے ہوں گے تو بار بار نیت باندھیں گے اور توڑیں گے لیکن ان کی نیت ہے کہ کسی طرح بندھنے ہی میں نہیں آتی۔

یہ ایک سخت قسم کی ذہنی بیماری ہے جس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اس کو بیماری سمجھے اور اپنی طبیعت کی اصلاح کی فکر کرے۔ بعض لوگوں کو یہ بیماری شک کے راستہ سے لاحق ہوتی ہے، ان کو اپنا ہر کام مشتبہ معلوم ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو اسلامی شریعت کا یہ اصول اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ دین کے معاملات میں گمان غالب کافی ہے۔ اگر ایک کام کے متعلق ہمارا گمان یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہو گیا تو ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس سے زیادہ اس کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ بیماری احتیاط اور تقویٰ میں غلو کے سبب سے لاحق ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اسلامی شریعت کے مزاج سے واقف کرنا چاہیے کہ یہ شریعت سہل ہے اور اللہ اور رسول کو یہ بات پسند ہے کہ بندہ تشدد پسندی سے بچے اور اپنے لیے معتدل راہ کا انتخاب کرے جو شخص اپنی تشدد پسندی کی وجہ سے دین سے دھینگا مشتی شروع کر دیتا ہے، بالآخر وہ شکست کھا جاتا ہے۔

مدعا سے بے خبری

تیسری آفت مدعا سے بے خبری ہے۔ اس زمانہ میں عوام کا بہت بڑا طبقہ ایسے لوگوں پہ مشتمل ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سرے سے جانتے ہی نہیں کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں کس بات کا اقرار اور کس بات کا انکار کرتے ہیں وہ نماز کے الفاظ کو منتروں کی طرح پڑھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ خواہ ہم ان کے معنی مطلب سمجھیں یا نہ سمجھیں یہ منتر کارگر ہو کے رہیں گے۔ ان کے نزدیک سارا جادو بس ان الفاظ میں ہے اگر الفاظ اُلٹے سیدھے زبان سے ادا ہو گئے تو تیر نشانہ پر لگ گیا۔

دوسرے بہت سارے لوگ ہیں جو ان الفاظ کے معنی سے تو بے خبر نہیں ہیں لیکن یا تو

غفلت کے سبب سے دھیان نہیں کرتے یا دھیان کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ یہ جس طرح قرآن کی تلاوت محض بطورِ تبرک کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں اس کی دعائیں بطورِ تبرک پڑھ لیتے ہیں یہ صورتِ حال خواہ جہالت کے سبب سے ہو یا غفلت اور غلط فہمی کے سبب سے نماز کو بالکل بے اثر اور بے مقصد بنا کے رکھ دیتی ہے۔ کم از کم تزکیۂ نفس کے نصب العین کو تو اس نماز سے مشکل ہی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ کم از کم ان سورتوں اور دعاؤں کے معنی مطلب تو ضرور سیکھ لیں جو عموماً نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ کام تھوڑی سی محنت اور بہت معمولی اہتمام سے ہر شخص کر سکتا ہے جو لوگ اتنا بھی نہیں کر سکتے، نہ وہ نماز کی اہمیت سے واقف ہیں نہ دین کی اہمیت سے۔

رہے وہ لوگ جو عربی زبان سے واقف ہیں یا کم از کم نماز کی دعاؤں کے حد تک واقف ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز میں جو کچھ سنیں یا پڑھیں اس کے لفظ لفظ کے معنی پر دھیان کریں، آدمی کا ذہن اگر کسی چیز پر جمنے اور غور کرنے کا عادی نہ ہو تو شروع شروع میں وہ اس میں مشقت اور اجنبیت محسوس کرتا ہے لیکن یہ محض عادت کی خرابی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذہن کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے بنایا ہے۔ ہرزہ گردی کے لیے نہیں بنایا ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ اس راہ پر لگایا جائے تو تھوڑی سی محنت سے لگ جاتا ہے اور جب لگ جاتا ہے تو پھر اس سے الگ ہو کر وہ زندگی میں کوئی لذت ہی محسوس نہیں کرتا۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ جب ایک ہی طرح کی دعائیں اور سورتیں ہر نماز میں پڑھی جاتی ہیں اور وہ معلوم ہیں تو پھر ان پر ہر روز اور ہر وقت غور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ جب اس کو سمجھ لیا تو یہ کافی ہے جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ نماز کی اور نماز کی دعاؤں کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ نماز معلومات کے اضافہ کے لیے نہیں پڑھی جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید، اس سے راہنمائی اور استعانت کی طلب اور توبہ و استغفار کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ یہ مقصد آخر بے سمجھے بوجھے الفاظ دہرا دینے سے کس طرح حاصل ہو سکتا ہے جب کہ آدمی کا ذہن اور دماغ حاضر نہ ہو۔ پھر یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے کہ نماز میں ایک ہی طرح کی چیزوں کا بار بار اعادہ ہے نماز میں نئے نئے انکشافات بھی ہیں اور ان انکشافات کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے لیکن یہ انکشافا

تہجد کی نمازیں ہوتے ہیں بشرطیکہ آدمی تہجد، اس کے شرائط کے ساتھ ادا کرے اور اس کو قرآن مجید یاد ہو۔

چوری

نماز میں ایک حادثہ چوری کا بھی پیش آیا کرتا ہے۔ یہ چوری شیطان نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات نماز پڑھنے والا خود کرتا ہے اور کہیں باہر جا کر نہیں کرتا بلکہ خود اپنی نماز کے اندر کرتا ہے آپ متعجب ہوں گے کہ وہ کس طرح؟ وہ اس طرح کہ بعض لوگ وضو اور نماز میں اتنی جلد بازی کرتے ہیں کہ وہ ان کے کسی رکن کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے۔ ہاتھ دھوئیں گے تو کہنیاں چھوڑ جائیں گے۔ پاؤں دھوئیں گے تو ایڑیاں خشک رہ جائیں گی، نماز میں کھڑے ہوں گے تو اس طرح کہ ابھی برابر کھڑے بھی نہیں ہوئے کہ رکوع کے لیے جھک پڑے۔ رکوع میں گئے تو سر ابھی کمر کے برابر ہوا بھی نہیں کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رکوع سے اٹھ کر ابھی کمر سیدھی بھی نہ ہونے پائی کہ دوسرے سجدے کے لیے جھک گئے۔ قعدہ میں بیٹھیں گے تو معلوم ہوگا کہ جلتے توے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ غرض وہ اپنی نماز کے ہر حصہ میں سے کچھ نہ کچھ دبا لیں گے۔

اس بیماری کے عموماً دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض لوگ فطری طور پر جلد باز ہوتے ہیں وہ ہر کام کو جلدی جلدی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور تربیت سے محروم ہونے کے باعث یہی طریقہ وہ نماز میں بھی اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ نماز کے ہر کام میں وقار اور متانت شرط ہے۔ اس کے بغیر نماز بالکل بے برکت ہو جاتی ہے۔ عام طور پر بچپنے میں غلط عادت پڑ جایا کرتی ہے وہ آخر دم تک قائم رہتی ہے، اس وجہ سے بچوں کی ابتدائی تربیت ہی میں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نہ تو وہ زندگی کے عام حالات میں جلد باز ہوں اور نہ نماز میں خصوصاً نماز میں جلد بازی کی خرابیاں اچھی طرح ان کے ذہن نشین کی جائیں۔

اس کا دوسرا سبب دل کی خرابی ہے۔ بعض لوگ مارے بندھے مسجد میں آتے ہیں۔ ان کے لیے مسجد ایک قیدخانہ ہوتی ہے وہ آتے ہی یہ چاہتے ہیں کہ کب اس جیل سے چھوٹیں اور اپنے ذوق کی دلچسپیوں میں منہمک ہوں۔ اس بدذوقی کی وجہ سے نماز ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے ایسے لوگوں کا علاج مشکل اور دیر طلب ہوتا ہے جب تک ان کے ذہن تبدیل نہ ہوں، جب تک یہ دین کی اہمیت اور دین کے اندر نماز کے مرتبہ اور مقام کے قائل نہ ہوں، اس وقت تک محض

تعدیلِ ارکان کی تاکید سے ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ نماز پیدا ہوتی ہے ایمان سے۔ اگر کوئی شخص ایمان کی لذت ہی سے آشنا نہ ہو تو وہ اس نماز کے لیے بھلا کیا اہتمام کرے گا جو اس نے محض اوپر سے چپکالی ہو یا اس کے اوپر چپکا دی گئی ہو۔

ریا نماز کی سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ خطرناک آفت ریا ہے۔ عام اس وجہ سے کہ اس کی اتنی مخفی قسمیں ہیں کہ محتاط سے محتاط آدمی بھی بعض اوقات اس کی بعض قسموں کے حملے سے اپنی نماز کو بچا نہیں سکتا اور خطرناک اس وجہ سے کہ نماز کے لیے اخلاص شرط ہے اور ریا اخلاص کے منافی ہے۔ ان دو باتوں کے سبب سے جو شخص اپنی نماز کو ریا سے پاک رکھنا چاہے اس کو مسلسل ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

میرے نزدیک اس بیماری کے علاج کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ آدمی ریا کی مختلف شکلوں سے اچھی طرح واقف ہو، امام غزالیؒ کی احیاء العلوم اور اسی طرح کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ ریا کی اقسام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہایت مفید ہے۔ ایک چیز سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آدمی اس کو پکڑ سکے اور اگر چاہے تو اس کی اصلاح کر سکے۔ یہ واقفیت عام لوگوں کے لیے جس قدر ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری علمائے دین اور اہلِ تقویٰ کے لیے ہے کیونکہ ریا دنیا داری کے بھیس میں کم آتی ہے یہ دینداری کے جامہ میں زیادہ آتی ہے اور ایسی ایسی پُرفریب شکلوں میں آتی ہے کہ بڑے بڑے عالمانِ دین اور بڑے بڑے مشائخ وقت اس کے چکمے میں آجاتے ہیں اور اس کے پیچھے بسا اوقات اپنے زہد و ریاضت کی زندگی بھر کی پونجی گنوا بیٹھتے ہیں

دوسری چیز جو اس کے لیے مفید ہے وہ تہجد کی نماز ہے۔ یہ نماز شب کی تنہائی میں پڑھی جاتی ہے اور نفس کے لیے نہایت سخت ہے اور اس کو مخفی رکھنے کی بھی تاکید ہے اس وجہ سے جو لوگ محض دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں وہ اس کی ہمت نہیں کر سکتے۔ اس کی ہمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یا تو بے ریا ہوں یا ریا کے فتنوں سے واقف ہوں اور اس سے اپنے آپ کو بچانے ہی کے لیے تہجد کے گوشۂ خلوت میں آکے چھپے ہوں۔ یہ نماز ریا کا سب سے زیادہ مفید علاج ہے بشرطیکہ آدمی اس کی رازداری کو قائم رکھ سکے۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں

بھی ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ یا تو خود مختلف پردوں میں اپنی شب بیداری اور تہجد خوانی کا اشتہار دیتے ہیں یا ان کے شاگرد اور مرید حضرات یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نماز اس مقصد کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ مفید نہیں رہ جاتی، بلکہ کچھ مزید ریا پرور بن جاتی ہے۔

نماز کے فتنوں میں سے یہ چند بڑے بڑے فتنے بیان ہوئے ہیں اگر آدمی ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے تو دوسرے فتنوں پر قابو پانے کی صلاحیت بھی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی نماز فی الواقع اس کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کی طمانیت اور روح کا سرور بن جاتی ہے۔

انفاق اور آفاتِ انفاق

دنیا اور اسبابِ دنیا سے محبت کے سبب سے اللہ تعالیٰ سے جو غفلت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ موثر اور کارگر علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ ہم نے انفاق فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ زکوٰۃ کی اصطلاح نہیں استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور احسان کے نقطۂ نظر سے دین میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ انفاق کی ہے، صرف زکوٰۃ کی نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو وہ کم سے کم مطالبہ ہے جو اسلام میں ایک صاحبِ مال سے کیا گیا ہے، اسلام کا اصلی مطالبہ تو انفاق کے لیے ہے جو سرًا بھی ہو، اعلانیہ بھی ہو، تنگی میں بھی ہو، فراخی میں بھی ہو، دوست اور عزیز کے لیے بھی ہو، مخالف اور دشمن کے لیے بھی۔

زکوٰۃ ادا کر دینے سے اسلامی حکومت کے مطالبہ سے تو آدمی ضرور بری ہو جاتا ہے قانون اس پر کوئی گرفت نہیں کر سکتا لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے مطالبہ کا تعلق ہے وہ صرف زکوٰۃ ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس وقت پورا ہوتا ہے جب آدمی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ناگزیر ضروریات کے سوا ہر مصرف سے اپنا مال بچا کر اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے جتن کرے۔ جو شخص اس اہتمام سے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہی درحقیقت

انفاق کا اصل حق ادا کرتا ہے اور وہی ہے جو اس زندگی میں روح کی بادشاہی کا جلوہ دیکھتا ہے اور آخرت میں اپنے رب کی خوشنودی کی جنت دیکھے گا۔

ہم پہلے یہاں مختصراً انفاق کی برکات پر گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد ان آفات کا ذکر کریں گے جو انفاق کو باطل کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی ان آفتوں سے اپنے انفاق کو محفوظ رکھنے کے لیے قرآن و حدیث میں جو تدبیریں بتائی گئی ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

انفاق کی برکات

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی لگاؤ

انفاق کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کے دل کو خدا کے ساتھ اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ اس کے لیے خدا سے غافل رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی کو مال سے جو محبت ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ وہ جس جگہ اپنا مال رکھتا ہے یا جس کام میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے، اسی جگہ یا اسی کام کے ساتھ اس کا دل بھی اٹکا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنا مال کسی مخفی جگہ میں دفن کرتا ہے تو اس کا دل ہر وقت اسی گوشے اور اسی خرابے میں گردش کرتا رہتا ہے اگر وہ کسی بنک میں رکھتا ہے تو اس بنک کے ساتھ اس کا دل بندھ جاتا ہے۔ اگر کسی کاروبار یا کسی کمپنی میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے تو رات دن اس کاروبار یا کمپنی کی فکریں اس کے سر پر سوار رہتی ہیں۔ الغرض جہاں آدمی اپنا سرمایہ لگاتا ہے تجربہ شہادت دیتا ہے کہ وہیں اس کا دل بھی رہتا ہے اس حقیقت کی روشنی میں دیکھیے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا کے راستے میں خرچ کرے گا اس کا دل بھی خدا ہی کے ساتھ رہے گا کیوں کہ اس کا مال خدا ہی کے پاس ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ کیوں کہ تیرا مال جہاں رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہے گا۔

معاشرے کے ساتھ حقیقی ربط

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ صاحبِ انفاق کا اپنے معاشرے کے ساتھ بھی صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ فلسفۂ شریعت کے اعتبار سے یہ دین کی دو بنیادوں میں سے دوسری ہے ایک بندے کے صحیح بندہ بننے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ خلق کے ساتھ وہ صحیح طور پر مربوط ہو جائے۔ پہلی چیز آدمی کو نماز سے حاصل ہوتی ہے جس کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دوسری چیز اس کو انفاق سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی رمز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر قرآن میں ساتھ ساتھ ہوا ہے اور سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ کے ساتھ دوسری چیز جس کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق (مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ) ہے۔

یہ دونوں چیزیں درحقیقت وہ دو بنیادیں ہیں جن پر خلق اور خالق کے ساتھ آدمی کے سارے تعلقات کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ انہی دو چیزوں پر درحقیقت پورے دین و شریعت کی عمارت قائم ہے۔ پچھلے مذاہب میں بھی تمام نیکیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد نے پوچھا کہ اے استاذ تمام نیکیوں کی جڑ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تو تمام دل و جان سے اپنے خداوند خدا سے محبت کر اور دوسری چیز یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے محبت کر۔ پھر فرمایا کہ انہی دو چیزوں پر تمام دین و شریعت قائم ہیں۔

پڑوسی سے محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کے لیے اپنا مال خرچ کرے اس کے دکھ درد میں اس کا شریک بنے اور اس کی مشکلات میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر نماز ہے، اسی طرح اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر انفاق ہے۔

گو ظاہر میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے دوسری چیز درحقیقت پہلی چیز کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو آدمی خالق سے محبت کرے گا وہ اس کی مخلوق سے ضرور محبت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی عیال سے تعبیر فرمایا ہے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر اس کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے متعلقین سے بھی محبت ہو جاتی ہے، اپنی اس فطرت کے تقاضے سے جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرنے لگتا ہے اور یہ محبت قدرتی طور پر خلق کی ہمدردی اور ان کے لیے مالی ایثار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس کے جذبۂ شکر گزاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ جب اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتا ہے تو ہر پہلو سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اس کو ایک طرف تو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی اور پرستش کرے چنانچہ اسی تحریک سے وہ نماز پڑھتا ہے اور پھر یہی جذبہ دوسری طرف اس کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اس کے رب نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے دوسرے بندوں پر احسان فرمائے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک چیز دوسری سے پیدا بھی ہوتی ہے اور پھر انہی دونوں پر تمام دین و شریعت کی بنیاد بھی ہے۔ ایک تمام حقوق کا سرچشمہ ہے اور دوسری تمام حقوق العباد کی اصل ہے جو آدمی دوسروں کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے وہ ان کے دوسرے حقوق ادا کرنے میں بھی تنگ دل نہیں ہوگا۔ انسان کا دل اگر مال کی محبت اور بخالت کی بیماری سے پاک ہو جائے تو اس کے لیے وہ تمام نیکیاں آسان ہو جاتی ہیں جن سے ایک آدمی اپنے معاشرے کا بہترین فرد بنتا ہے اور اگر اس کا دل مال کی محبت میں گرفتار رہے تو اس کے لیے نیکی کا ہر کام دشوار بن جاتا ہے۔

قرآن مجید نے یہ حقیقت اس طرح سمجھائی ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ	پس جس نے دیا اور خدا سے ڈرا اور
بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى	اچھے انجام کو سچ مانا، اس کے لیے ہم
وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى	راہیں کھولیں گے آسانی کی اور جس نے
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ	بخیل کی اور خدا سے بے نیاز رہا اور

لِلْعُسْرٰى ۔ — اچھے انجام کو جھوٹ جانا تو اس کو ڈالیں گے ہم تنگی کی راہ پر ۔

انفاق سے حکمت حاصل ہوتی ہے

انفاق کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ دین کے دوسرے تمام عقاید و اعمال کے لیے بمنزلہ غذا اور پانی کے ہے ۔ اس سے آدمی کی وہ نیکیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں جو کمزور و ناتواں ہوتی ہیں اور اس کے وہ عقائد مستحکم اور پائیدار ہو جاتے ہیں جو ابھی اچھی طرح دل میں راسخ نہیں ہوئے ہوتے ہیں ۔ دین کے عقاید اور اعمال کا یہی رسوخ و استحکام ہے جس کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمت کے خزانہ کی کلید درحقیقت انفاق ہی ہے ۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کے آخر میں انفاق کی برکتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ	شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی
يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ	کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے
يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ط	تمہارے لیے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ يُّؤْتِي	ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے
الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ج وَمَنْ	والا ہے ، وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا
يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا	فرماتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر
(بقرہ - ۲۶۸ - ۲۶۹)	کثیر ملا ۔

یہ اس انفاق کی برکت بیان ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دل کو دین کے احکام پر جمانے کے لیے کیا جائے ۔ چنانچہ اس کی تمہید یوں شروع ہوتی ہے :

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال خرچ کرتے
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	ہیں ، اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دل کو جمانے
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ۔	کے لیے ۔

" اپنے دل کو جمانے کے لیے " یعنی دل کی خواہشات کے علی الرغم وہ اپنے مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ ان کے لیے خدا کے احکام کی تعمیل اور اس راہ میں ہر قربانی آسان ہو جائے جو لوگ

اس مقصد سے مال خرچ کرتے ہیں، ان کا صلہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ان کو اپنی مغفرت اور اپنے فضل سے نوازتا ہے اور ساتھ ہی ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا فرماتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

مال میں برکت انفاق کی چوتھی برکت یہ ہے کہ اس سے آدمی کے مال میں برکت ہوتی ہے قرآن مجید میں اس برکت کی مثال اس طرح بیان ہوئی ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستہ میں اپنے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ	مال خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے
اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ	ایک دانہ ہو جو اگائے سات بالیاں
كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ	جس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ
يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ	جس کے لیے چاہتا ہے بڑھاتا ہے
عَلِيْمٌ ۔	اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا، اور علم والا ہے

دوسری جگہ فرمایا ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي	اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا
الصَّدَقٰتِ ۔	ہے۔

یہ برکت آخرت میں جو ظاہر ہوگی وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اس شخص کے مال میں برکت ہوتی ہے جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے بے شمار بندے جو اس کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دعائیں کرنے والے بالعموم اہل حاجت ہوتے ہیں جو اپنی حاجت مندی کے سبب سے اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائے بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے خدا کے فرشتے بھی برکت کی دعا کرتے ہیں۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندوں پر کوئی صبح بھی نہیں آتی ہے مگر دو فرشتے اترتے ہیں، ایک یہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو اپنی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا یہ دعا

کرتا ہے کہ تو بخیل کو بربادی اور نقصان عطا فرما۔" (متفق علیہ)

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ برکت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں یا اس کے بینک بیلنس میں اضافہ ہو جاتا ہے یا اس کے املاک و جائیداد کی مقدار اور تعداد کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے بلکہ برکت کا مفہوم یہ ہے کہ مال کا جو حقیقی فائدہ اور نفع ہے جس مقدار میں وہ حاصل کرتا ہے، اس کے مقابل میں دوسرے حاصل نہیں کر پاتے۔ خلقِ خدا کی جو خدمت اس کے مال سے انجام پاتی ہے، دوسروں کے مال سے انجام نہیں پاتی۔ معاشرے اور تمدن کی اصلاح و ترقی میں جو حصہ اس کے مال کا ہوتا ہے، دوسروں کے مال کا نہیں ہوتا خدا کی خوشنودی کا جو لازوال خزانہ وہ اپنے مال کے بدلے میں حاصل کر لیتا ہے، دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں۔ خلقِ خدا کے دلوں میں عزت اور محبت کا جو مقام اسے ملتا ہے، روپے کو گن گن کر رکھنے والے اور کوٹھیوں اور کاروں کے مالک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو فراغِ خاطر، جو سکونِ قلب، جو اعتماد علی اللہ، جو قلبی مسرت اور دل اور روح کی جو بادشاہی اس کو حاصل ہوتی ہے، دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی خواب میں بھی وہ چیز نظر نہیں آتی۔

اس برکت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انفاق کرنے والے کا مال چونکہ دوسروں کے دبائے ہوئے حقوق کی فاسد ملاوٹ سے پاک ہوتا ہے، اس وجہ سے صالح بیج کی طرح اس کی قوت نشوونما میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت کو مضاعف کر دیتا ہے اور ان آفتوں سے وہ محفوظ ہو جاتا ہے جو آفتیں اندر اندر ان مالوں کو چاٹ کرتی رہتی ہیں جن کے اندر دوسروں کے حقوق کی آلائش ملی ہوئی ہوتی ہیں۔

آفات اور ان کا علاج

انفاق کی یہ برکتیں نہایت واضح الفاظ میں قرآن اور حدیث میں بیان ہوئی ہیں اور ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے بھی ان کی صحت و صداقت کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن نماز کی طرح اس کے لیے بھی چند آفتیں ہیں۔ اگر انفاق کرنے والا ان آفتوں سے ہوشیار نہ رہے اور اپنے انفاق کو پوری احتیاط کے ساتھ ان سے بچانے کی کوشش نہ کرے تو پھر اس کے انفاق کی ساری برکت برباد ہو کے رہ جاتی ہے اور وہ ان فوائد میں سے کوئی ایک فائدہ بھی حاصل نہیں کر پاتا جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ہم ان آفتوں میں سے چند اہم آفتوں کا یہاں ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرآن اور حدیث کی روشنی میں ان کے تدارک کی تدبیریں بھی بتائیں گے۔

چھٹا اتارنے کی خواہش بہت سے لوگ خدا کی راہ میں خرچ تو کرتے ہیں لیکن دل کی فیاضی اور ولولہ اور حوصلہ کے ساتھ نہیں خرچ کرتے بلکہ ان کے پیش نظر صرف ایک مطالبہ کو کسی نہ کسی طرح پورا کر دینا ہوتا ہے جس طرح وہ حکومت کا عاید کردہ کوئی ٹیکس ادا کر دیتے ہیں، اسی بددلی اور افسردگی کے ساتھ کسی دینی و مذہبی کام کے لیے بھی کچھ مال وہ نکال دیتے ہیں۔ اس بددلی کے سبب سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے وقت ان کی خواہش اور کوشش ہر

پہلو سے یہ ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں وہ چیز دیں جس کا دینا ان کے دل پر گراں نہ گزرے، جو ان کی ضرورت سے بالکل فاضل ہو یا جس سے کم از کم ان کو کوئی بڑا فائدہ اٹھا سکنے کی توقع نہ ہو۔ اگر قربانی کریں گے تو ایسے جانور کی جو کم قیمت اور بے حیثیت ہو۔ صدقہ کریں گے تو ایسے مال کا جو انہیں خود قبول کرنا پڑے تو اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھیں گے۔ اگر کسی قومی اور مذہبی مقصد کے لیے اپنی کوئی چیز الگ کریں گے تو وہ چیز جس کی فائدہ بخشی کی صلاحیت اب ختم ہو رہی ہے۔

اس طرح کا انفاق نہ صرف یہ کہ کوئی خیر و برکت نہیں پیدا کرتا بلکہ وہ سرے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت ہی نہیں پاتا۔ انفاق کے موجبِ خیر و برکت ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز آدمی کے دل کی آمادگی اور تیاری ہے جو انفاق دل کی آمادگی کے ساتھ نہ کیا جائے وہ خدا کے ہاں قبول ہی نہیں ہوتا تو اس میں خیر و برکت کیا ہو گی۔

یہ آمادگی اور تیاری اس تصور کو بیدار رکھنے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا یا اس کا کوئی کام ہمارا یا ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے بلکہ ہم خود ہر لمحہ اس کی عنایت و مہربانی کے محتاج ہیں۔ یہ محض اس کی طرف سے ہمارا ایک امتحان ہے کہ وہ اپنے ایک ہاتھ سے ہمیں بخشتا ہے اور دوسرا ہمارے آگے مانگنے کے لیے بڑھاتا ہے تاکہ دیکھے کہ ہم اسی کا بخشا ہوا مال خود اسی کو دیتے ہوئے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ فیاضی اور حوصلہ کے ساتھ دیتے ہیں یا تنگ دلی اور ترش روئی کے ساتھ جو لوگ اس آزمائش کا ہیں یا تنگ دلی اور ترش روئی کے ساتھ جو لوگ اس کا ایک مغتنم موقع سمجھتے ہیں اور اس کی راہ میں اپنے مال و متاع کا وہ حصہ پیش کرتے ہیں جو انہیں خود محبوب ہوتا ہے کسی محبوب چیز کو پیش کرنا بجائے خود اس بات کی بہت بڑی شہادت ہے کہ وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

بعض چیزوں کی محبوبیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ بجائے خود قیمتی اور پسندیدہ ہوتی ہے اور بعض چیزیں اگرچہ بجائے خود بہت قدر و منزلت والی نہیں ہوتی ہیں لیکن حالات ان کو قیمتی اور محبوب بنا دیتے ہیں مثلاً قحط اور گرانی کے زمانہ میں معمولی غذائی سامان بھی ہر شخص کے لیے محبوب و مطلوب بن جاتا ہے یا ایک غریب آدمی کے لیے اس کی جیب کا دھیلا ہی بڑی قیمتی چیز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ساری چیزیں محبوب ہی شمار ہوتی ہیں اور خلوصِ نیت کے ساتھ ان کو

خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے وہی برکتیں حاصل کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ ایک مزدور اپنے پسینہ کی کمائی کے چند ٹکے خدا کی راہ میں خرچ کر کے وہی اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے جو ایک امیر کبیر اپنی اشرفیاں لٹا کر حاصل کرتا ہے کیوں کہ ایک غریب کے لیے اس کے چند ٹکے اسی طرح محبوب ہیں جس طرح ایک دولت مند کو اس کی اشرفیاں محبوب ہو سکتی ہیں۔

محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو خرچ کرنے ہی سے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا ہوتا ہے جو لوگ محض زبانی جمع خرچ سے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں ان کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔	تم خدا کی وفاداری کا درجہ اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔
(۹۲۔ آل عمران)	

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا ناپسندیدہ یا غلط راہوں سے آیا ہوا مال دے کر اس وقت ٹالنے کی خواہش رکھتے ہیں، ان کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ۔	اے ایمان لانے والو، خرچ کرو ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور ان میں سے بُری چیز کے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو جس کو تم خدا کی راہ میں خرچ کرو اور تم خود اس کے لینے والے نہ ہو مگر آنکھیں میچ کر اور یاد رکھو کہ اللہ بے پروا اور حمید ہے۔
(۲۶۷۔ بقرہ)	

مذکورہ بالا آیت میں "طیبات" سے مراد ہیں وہ چیزیں جو بجائے خود بھی اچھی اور پسندیدہ ہوں اور جو حاصل بھی جائز اور پسندیدہ طریقے سے ہوئی ہوں۔

اس حقیقت کی عملی مثال کے طور پر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی سے ایک واقعہ

پیش کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سارے مدینہ میں کھجور کے باغوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ مالدار تھے۔ ان کا سب سے اچھا باغ جو ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا، بیرحاء تھا، یہ بالکل مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کے میٹھے چشمے کا پانی پیا کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اتری تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "یا رسول اللہ! آپ پر یہ آیت اتری ہے اور مجھے اپنے مالوں میں سب سے زیادہ محبوب باغ بیرحاء ہے تو اب میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اللہ ہی کے ہاں اس کا اجر و صلہ چاہتا ہوں۔ یا رسول اللہ! اب آپ اس کو جس مصرف میں چاہیں لے آئیں۔"

حضورؐ نے فرمایا یہ تو بڑی چیز ہے، بڑا نفع بخش باغ ہے، میں نے تمہاری بات سن لی میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قرابت داروں میں تقسیم کر دو، ابوطلحہؓ نے کہا ایسا ہی کروں گا یا رسول اللہ! چنانچہ ابوطلحہؓ نے اس کو اپنے عزیزوں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (متفق علیہ)

احسان جتانا اور بدلہ چاہنا

انفاق کے لیے دوسرا بڑا اعام فتنہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ خرچ کرنے کو تو کرتے ہیں لیکن یہ خرچ کرنا اپنے ذاتی اغراض سے خالی نہیں ہوتا، یہ جس کو دیتے ہیں یا تو اس کے کسی احسان کا بدلہ چکاتے ہیں یا اس کو اپنے زیر احسان لانا چاہتے ہیں یا کم سے کم ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس دینے سے وہ شکر گزار اور ممنون ہوگا اور اس شکر گزاری اور ممنونیت کا اثر اس کی طرف سے کسی نہ کسی فائدہ کی شکل میں ضرور ظاہر ہوگا۔ اس قسم کا انفاق درحقیقت ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خرچ کرنا خدا کی راہ میں خرچ کرنا نہیں ہے بلکہ ایک کاروبار میں نفع کی امید پر سرمایہ لگانا ہے

چنانچہ جہاں کہیں ان کو کسی نفع کی توقع نہ ہو وہاں اول تو وہ اپنا مال لگانے سے بچتے ہیں لیکن اگر غلطی سے کہیں لگا بیٹھتے ہیں تو اپنا پورا فائدہ وصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ وصول نہیں ہو پاتا تو انتقام لینے پر اُتر آتے ہیں اور اس کے لیے ذلیل اور چھوٹے طریقے اختیار کرنے سے بھی باز نہیں آتے مثلاً یہ کہ جس کو انہوں نے کبھی کچھ دیا ہے اس پر احسان جتائیں گے، اس کو ناشکرا اور احسان فراموش قرار دیں گے، دوسروں کی موجودگی میں اس کے اوپر اپنے احسانات جتائیں گے، وقت بے وقت مختلف قسم کے طعنوں اور کچوکوں سے صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کے بیوی بچوں کے دل بھی زخمی کر دیں گے، ان کا مطالبہ یہ ہو گا کہ جب ایک مرتبہ انہوں نے اس کے اوپر کوئی چھوٹا یا بڑا احسان کر دیا ہے تو پھر مدت العمر کے لیے وہ اور اس کا پورا خاندان ان کا خانہ زاد غلام بن کے کیوں نہ رہا۔

جو لوگ اپنے انفاق کے پیچھے یہ بلا لگا لیتے ہیں وہ اپنے انفاق سے کوئی برکت حاصل کرنا تو الگ رہا اس سے اُلٹا نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ حرکتیں ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمدردی اور خیر خواہی کا ایک کلمہ سیم و زر کے اس ڈھیر سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جس کو دے کر احسان جتایا گیا ہو۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ	جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے
سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ	ہیں، پھر اپنے اس انفاق کے پیچھے احسان
مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ	اور ایذا کی آفت نہیں لگا دیتے ان کے
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا	لیے ان کا صلہ ہے ان کے رب کے
خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ	پاس نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور
یَحْزَنُوْنَ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ	نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ہمدردی کا ایک
خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ	کلمہ اور بخشش دینا بہتر ہے اس صدقے سے
اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ۝	جس کے پیچھے دل آزاری ہو اور اللہ
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	بے نیاز اور حلیم ہے۔ اے ایمان والو

صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

(۲۶۲-۲۶۴) بقرہ

تم اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے باطل نہ کرو، اس شخص کے مانند جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس شخص کی تمثیل ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، اس پر بارش ہو جائے اور اس کو بہا کر چٹان کو چٹیل چھوڑ دے ایسے لوگوں کو ان کی کمائی سے کچھ بھی پلے نہ پڑے گا اور اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا

احسان جتانے اور دل آزار باتیں کر دینے سے صدقات جس طرح باطل ہو جاتے ہیں، اس کی دوسری تمثیل قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاۗءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۔

(۲۶۶۔ بقرہ)

کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں جاری ہوں، اس میں اس کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں اور خود اس کا حال یہ ہو کہ اس پر بڑھاپا آچکا ہو اور وہ ناتواں بچے رکھتا ہو اور اس کے باغ پر سموم کا جھونکا آجائے جس سے وہ جل اٹھے۔

اس آفت سے اپنے انفاق کو بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی انفاق کرتے وقت اپنے آپ کو ہر قسم کی کاروباری ذہنیت سے پاک کر کے انفاق کرے، یہ خیال بالکل دل سے نکال دے کہ وہ اگر کسی کو کچھ دے رہا ہے تو اس پر کوئی احسان کر رہا ہے۔

اس خیال کے بجائے وہ اس امرِ واقعی کو ذہن نشین کرے کہ یہ اللہ کا اس کے اوپر بہت بڑا

احسان ہے کہ اس نے اس کو نہ صرف یہ کہ دینے کے قابل بنایا بلکہ دینے کی توفیق بھی بخشی، دیتے وقت آدمی کا ذہن جو ہونا چاہیے اس کی بہترین تعبیر قرآن کے ان الفاظ سے ہو رہی ہے:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ (دہر)	ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے کسی عوض اور شکرگزاری کے طالب نہیں ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے انفاق کا وہ صلہ چاہتا ہے جو اس کو باغ باغ کر دے، اس کو قرآن مجید کی یہ آیات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہییں۔

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی وَلَسَوْفَ یَرْضٰی (سورہ لیل)	جو دیتا ہے اپنا مال تزکیہ حاصل کرنے کے لیے اس پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کو اس کا بدلہ چکانا ہو، اس کے پیش نظر صرف اپنے پروردگار عالی شان کی رضا جوئی ہے اور وہ جلد نہال ہو جائے گا۔

سائلوں کے ساتھ بدسلوکی

انفاق کو برباد کرنے والی ایک بہت بڑی آفت وہ سلوک بھی ہے جو عام طور پر لوگ سائلوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مانگنے والوں کو کچھ دے تو دیتے ہیں لیکن اتنی جھڑکیاں اور اتنی صلواتیں سنا کر دیتے ہیں کہ وہ جتنی نیکی کماتے ہیں اس سے کہیں زیادہ گناہ اپنے سر چڑھا لیتے ہیں۔ ان جھڑکیوں اور صلواتوں کے پس پردہ چھپی تو ہوتی ہے عموماً ان کی طبیعت کی خست اور بخالت لیکن بعض لوگ اپنی اس حرکت کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے معاشرے کو گداگری کی ذلت سے پاک کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اوّل تو گداگری کی لعنت سے معاشرے کو پاک کرنے کے لیے یہ طریقہ ہی بے معنی ہے اور اگر بالفرض یہ کسی درجہ میں مفید بھی ہے تو اس کے لیے جھڑکیاں اور صلواتیں ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ یہ کام شائستہ انداز اور حکیمانہ طرز پر محبت اور شفقت کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس آفت سے بچنے کے لیے آدمی کو قرآن مجید کی یہ ہدایت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے اما السائل

فلا تنھر (سائل کو جھڑکو مت)

اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے سائل ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ان سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے بہت سے ایسے بھی ملتے ہیں جن کے گداگری کا پیشہ اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، بعض ایسے بھی ملتے ہیں جن کو دیکھ کر آدمی صاف سمجھ جاتا ہے کہ یہ بھگل بنائے ہوئے ہیں، اس طرح کے لوگوں کو دیکھ کر آدمی کو قدرتی طور پر غصہ آتا ہے تاہم ان پر غصہ کرنے اور ان کو جھڑکنے اور دھتکارنے سے کوئی فائدہ نہیں، اس سے ان کی اصلاح تو ہونے سے رہی، البتہ آدمی اپنے اخلاق کو بگاڑنے کا خواہ مخواہ ایک سبب پیدا کر لیتا ہے۔ اگر آدمی کچھ دے سکے تو دے دے اور اگر نہ دے سکے یا ان کو غیر مستحق سمجھے تو ہمدردی یا نصیحت کے چند کلمات کے ساتھ ان کو رخصت کرنے کی کوشش کرے۔

سائلوں کے بارے میں قرآن مجید نے بار بار ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے اور ان کو نرم جواب دینے کی جو ہدایت فرمائی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ بعض حالات میں چونکہ ان کا رویہ غصہ دلانے والا ہو سکتا ہے اس وجہ سے بار بار تاکید کی گئی کہ ان کو نرمی سے جواب دو۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔	جو خوش حالی اور تنگ حالی دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان والوں کو دوست رکھتا ہے

(۱۳۴، آل عمران)

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۔	دستور کے مطابق بات کہنا اور معاف کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو

(۲۶۳۔ بقرہ)

اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ	اگر تم ان سے اعراض کرنے پر مجبور ہو جاؤ

رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ۝ — اپنے رب کا فضل چاہتے ہوئے تو ان سے کوئی نرم بات۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ہم اور آپ سائلوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کریں گے تو سارا معاشرہ گداگری کا پیشہ اختیار کرے گا۔ لوگ گداگری کی ذلت اس وجہ سے نہیں اختیار کرتے کہ دینے والے بڑے خوش اخلاق اور فیاض ہیں، اس کے اسباب بڑے گہرے اور عمیق ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے اگر دینے والوں کی شرافت اور فیاضی گداگری کو فروغ دینے والی چیز ہوتی تو آخر تاریخ کے بہترین دور میں مدینہ منورہ میں یہ صورت حال کس طرح پیدا ہو جاتی کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال گلیوں میں لیے پھرتے لیکن ان کو کوئی سائل نہ ملتا۔

گداگری کو روکنا افراد کا کام نہیں، بلکہ حکومتوں کا کام ہے یہ چیز بڑی اہم معاشرتی و مذہبی تبدیلیوں سے روکی جاسکتی ہے۔ افراد کا کام یہ ہے کہ جب تک یہ صحیح تبدیلی واقع نہیں ہو جاتی وہ سائلوں کے معاملہ میں وہی روش اختیار کریں جس کی قرآن ہدایت کرتا ہے۔

انتقام و عناد کا جذبہ

بعض حالات میں انتقام و عناد کا جذبہ بھی آدمی کے انفاق کے لیے فتنہ بن جایا کرتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوا کرتی ہے جب آدمی کسی مقدم حقدار کے لیے انفاق کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ کسی سبب سے اس کو اس شخص سے نفرت یا عداوت ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے آپ کا کوئی عزیز یا آپ کا کوئی پڑوسی ہے جو مستحق مدد ہے، اسلام نے انفاق کے لیے جو ترتیب قائم کی ہے اس کی رو سے آپ کے انفاق کا اولین حقدار آپ کا وہی عزیز یا آپ کا وہی پڑوسی ہے لیکن آپ اس عزیز یا پڑوسی سے کوئی شکایت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو چھوڑ کر دوسروں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں، عزیزوں اور پڑوسیوں کے معاملہ میں ایسا بہت ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے خوش حال اور دولت مند لوگوں کے بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت غربت اور پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان کے خوش حال عزیز انفاق کے اہل اور عادی ہونے کے باوجود ان کی مدد نہیں کرتے ان کو نظر انداز کر کے دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنے عزیزوں سے کچھ واقعی یا غیر واقعی شکایت ہوتی ہیں۔

یہ طرز عمل اس ترتیب کو بالکل بدل دیتا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے انفاق کے لیے بتائی

ہے ۔ یہ حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ یہ ترتیب کوئی اتفاقی چیز نہیں بلکہ اس کے اندر معاشرے کو معیشت کی نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں جو اس کو بدل دینے کی شکل میں فوت ہو جاتی ہیں ۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر ہم اپنے انفاق کا مستحق انہی کو سمجھتے ہیں جن سے ہم راضی اور خوش ہیں اور جن کو اپنے منشأ کے مطابق پا رہے ہیں تو یہ انفاق بے غرض انفاق تو نہ ہوا ، یہ تو وہی غرض مندانہ اور کاروباری انفاق ہوا جس کو اللہ اور رسول نے باطل اور بے برکت قرار دیا ہے ۔

جو شخص انفاق کی برکتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا اس کو چاہیے کہ وہ اس ترتیب کو نہ ٹوٹنے دے جو اللہ اور اس کے رسول نے انفاق کے حق داروں کی بتا دی ہیں اگر اس ترتیب کے رو سے سر فہرست کوئی ایسا شخص آتا ہے جس سے اس کو کسی سبب سے نفرت ہے تو بھی اس کو ضرور دے اور اس کی غلطیوں سے درگزر کرے ۔ اور یہ آل عمران والی آیت میں انفاق کرنے والوں کی یہ صفت جو بیان کی گئی ہے کہ "وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرنے والے ہیں" بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔ وہ درحقیقت یہ ہے کہ جو لوگ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی غلطیوں سے درگزر و عفو کی طبیعت رکھنے والے ہیں وہی ہیں جو انفاق کا صحیح حق ادا کر سکتے ہیں ۔

ایک حدیث میں بھی اس انفاق کا بڑا درجہ بیان کیا گیا ہے جو کسی ایسے عزیز کے لیے کیا جائے جس کے متعلق انفاق کرنے والے کو یہ گمان ہو کہ وہ اپنے دل میں اس کی عداوت چھپائے ہوئے ہے ۔

اس انفاق کا درجہ بڑا ہونے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں :

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والا شخص اپنے خواہشات و جذبات سے بالاتر ہو کر محض اللہ کی رضا کے لیے ایک ایسے شخص کو اپنا مال دیتا ہے جس کو وہ اپنے مقصد اور اپنی اغراض کے خلاف پاتا ہے ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس انفاق میں انفاق کرنے والے کو دوگونہ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے ، ایک انفاق کی ، دوسری ایک ایسے شخص کے لیے انفاق کی جس سے اس کو نفرت ہے ۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں انفاق کرنے والا صلۂ رحم کا ایک ایسا حق ادا کرتا ہے جس سے

مردہ محبت داخوت کے از سر نو زندہ ہونے کی توقع ہے اور جس کا زندہ ہونا اللہ اور اس کے رسول کو بہت پسند ہے۔

ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی آدمی اچھی طرح سمجھ جائے تو وہ اپنے ان قرابت داروں کے اوپر خرچ کرنے میں سب سے زیادہ ٹھنڈک اور راحت محسوس کرے گا جن کو وہ اپنا دشمن سمجھتا ہے اور تجربہ اس کو بتا دے گا کہ اس انفاق سے زیادہ بابرکت انفاق اور کوئی نہیں ہے۔

انفاق کے سلسلہ کی ایک بڑی عام آفت احساس برتری بھی ہے

احساسِ برتری جو شخص اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم یا اپنے مذہب کے لیے کچھ خرچ کر سکے جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھ اس کے آگے پھیل رہے ہیں اور بہت سے ضرورت مند لوگ اس کی طرف رجوع کر رہے ہیں تو اس کے دماغ میں بڑائی اور برتری کی ہوا سما جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دینے والے کی پوزیشن میں پاکر لینے والوں کے مقابل میں بہت ارفع اور بہت اونچا خیال کرنے لگتے ہیں۔ بعض تنگ ظرف اپنے اس احساس کو دبا نہیں سکتے چنانچہ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ان کی زبانوں سے بھی ہونے لگتا ہے اور ان کے انداز و اطوار بھی اس کی شہادت دینے لگتے ہیں۔

یہ احساس اس جذبۂ شکر کی جڑ کاٹ دیتا ہے جس کو انفاق فی سبیل اللہ کا اصل محرک ہونا چاہیے اس سے آدمی مغرور، متکبر اور خود پسند بن جاتا ہے تواضع جو عبدیت کی روح اور انکسار جو بندگی کی جان ہے اس کے اندر سے غائب ہو جاتے ہیں، وہ لوگوں کی احتیاج اور تنگ دستی سے اپنے لیے کوئی مفید سبق حاصل کرنے کے بجائے اس کو ہیتوں پر اپنی آقائی اور خدائی جتانے کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی جو کچھ ہے کسی اور کا بخشا ہوا ہے اور اس کی یہ بخشش کسی استحقاق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض اس کا فضل و کرم ہے۔

آدمی اگر اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہے تو اس کے لیے سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ جب سائل اور محتاج کو بھی دیکھے، اس سے یہ سبق سیکھنے کی کوشش کرے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کو بھی اسی سائل کی حیثیت میں پیدا کر سکتا تھا اور اگر چاہے تو اب بھی اسی کی صف میں اس کو کھڑا کر سکتا ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جب کسی کو کوئی چیز دے تو اس کی ہیئت اس بات کی گواہی

دے رہی ہو کہ اس کا دل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے اور اس کو اس بات پر کوئی فخر نہیں ہے کہ وہ دے رہا ہے بلکہ اس بات پر اپنے رب کا شکر گزار ہے کہ اس نے اس کو دینے کے لائق بنایا اور پھر دینے کی توفیق بخشی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ — جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں
الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ـ — اور حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل جھکے
(۵۵۔ مائدہ) — ہوئے ہوتے ہیں۔

اس آیت کو تلاوت کرتے وقت مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں وَهُمْ رٰكِعُوْنَ درحقیقت ایتائے زکوٰۃ کی ہیئت وحالت کو ظاہر کر رہا ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ زکوٰۃ دینے والے متکبر دولت مندوں کی طرح اپنی زکوٰۃ کو اپنی شان دولت مندی کی نمائش کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ عبدیت اور بندگی کی جو شان ان کے اندر نماز پیدا کرتی ہے وہی شان ان کی زکوٰۃ میں بھی ہوتا ہے وہ کسی کو اپنی زکوٰۃ دیتے ہیں تو مغروروں کی طرح تن کر نہیں دیتے بلکہ خدا کے شکر گزار اور خاکسار بندوں کی طرح سر جھکا کر دیتے ہیں۔

ریا اور نمائش

ریا اور نمائش بھی ایک بہت عام فتنہ ہے جس میں انفاق کرنے والے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ یوں تو ریا نیکی کے ہر کام کو برباد کرنے کے لیے اس میں آگھستی ہے لیکن بعض کاموں میں اس کے گھس آنے کے بہت سے مواقع ہیں۔ ان میں سے یہ انفاق کا کام بھی اپنے اندر ریا اور نمائش کے در آنے کے لیے بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ اوّل تو آدمی کو اپنی دولت مندی کے اشتہار کی یوں ہی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ پھر اگر یہ اشتہار اس کو دین کے واسطے سے حاصل ہو تو کیا کہنا ہے چنانچہ بہت سے شہرت کے مریض اس میدان میں آکودتے ہیں اور وہ مختلف قومی اور مذہبی کاموں میں محض اس خیال سے پیسے دیتے ہیں کہ ایک ہی ساتھ ان کی مالداری اور ان کی دینداری دونوں کی دھوم مچ جائے بعض اوقات اس میں بعض دوسرے اغراض ومقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں مثلاً حکام وقت کی خوشنودی اور پھر ان سے استفادہ یا کسی انجمن کی صدارت یا ریاست یا کسی طبقہ کو خوش کر کے اس کا ووٹ حاصل کرنا، اس طرح سے یہ ایک کاروبار بھی بن جاتا ہے۔ بعض لوگ اس نمود ونمائش کے اتنے رسیا ہوتے ہیں کہ وہ اس کام میں

کبھی ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے جہاں سرِفہرست اخبار میں ان کو اپنے نام کے آنے کی توقع نہ ہو اگرچہ وہ کام فی الواقع کتنا ہی مفید ہو۔ بعض دینے سے پہلے اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے دینے کی شہرت ہو جائے۔ بعض ان سے بھی چار قدم آگے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ دیں دلائیں تو کوڑی نہیں لیکن ان کے دینے کی چار دانگ عالم میں دھوم مچ جائے۔

اس زمانہ میں اس اخباری انفاق کے لیے ایک وجہ جواز بھی تلاش کر لی گئی ہے وہ یہ کہ اس سے دوسروں کو انفاق کی ترغیب ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ اس سے دوسروں کو بھی اس مقصد کے لیے خرچ کرنے کی تحریک ہوتی ہے لیکن اس زمانہ میں اس انفاق بالجہر کا طریقہ ہی بس ایک رہ گیا ہے جس پر لوگوں کو اعتماد رہ گیا ہے۔ سرًا خرچ کرنے والی بات اب ہر جگہ سے غائب ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ دینی حلقوں میں بھی اب اس کا کچھ اہتمام نہیں رہ گیا ہے حالاں کہ تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ خصوصاً جو شخص اپنے انفاق کو ریا کی آلائش سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اس کے لیے تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ جتنا علانیہ خرچ کرے اس سے زیادہ پوشیدہ طور پر خرچ کرے جس کی اس کے رب اور اس شخص کے سوا کسی کو بھی خبر نہ ہو جس کے لیے اس نے خرچ کیا ہے۔

روزہ اور آفاتِ روزہ

شہوات اور خواہشات نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے، اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے، بالخصوص تزکیہ نفس کے جتنے طریقے بھی غلط یا صحیح، دنیا میں اب تک اختیار کیے گئے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے آداب و شرائط اسلام کی نسبت سے زیادہ سخت تھے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں، جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی تربیت و اصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے، اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفسِ انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زوردار ہیں، ان میں شہوات، خواہشات اور جذبات

سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی فطرت میں اشتعال ہیجان اور جوش ہے اس وجہ سے ارادہ کو ان پر پانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجائے ان کے یک قلم ختم کر دینے کی تدبیریں سوچیں اور اختیار کیں۔ لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزاء میں سے ہیں، جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہسوار بڑی ریاضتوں بڑی مشقوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی عبادت اسلام نے اس لیے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفسِ انسانی کے یہ سرکش رجحانات ضعیف ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوتِ ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدودِ الٰہی کا پابند بنانے کے لیے طاقت ور ہو جائے۔ اپنے اس دو طرفہ عمل کے سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ پہلے اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے اس کے بعد اس کی آفات بیان کریں گے۔

روزے کی برکات

روحِ ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی انسان کی رُوحِ ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روحِ ملکوتی کا حقیقی میلان ملاءِ اعلیٰ کی طرف ہے۔ وہ فطری طور پر خدا کے تقرب، ملائکہ سے تشبہ اور سفلیات سے تجرد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجائے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لیے پرواز کرنا چاہتی ہے، رُوح کے ان تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں جو خواہشات و شہوات سے پیدا ہوتے ہیں، ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے، اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات و شہوات ہی کو ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہشات و شہوات کے مطالبے پورے کرنے سے انسان کو کوئی فوری لذت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اسلئے اس کے لیے انسان کو اپنی بہت سی فوری لذتوں اور راحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

یہ صورتِ حال ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت عرصہ تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو پھر

نہ صرف یہ کہ اس کی قوتِ پرواز ختم ہو جاتی ہے بلکہ آہستہ آہستہ وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے
روزہ اس صورتِ حال میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عاید کر دیتا ہے جو شہوات و خواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہو جاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دلچسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہواتی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہو جاتی ہیں اور روحِ ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لیے موقع مل جاتا ہے۔

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں لیکن روزے میں دنیا اور لذاتِ دنیا کو ترک کر کے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں جو مشقت اٹھاتا ہے وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرّد، ترکِ دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں جائز رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیتِ نفس کے لیے اس کو پسند فرمایا ہے، اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لیے جھیلتا ہے کہ اس کی روح اس عالمِ ناسوت کی دلدل سے آزاد ہو کر عالمِ لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ خاص نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے :

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے مگر روزہ۔ یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک

سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہیے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس کو اس وقت حاصل ہو گی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔"

ایک دوسری روایت میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس روایت کا ترجمہ بھی یہاں دیے دیتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے (مسلم کے الفاظ ہیں کہ) نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہش میرے لیے قربان کرتا ہے روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، دوسری خوشی اس کو اپنے رب کی ملاقات کے وقت حاصل ہو گی اور اس کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے، اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے؟

اس کو اپنے لیے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے جن کا

اس کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادی خوشیاں اور تمام مادی لذتیں سمٹی ہوئی ہیں، ان لذتوں سے محض اللہ کی رضا کے لیے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اس نے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لیے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات وخصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجیے ایک نیکی سازگار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق واختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیے وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہوگا اور ہر حق دار اس اجر کو حاصل کرلے گا لیکن روزے کی جو عبادت ہے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق ہوگا جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ جب جزا دینے کا وقت آئے گا، تب وہی اس کو سمجھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزہ رکھنے والے کو صلہ دے گا جس عبادت کی جزا کے لیے یہ کچھ اہتمام ہوگا کون اندازہ کرسکتا ہے کہ آسمان وزمین سب کا مالک اس کی کیا جزا دے گا۔

سدِّ ابواب فتنہ

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ آدمی کے اندر فتنہ کے جو بڑے بڑے دروازے ہیں، روزہ ان کو بہت بڑی حد تک بند کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر فتنے کے بڑے دروازے جیسا کہ ایک سے زیادہ حدیثوں میں تصریح ہے بطن اور فرج ہیں، انہی کے سبب سے آدمی نہ جانے خودکتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں معلوم کتنی ہلاکتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی راستے ہیں، جن سے شیطان، انسان پر سب سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی حفاظت کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے

جنت کی ضمانت دی ہے جو شخص ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دے سکے، ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں کلوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان ہیں، میں اس کے لیے جنّت کا ضامن بنتا ہوں۔"

(متفق علیہ)

روزہ ان کی حفاظت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتا ہے۔ انسان کے لیے روزے میں صرف کھانا پینا ہی حرام نہیں ہو جاتا بلکہ لڑنا جھگڑنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور غیر ضروری باتوں میں حصہ لینا بھی روزے کے مقصد کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے، اسی طرح روزے میں صرف شہوانی تقاضوں کا پورا کرنا ہی حرام نہیں ہو جاتا بلکہ وہ تمام چیزیں بھی روزے کے منشاء کے خلاف ہیں جو اس کے شہوانی میلانات کو شہ دینے والی ہوں۔ روزہ خود بھی ان میلانات کو ضعیف کرتا ہے اور روزہ دار کو بھی ہدایت ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو ان تمام مواقع سے دور رکھے جہاں سے اس کے ان رجحانات کو غذا بہم پہنچ جانے کا امکان ہو۔

فتنہ کے دروازوں کے بند ہو جانے سے اس کے لیے ان کاموں کا کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے جو خدا کی رضا کے کام ہیں اور جن سے جنّت حاصل ہوتی ہے اور ان کاموں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف کام ہیں اور جن کے سبب سے آدمی دوزخ میں پڑے گا۔ شیطان اس کے آگے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری چوکڑی بھول جاتی ہے وہ ڈھونڈتا ہے لیکن اس کو روزہ دار پر حملہ کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں ملتی۔ یہی حقیقت ہے جو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے، جنّت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔" (متفق علیہ)

قوتِ ارادی کی تربیت

روزے کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کی قوتِ ارادی کی بہترین طریقہ پر تربیت کرتا ہے۔ شریعت کے حدود کی پابندی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کی قوتِ ارادی نہایت مضبوط ہو، بغیر مضبوط قوتِ ارادی کے یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص شہوات وجذبات اور خواہشات کے بغیر معتدل ہیجانات کو دبا سکے اور جو شخص ان کے مفرط ہیجان کو دبا نہیں سکتا اس کے لیے یہ محال ہے کہ وہ شریعت کے حدود کو قائم رکھ سکے۔ ایک ضعیف اور پلپلے ارادہ کا آدمی ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ جب بھی کوئی چیز اس کے غصہ کو اشتعال دلانے والی سامنے آجائے گی وہ بڑی آسانی سے اس سے مغلوب ہو جائے گا۔ جب بھی کوئی طمع پیدا کرنے والی چیز اس کو اشارہ کر دے گی وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا اور جہاں بھی کوئی چیز اس کی اکساتے والی نظر آجائے گی وہیں وہ پھسل کے گر پڑے گا۔ اس طرح کی ضعیف قوتِ ارادی کا انسان دنیا میں عزم وہمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ وہ شریعت کے حدود وقیود کی پابندی کر سکے۔ بالخصوص شریعت کا وہ حصہ جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے مضبوط صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس صبر کی مشق روزے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی صبر سے وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو روزے کا اصل مقصود ہے۔

چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔	اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

"تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو" یعنی تاکہ صبر اور برداشت کی تربیت سے تمہاری قوتِ ارادی مضبوط ہو اور تمام ترغیبات وتحریکات اور تمام مشکلات وموانع کا مقابلہ کر کے تم شریعت کے حدود پر قائم رہ سکو۔

یہی قوتِ مومن کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جس سے وہ شیطان کے ہر وار کو روک

سکتا ہے جو وہ خواہشات و جذبات اور شہوات کی راہ سے اس پر کرتا ہے چنانچہ اسی بنیاد پر اس حدیث میں جو اوپر گذر چکی ہے، روزے کو ایک ڈھال کہا گیا ہے اور روزہ دار کو یہ ڈھال استعمال کرنے کی تعلیم یوں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ یا لڑائی جھگڑا شروع کر دے تو اس سے کہے کہ میں روزے سے ہوں۔

جذبۂ ایثار کی پرورش

روزے سے انسان کے اندر جذبۂ ایثار کی بھی پرورش ہوتی ہے، اور یہ جذبہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات میں سے ایک ہے جن سے ہزاروں نیکیوں کے لیے اس کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب روزے میں بھوکا پیاسا رہتا ہے اور اپنی دوسری خواہشوں کو بھی دبانے پر مجبور ہوتا ہے تو اس طرح اسے غریبوں، فاقہ کشوں، محتاجوں اور مظلوموں کے دکھ درد اور ان کے شب و روز کا اندازہ کرنے کا بذات خود موقع ملتا ہے وہ بھوک اور پیاس کا مزا چکھ کر بھوکوں اور پیاسوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر قدرتی طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔ روزے کا یہ اثر ہر شخص پر اس کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پڑتا ہے، کسی پر کم پڑتا ہے، کسی پر زیادہ، لیکن جس شخص کے روزے میں روزے کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان پر روزے کا یہ اثر پڑتا ضرور ہے، جن کا جذبۂ ایثار کمزور ہوتا ہے روزہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی متحرک کر دیتا ہے اور جن کے اندر یہ جذبہ قوی ہوتا ہے، ان کے لیے تو روزوں کا مہینہ اس جذبے کے ابھرنے کے لیے گویا موسمِ بہار ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تردستیاں اور فیض بخشیاں یوں تو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھیں، لیکن رمضان کا مہینہ تو گویا آپ کے جود و کرم کا موسم بہار ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے لیکن رمضان میں تو گویا آپ سراپا جود و کرم ہی بن جاتے تھے۔" (متفق علیہ)

قرآن مجید سے مناسبت

روزے کی حالت میں آدمی کی مناسبت قرآن مجید کے ساتھ بہت بڑھ جاتی ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ دنیاوی مشاغل کا بوجھ روزہ دار کے اوپر سے اترا ہوا ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نفس کے میلانات و رجحانات میں جیسا کہ ہم اوپر

بیان کر چکے ہیں روزے کے سبب سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاموشی، خلوت، غیر ضروری مصروفیتوں سے علیحدگی اور ترک و انقطاع کی ایک مخصوص زندگی جو روزہ دار کو حاصل ہوتی ہے قرآن کی تلاوت اور اس کے تدبر کے لیے کچھ خاص موزونیت رکھتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت اتاری جب آپ غارِ حرا میں معتکف تھے۔ نیز قرآن کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینے کو منتخب فرمایا اور اس نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس پورے مہینے میں روزے رکھنا امت پر فرض قرار دیا۔ بعض احادیث میں وارد ہے کہ رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر شب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرأت قرآن مجید کا مذاکرہ کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے اور جتنا قرآن مجید نازل ہو چکا ہوا ہوتا تھا اس کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ رمضان کی راتوں میں تراویح میں قرآن مجید کے سننے اور سنانے کی جو اہمیت ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ قرآن مجید کو روزوں سے اور روزوں کو قرآن مجید سے گہری مناسبت ہے۔

تبتّل الی اللہ

روزے کی اصل غایت دل، دماغ، جسم اور روح سب کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں تبتّل الی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مقام آدمی کو روزے سے حاصل ہوتا ہے، اور اسی کو حاصل کرنے کے لیے روزے کے ساتھ اعتکاف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اعتکاف اگرچہ ہر شخص کے لیے رمضان کے روزوں کی طرح ضروری چیز نہیں ہے بلکہ یہ اختیاری عبادت ہے لیکن تزکیہ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر رمضان کے آخری عشرہ میں جب کہ روح میں تجرد و انقطاع اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ایک خاص کیفیت و حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو اس سے روزے کا جو اصل مقصود ہے وہ کمال درجہ حاصل ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں جو اہتمام فرماتے تھے، اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح فرماتی ہیں:

> "جب رمضان کا آخری عشرہ آتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب بیداری فرماتے، اپنے اہل و عیال کو بھی شب بیداری کے لیے اٹھاتے اور کمر کس کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے۔"

روزے کی آفات اور اُن کا علاج

روزے کی برکات میں سے یہ چند برکات ہم نے بیان کی ہیں لیکن یہ برکتیں اس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جب آدمی اپنے روزے کو ان تمام آفتوں سے محفوظ رکھ سکے جو روزے کو خراب کر دینے والی ہیں۔ یہ آفتیں چھوٹی اور بڑی بہت سی ہیں۔ ہم تزکیہ نفس کے طالبوں کی واقفیت کے لیے یہاں چند بڑی آفتوں کا ذکر کریں گے اور ساتھ ہی ان کے وہ علاج بھی بتائیں گے جو قرآن اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں تاکہ جو لوگ اپنے روزوں کی حفاظت کرنا چاہیں، ان سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

لذتیں اور چٹخاروں کا شوق

روزے کی عبادت جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں پر قابو پا سکے یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب آدمی اس مقصد کو روزوں میں ملحوظ رکھے اور ان رغبتوں کو حتی الامکان دبائے جن کے آگے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اکثر بے بس ہو جایا کرتا ہے اور یہ بے بسی اس کو بہت سی اخلاقی اور شرعی کمزوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے لیکن بہت سے لوگ اس مقصد کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتے، ان کے نزدیک روزے کا مہینہ خاص کھانے پینے کا مہینہ ہوتا ہے۔ بعض

لوگوں کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کھانے پینے پر جتنا بھی خرچ کیا جائے، خدا کے ہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اگر خوش قسمتی سے کچھ خوش حال بھی ہوتے ہیں تو پھر تو فی الواقع ان کے لیے روزوں کا مہینہ کام و دہن کی لذتوں سے متمتع ہونے کا موسم بہار ہی بن کے آتا ہے۔ وہ روزے کی پیدا کی ہوئی بھوک اور پیاس کو نفس کشی کے بجائے نفس پروری کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک طرح طرح کے پکوانوں کے پروگرام بنانے اور ان کے تیار کرانے میں اپنے وقت صرف کرتے ہیں اور افطار سے لے کر سحر تک اپنی زبان اور اپنے پیٹ کی تواضع میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔

میں ایک ایسے بزرگ سے واقف ہوں جو ایک دیندار آدمی تھے لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ رمضان کا مہینہ کھانے پینے کا خاص مہینہ ہے چنانچہ اس نظریہ کے تحت وہ رمضان کے مہینے کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کا اہتمام بہت پہلے سے شروع کر دیتے تاکہ رمضان میں ان کے تنوعات سے متمتع ہو سکیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ کھانے پینے کے شوق کو اکسا دیتا ہے لیکن روزے کا مقصود اسی اکساہٹ کو دبانا ہے نہ کہ اس کی پرورش کرنا، اس وجہ سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوتِ کار کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن ہرگز ہرگز کھانے پینے کو اپنی زندگی کا موضوع نہ بنائے جو کچھ بغیر کسی خاص سرگرمی اور بغیر کسی خاص اہتمام کے میسر آجائے اس کو صبر و شکر کے ساتھ کھا لے اگر کوئی چیز پسند کے خلاف سامنے آئے تو اس پر بھی گھر والوں پر غصّہ کا اظہار نہ کرے۔ اگر کسی کو خدا نے فراغت و خوشحالی دی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ خود اپنے کھانے پینے پر اسراف کرنے کے بجائے غریب اور مسکین روزہ داروں کی مدد اور ان کو کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ اس چیز سے اس کے روزے کی روحانیت اور برکت میں بڑا اضافہ ہوگا۔ رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی کا جو حال ہوتا تھا اس کے متعلق ایک حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ روزہ افطار کرانے کے ثواب سے متعلق ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"زید بن خالد جہنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا، اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔" (ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی)

اشتعالِ طبیعت

آدمی جب بھوکا پیاسا ہو تو قاعدہ ہے کہ اس کا غصہ بڑھ جایا کرتا ہے جہاں کوئی بات ذرا بھی اس کے مزاج کے خلاف ہوئی فوراً اس کو غصہ آجاتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے یہ چیز بھی ہے کہ جن کی طبیعتوں میں غصہ زیادہ ہو وہ روزے کے ذریعہ سے اپنی طبیعتوں کی اصلاح کریں۔ لیکن یہ اصلاح اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب آدمی روزے کو اپنی طبیعت کی اس خرابی کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اگر وہ اس کو اپنی طبیعت کی اصلاح کا ذریعہ نہ بنائے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ روزہ اس پہلو سے اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے اُلٹا مضر ہو جائے یعنی اس کی طبیعت کا اشتعال کچھ اور زیادہ ترقی کر جائے۔ جو شخص اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو یا کوئی دوسرا اس کے اندر اس اشتعال کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اس بات کو یاد کرے کہ "اَنَا صَائِمٌ" میں روزے سے ہوں اور یہ چیز روزے کے مقصد کے بالکل منافی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کو غصہ پر قابو پانے کی تربیت ملتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تربیت اس کے مزاج کو بالکل بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے غصہ پر اس حد تک قابو حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ وہیں استعمال کرتا ہے جہاں وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔

لیکن بہت سے لوگ اسلام کے بتائے ہوئے اس اصول کے بالکل خلاف روزے کو سپر کے بجائے تلوار کے طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جاتے ہیں یعنی روزہ ان کے لیے ضبطِ نفس کے بجائے اشتعالِ نفس کا بہانہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ بیوی پر، بچوں پر، نوکروں پر، ماتحتوں پر، ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے ہیں، صلواتیں سناتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں اور بعض حالات میں مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کرتے اور پھر اپنے آپ کو اس خیال سے تسلی دے لیتے ہیں کہ کیا کریں، روزے میں ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

جو لوگ اپنے نفس کو اس راہ پر ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے روزہ اصلاحِ نفس کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کے بگڑے ہوئے نفس کو بگاڑنے کا مزید سبب بن جایا کرتا ہے۔ جو روزہ بھی وہ رکھتے ہیں وہ ان کے نفس مشتعل کے لیے چابک کا کام دیتا ہے جس سے ان کا نفس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص روزے کی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اسے چاہیے

کہ وہ روزے کو اپنے نفس کے لیے ایک لگام کے طور پر استعمال کرے اور ہر اشتعال دلانے والی بات کو اسی سپر پہ روکے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزے کے احترام کا یہ احساس طبیعت پر غالب رہے تو آدمی بڑی بڑی ناگوار بات بھی برداشت کر جاتا ہے اور اس پر کوئی احساس کمتری طاری نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی آزمائش کے جتنے مواقع اس کے سامنے آتے ہیں وہ ہر موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان پر ایک فتح حاصل کی ہے اور اس فتح کا احساس اس کے غصہ کو ایک راحت و اطمینان کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دل بہلانے والی چیزوں کی رغبت

روزے کی ایک عام آفت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جن کے ذہن کی تربیت نہیں ہوئی ہوتی ہے، کھانے پینے اور زندگی کی بعض دوسری دلچسپیوں سے علیحدگی کو ایک محرومی سمجھتے ہیں اور اس محرومی کے سبب سے ان کے لیے دن کاٹنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس مشکل کا حل وہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ بعض ایسی دلچسپیاں تلاش کر لیتے ہیں جو ان کے خیال میں روزے کے مقصد کے منافی نہیں ہوتیں مثلاً یہ کہ تاش کھیلتے ہیں، ناول، ڈرامے اور افسانے پڑھتے ہیں، ریڈیو پہ گانے سنتے ہیں، دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور بعض من چلے سینما کے ایک آدھ شو دیکھ آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں خیال کرتے۔

ان سب سے زیادہ سہل الحصول دلچسپی بعض لوگ یہ پیدا کر لیتے ہیں کہ اگر ایک دو ساتھی میسر آجائیں تو کسی کی غیبت میں لپٹ جاتے ہیں۔ روزے کی بھوک میں آدمی کا گوشت بڑا لذیذ معلوم ہوتا ہے اور تجربہ گواہی دیتا ہے کہ اگر روزہ رکھ کے آدمی کو یہ لذیذ مشغلہ مل جائے تو آدمی جھوٹ، غیبت، ہجو اور اس قسم کی دوسری آفتوں کا جن کو حدیث میں حصائد اللسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک انبار لگا دیتا ہے اور اسی مشغلہ میں صبح سے شام کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے روزے کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کے ضروری آداب میں سے سمجھے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ پچھلے مذاہب میں چپ رہنا بھی روزے کے شرائط میں داخل تھا چنانچہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام روزہ کی حالت میں صرف اشارہ

سے بات کرتی ہیں۔ اسلام نے روزہ داروں پر یہ پابندی تو عائد نہیں کی ہے لیکن اس پابندی تو عائد نہیں کی ہے لیکن اس پابندی کے تر ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی روزے میں اپنی زبان کو چھوٹ دے دے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ضروری اور مفید بات کرنے کا موقع پیش آجائے تو کرلے ورنہ خاموش رہے جو شخص ہر قسم کی اناپ شناپ اور جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا رہتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ پھر اس کا محض کھانا پینا چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بالکل بے نتیجہ کام ہے؛

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالےٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"۔

(ریاض الصالحین بحوالہ بخاری)

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی کا جو وقت گھر کے کام کاج اور معاش کی مصروفیتوں سے فاضل بچے اس کو مفید چیزوں کے مطالعہ میں صرف کرے۔ روزے کے دنوں کے لیے قرآن شریف، حدیث شریف، سیرتِ نبوی، سیرت صحابہؓ اور تزکیہ نفس کی کتابوں کے مطالعہ کا ایک باقاعدہ پروگرام بنالے۔ خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے تدبر پر پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف کرے۔ قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر روزہ دار کو ان برکتوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن مجید اور ماثور دعاؤں کے یاد کرنے کے لیے بھی آدمی کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکالے اس طرح قرآن مجید اور مسنون دعاؤں کا آدمی کے پاس آہستہ آہستہ ایک ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، جو آدمی کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کے ذخیروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

ریا

ریا کا فتنہ جس طرح تمام عبادتوں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اسی طرح روزے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ روزے تو رکھتے ہیں، بالخصوص رمضان کے روزے لیکن ہو سکتا ہے کہ ان میں بہت کچھ دخل اس احساس کو بھی ہو کہ روزے نہ رکھے تو پاس پڑوس

کے روزہ داروں میں نکو بننا پڑے گا۔ یا لوگوں میں جو دینداری کا بھرم ہے وہ جاتا رہے گا۔ یا اپنے گھر اور خاندان والے ہی بُرا مانیں گے۔ اس طرح کے مختلف احساسات ہیں جو رمضان کے روزوں میں شریک بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ خلوصِ نیت آلودہ اور مشتبہ ہو جایا کرتا ہے جو روزے کی حقیقی برکتوں کے ظہور کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ جس روزے میں خدا کی خوشنودی کے سوا کوئی اور محرک شریک ہو جائے۔ یہ روزہ وہ روزہ نہیں ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

"بندہ میرے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت چھوڑتا ہے، روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا۔"

بلکہ یہ روزہ اسی غرض کے لیے ہو جائے گا جس غرض کے لیے رکھا گیا ہے۔

اس آفت کا اوّل علاج تو یہ ہے کہ آدمی اپنی نیت کو ہر دوسرے شائبہ سے حتی الامکان پاک کرنے کی کوشش کرے اسے ہر روز اسے سوچنا چاہیے کہ اپنے روزے کو تمام برکتوں سے محروم کر کے فاقہ کے درجہ میں ڈال دینا انتہائی نادانی ہے، آخر یہ مشقت اٹھانے کا حاصل کیا ہوا سوائے اس کے کہ یہ دنیا میں بھی موجب کلفت اور آخرت میں بھی موجب وبال بنے۔ اس طرح نفس کے سامنے بار بار روزہ کی قدر و قیمت واضح کرنی چاہیے تاکہ اس کی نگاہ دوسروں کی طرف سے ہٹ کر خدا کی طرف متوجہ ہو۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی رکھے اور اس میں دو باتوں کا اہتمام کرے، ایک حتی الامکان اخفا کا، یعنی ان کا اشتہار دینے کی کوشش نہ کرے۔ دوسری اعتدال یا میانہ روی کا یعنی نفلی روزے اسی حد تک رکھے جس حد تک خواہشات و شہوات کو حالتِ اعتدال پر لانے کے لیے ان کی ضرورت ہو، اگر اس حد سے آدمی بڑھ جائے گا تو وہ چیز خود بھی ایک فتنہ ہے اور اسلام نے اس سے بھی بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے۔ روزے کی حیثیت ایک دوا کی ہے، دوا اگر ضرورت سے زیادہ استعمال کر لی جائے تو بسا اوقات یہ خود بھی ایک بیماری بن جاتی ہے۔

حج اور آفات حج

ہم نے تمہید والی فصل میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نفس انسانی کی جملہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے حج کی حیثیت ایک اکسیر جامع کی ہے۔ اس ایک ہی نسخہ کے اندر ان تمام نسخوں کے اصلی اجزاء جمع کر دیے گئے ہیں جو اسلام نے الگ الگ امراض کے لیے الگ الگ تجویز کیے ہیں۔ یہ نسخہ ایک جامع نسخہ بھی ہے اور اگر اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو اس کا مفید ہونا بھی ایک حتمی اور قطعی شے ہے۔ پہلے ہم اس کی جامعیت پر روشنی ڈالیں گے۔

حج جامع عبادات ہے

اس عبادت کی جامعیت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں۔ سب کی روح اس کے اندر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، موجود ہے، اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:

نماز دین کی تمام عبادتوں میں اساس اور ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب آئیے دیکھیے کہ یہ عبادت حج میں کس طرح شامل ہے؟

سب سے زیادہ واضح پہلو تو یہ ہے کہ حج کا سفر آدمی کرتا ہی ہے اس گھر کے لیے جو ہماری تمام نمازوں اور ہماری تمام مسجدوں کا مرکز ہے۔ نماز کے لیے پہلا گھر جو اس زمین پر تعمیر ہوا ہے

وہ بیت اللہ ہے اور ہماری تمام مسجدوں کو مسجد ہونے کا جو شرف حاصل ہوا ہے وہ اسی گھر کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ اس وجہ سے جب کوئی شخص حج کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے اس سفر کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس مرکزِ نماز کی طرف رخ کر کے وہ زندگی بھر نماز پڑھتا رہا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اب عین اس مرکز میں پہنچ کر نماز پڑھے اور جس مسجد نے دنیا کی تمام مسجدوں کو مسجدیت کا اعزاز بخشا ہے عین اس مسجد میں جا کر سجدہ ریز ہو۔

علاوہ ازیں حج میں نماز کی وہ قسم بھی شامل ہے جس کے ادا کرنے کی سعادت آدمی کو حج کے سوا اور کسی دوسرے موقع پر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ میری مراد طواف سے ہے۔ قرآن مجید کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ طواف بھی درحقیقت نماز ہے۔ یہ نماز صرف خانہ کعبہ کے اردگرد ہی ادا کی جا سکتی ہے، اس کے سوا دنیا میں اور کہیں بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس نماز میں بندہ جب حجرِ اسود کو، جس کو اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کہا گیا ہے، بوسہ دے کر، یا اس کو ہاتھ لگا کر بار بار اپنے رب کے ساتھ اپنے عہدِ اطاعت کی تجدید کرتا ہے اور پھر خانہ کعبہ کے اردگرد دعائیں پڑھتا ہوا اس طرح چکر لگاتا ہے جس طرح شمع کے اردگرد پروانہ چکر کرتا ہے تو غافل سے غافل انسان کی روح بھی وجد میں آجاتی ہے پھر جب آدمی خیال کرتا ہے کہ اس کی یہ نماز مشابہ ہے اس نماز سے جو فرشتے عرشِ الٰہی کے اردگرد پڑھ رہے ہیں تو ایک صاحبِ دل کے دل کی جو حالت ہوتی ہے، یا ہو سکتی ہے وہ حالت کسی طرح بھی لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

نماز کے بعد اسلامی عبادات میں دوسرا درجہ زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں انفاق کا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حج کے اندر انفاق کا بھی ایک نمایاں حصہ ہے۔ حج کے لیے زادِ راہ کا انتظام، عام لوگوں کے لیے جن کی آمدنی کے ذرائع بالکل محدود ہیں، ایک بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے، بالخصوص اس زمانہ میں تو یہ مسئلہ مشکل سے مشکل تر ہو گیا ہے، اس لیے کہ ایک طرف وسائلِ سفر اور ضروریاتِ سفر میں سے ہر چیز گراں سے گراں تر ہو گئی ہے ثانیاً حجاز کی حکومت اور وہاں کے عام باشندے بھی حجاج کو اللہ کے مہمان سمجھنے کے بجائے ان کو اپنے لیے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، اور تمام ممکن راستے ان کو زیرِ بار کرنے کے اختیار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جو شخص حج کے لیے نکلتا ہے بالعموم اپنی آمدنی کے موجود ذرائع سے کم از کم زمانہ سفر تک کے لیے اگر یک قلم نہیں تو بہت بڑی حد تک دست کش

ہو کر نکلتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی اگلی اور پچھلی کمائی کا بڑا حصہ اپنی اصلاحِ نفس کے اس جہاد پر صرف کر دیتا ہے۔

اسی طرح حج میں روزے کی روح بھی موجود ہے۔ روزے کی اصل روح ہم بیان کر چکے ہیں کہ ترک و انقطاع اور تبتل الی اللہ ہے۔ یہ چیز حج کے اندر بدرجہ کمال موجود ہے۔ احرام میں جو پابندیاں ہیں وہ اگرچہ مدت کے اعتبار سے روزے کی پابندیوں کے مقابل ہلکی ہیں لیکن اپنے مزاج اور اپنی کیفیت کے لحاظ سے ان سے زیادہ سخت ہیں۔ روزے میں زہد اور درویشی کی جو جھلک ہے وہ حج میں بالخصوص حالتِ احرام میں اپنے اس آخری درجہ تک پہنچ جاتی ہے جس درجہ تک اسلام نے اس کو پسند کیا ہے۔ اس سے آگے رہبانیت کے حدود شروع ہو جاتے ہیں جو اسلام میں ناجائز ہے۔

نماز، انفاق اور روزہ، یہ اسلام میں مستقل عبادات کی حیثیت رکھتے ہیں، اور آپ نے دیکھ لیا کہ حج میں ان سب کی روح شامل ہے لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادتیں بھی ہیں جن کا مطالبہ اسلام نے صرف خاص خاص حالات ہی کے اندر کیا ہے۔ مثلاً ہجرت اور جہاد۔ یہ عبادتیں اگرچہ ہنگامی ہیں لیکن جب ان کا وقت آجاتا ہے تو دین میں ان کی اہمیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دوسری تمام عبادتوں پر ان کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حج کے اندر ان ہنگامی عبادات کی بعض شانیں بھی موجود ہیں۔

ہجرت کی اصل حقیقت فرار الی اللہ ہے یعنی بدی سے نیکی کی طرف، شر سے خیر کی طرف اور شیطان سے رحمان کی طرف بھاگنا۔ حج میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت کی یہ حقیقت بھی موجود ہے۔ جو شخص حج کے لیے نکلتا ہے، اپنے گھر کو، اپنے وطن کو، اپنے اعزا و اقربا کو اپنے بہت سے دنیوی مفادات و تعلقات کو چھوڑ کر نکلتا ہے۔ اپنے پروردگار کی خوشنودی اور اپنے خالق و مالک کی رضا کے سوا کوئی اور غرض و غایت اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ اگرچہ گھر اور وطن سے یہ نکلنا عام حالات میں عارضی مدت ہی کے لیے ہوتا ہے لیکن جہاں تک گناہ اور معصیت کی زندگی کا تعلق ہے اس کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے کا عزم صمیم توجہ کی اصل حقیقت اور یعینہٖ یہی حقیقت ہجرت کی بھی ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

الْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ   حقیقی مہاجر اللہ کے نزدیک وہ ہے

عنقا جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

اسی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جہاد کی بھی بہت سی خصوصیات حج کے اندر موجود ہیں۔ یوں تو حج کے پورے زمانے میں آدمی کی زندگی خدا کے سپاہی کی زندگی بن جاتی ہے جو اپنا پالں کا مشکیزہ اور تھوڑا سا زادِ راہ اپنے ساتھ لیے ہوئے۔ ایک محاذ سے دوسرے محاذ تک پہنچنے کے لیے ہر وقت چاق چوبند رہتا ہے لیکن خاص کر حج کے چند دنوں کے اندر تو اس کی زندگی کو اگر تشبیہ دی جا سکتی ہے تو فی الواقع ایک مجاہد کی زندگی ہی سے دی جا سکتی ہے۔ مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ، دھوپ ہو، بارش ہو، ژالہ باری ہو، ہر حالت میں، بہر صورت، وقتِ معینہ پہ پہنچنا ہے نہ بھوک کی پروا ہے نہ پیاس کی، نہ لوں کا احساس ہے نہ سردی کا، نہ تکیہ کی تلاش ہے، نہ بستر کی، خدا کی پسندیدہ وردی جسم پر ہے اور لبیک لبیک کی صدا زبان پر، نہ زندگی کی پروا ہے اور نہ موت کا اندیشہ، بلکہ سچ پوچھیے تو یہ بات بھی کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ عرفات اور مزدلفہ کے میدانوں میں مرنے کی جتنی آرزو دل میں ہوتی ہے اتنی جینے کی آرزو نہیں ہوتی۔ اس ترقی کے زمانہ میں بھی قدم قدم پہ آدمی جان کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے اور ہر سن و سال کے لوگوں کو مرتے دیکھتا ہے جو ان مقامات پر مرتے ہیں اور اپنے احرام کی دو چادروں کے ساتھ انہی پتھریلی زمینوں میں دفن کیے جاتے ہیں۔

منیٰ میں جمرات پہ جو کنکریاں ماری جاتی ہیں ان کو کوئی شخص چاہے شیطان پہ کنکریاں مارنا سمجھے یا ابرہہ کی فوجوں پہ جو آسمانی سنگ باری ہوئی تھی، اس کی یادگار سمجھے، بہر حال یہ کنکریاں مارنا اللہ کے دشمنوں پہ لعنت اور سنگباری کی ایک عظیم یادگار ہے اور اللہ و رسول ؐ نے اس یادگار کو حج کے مناسک میں اسی لیے محفوظ کر دیا ہے تاکہ حج، مسلمانوں کی روحِ جہاد کو بھی زندہ اور تابندہ رکھے۔

حج کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے یہ عورتوں کے لیے حقیقی جہاد کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ جہادکن الحج (تمہارا جہاد حج ہے۔)

حج انسان پر ہر راہ سے اثر انداز ہوتا ہے

حج کی جامعیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان پر اثر انداز ہونے کے جتنے راستے بھی ہیں یہ ان تمام راستوں سے اس پر اثر انداز ہوتا ہے، آدمی کو سمع، بصر اور فواد کی جو صلاحیتیں اور قابلیتیں بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ان سب کو بیدار کر دینے کے لیے اس کے اندر بہتر سے بہتر اسباب و محرکات جمع کر دیے گئے ہیں جو معنوی اور روحانی حقیقتیں آسانی کے ساتھ انسان کی عقل کی گرفت میں نہیں آتی ہیں، ان کو حج میں شعائر کی صورت میں محسوس و مشہود کر دیا گیا ہے تاکہ وہ انسان کے حواس کی گرفت میں آسکیں۔ حج کے مناسک سے یکے بعد دیگرے گزرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کی پوری تاریخ اپنے تمام آثار و نشانات کے ساتھ آدمی کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ گھر ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ و حضرتِ اسمٰعیلؑ نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے بنایا۔ یہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمازیں پڑھیں، یہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں باپ نے اپنے محبوب بیٹے کی قربانی کی۔ یہ میدان ہیں جہاں انہوں نے دعوت الی اللہ کے خطبے دیے اور جس کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اور جس کی تپتی ہوئی ریتوں پر انہوں نے دعائیں اور مناجاتیں کیں۔ یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے صرف حافظہ ہی میں نہیں تازہ ہو جاتی ہیں بلکہ نگاہوں کے سامنے بھی آجاتی ہیں۔ جن چیزوں کے ذکر اب تک صرف بزرگوں کی زبانی ہی سنتے تھے، یا صرف کتابوں کے صفحات ہی میں پڑھتے تھے، ان کو آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس وقت فی الواقع آدمی کو اندازہ ہوتا ہے کہ جس نے کہا ہے کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" اس نے کتنی سچی بات کہی ہے۔

بسا اوقات ان مقامات و مناسک سے گزرتے ہوئے جب آدمی کو یہ خیال آجاتا ہے کہ کیا عجب کہ جہاں وہ اس وقت کھڑا ہے عین اسی جگہ کبھی حضرتِ ابراہیمؑ و اسمٰعیل علیہ السلام بھی کھڑے ہوئے ہوں یا جس جگہ وہ سجدہ کر رہا ہے اس جگہ کو ان کے سجدوں کی تقدیس بھی حاصل ہوئی ہو تو اس وقت کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ قیام کیا چیز ہے اور سجدہ کس چیز کو کہتے ہیں۔

پھر اس سے زیادہ مؤثر ہمارے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار و مقامات ہوتے ہیں۔ آدمی چپہ چپہ پر ان کے نشانات اور ان کے کارناموں کو ثبت

دیکھتا ہے جس شہر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، جس کی گلیوں اور جس کے کوچوں میں آپؐ دعوت حق لے کر پھرے، جس کے حرم میں آپؐ نے نمازیں پڑھیں، جس کی پہاڑیوں میں آپؐ کے مؤذن کی اذانیں گونجیں، جہاں آپؐ نے اللہ کے دین کی خاطر طرح طرح کی تکلیفیں جھیلیں، جس محبوب شہر کو اللہ کے لیے آپؐ نے چھوڑا اور پھر جس شہر کو آپؐ نے اپنی دعوت کا مرکز بنایا، جن میدانوں اور پہاڑوں میں آپؐ نے اپنی دعوت کا مرکز بنایا، جن میدانوں اور پہاڑوں میں آپؐ کے صحابہؓ نے اعلائے حق کے لیے جنگیں کیں، یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے جب انسان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں تو اسلام کی پوری تاریخ اس طرح اس کے سامنے مشہود ہو جاتی ہے گویا اس کے اور اسلام کے دور اول کے درمیان زمان و مکان کا کوئی پردہ اب سرے سے حائل ہی نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عبادت کا انسان پر جو اثر پڑتا ہے وہ کسی بھی دوسری عبادت کا نہیں پڑتا اور پھر بالکل اسی کے برابر کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ جو شخص حج سے محروم لوٹتا ہے پھر اس کی اصلاح کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ہوتی۔ اسلام میں اس کی حیثیت روحانی امراض کے آخری علاج کی ہے جس کو اس سے فائدہ نہیں ہوا اس کے لیے کوئی دوا بھی نافع نہیں ہو گی۔

یہاں پہلے ہم حج کی برکتیں بیان کریں گے اور اس کے بعد اس کی آفات اور ان کے علاج سے بحث کریں گے۔

حج کی برکتیں

رُوحانی کایا کلپ

جس طرح جسمانی امراض کے علاج کی قسموں میں علاج کی ایک قسم وہ ہے جس کو کایا کلپ کہتے ہیں، اسی طرح روحانی امراض کے علاج کے لیے حج ہے۔ یہ علاج کا ایک ایسا کورس ہے جس کو اگر اس کے تمام شرائط کے ساتھ کوئی شخص آخر تک نباہ لے جائے تو وہ تمام روحانی بیماریوں سے صحت یاب ہو کر ٹھیک اس فطرۃ اللہ پر پہنچ جاتا ہے جس پہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے اور جس پر وہ چاہتا ہے کہ یہ مرے۔ یہ حقیقت متعدد حدیثوں سے واضح ہوتی ہے لیکن ہم اختصار کے خیال سے صرف ایک حدیث کا ترجمہ یہاں دیتے ہیں جو بخاری اور مسلم دونوں میں ہے:

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس نے حج کیا اور اس دوران میں نہ اس نے کوئی شہوت کی بات کی اور نہ خدا کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کیا وہ تمام گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہوگیا جس طرح وہ اُس دن تھا جس دن اُس کی ماں نے اُس کو جنا تھا۔"

جنّت کی ضمانت

حج چونکہ اسلام اور ہجرت کی طرح آدمی کے تمام گناہوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس شخص کے لیے جس کو حج مبرور کی سعادت حاصل ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی ضمانت ہے:

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ کے بعد آدمی اگر دوسرا عمرہ کرے تو یہ عمرہ درمیان کے تمام گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے اور حج مبرور کا صلہ تو جنت سے کچھ کم ہے ہی نہیں۔" (متفق علیہ)

حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کی آلودگی سے پاک ہو، اس حج کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی جزا جنّت سے کم کچھ ہے ہی نہیں۔"

تجدیدِ عہد

حج کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس عہد کو از سر نو استوار کر لیتا ہے جو ایک مسلم کی حیثیت سے اس نے اپنے رب سے کیا ہے۔ یہ تجدیدِ عہد اگرچہ ہر توبہ و استغفار سے ہوتی ہے لیکن اس تجدیدِ عہد کا جو عزم و ارادہ حج میں ظاہر ہوتا ہے وہ عام توبہ و استغفار میں نہ ظاہر ہوتا ہے اور نہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ آدمی اس تجدیدِ عہد ہی کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے اور ایک طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے رب کے دروازے پر حاضری دیتا ہے۔ یہ گھر سے نکلنا اور اس مقصد کے لیے سفر کرنا ہی بجائے خود ایک بہت بڑی چیز ہے۔ یہ بندے کے اخلاص اور اس کی صدق طلبی کا ایک نہایت واضح نشان ہے اور اس سے خدا کی رحمت اس کے لیے جوش میں آتی ہے۔

پھر جب وہ حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے یا اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا خدا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہدِ بندگی و اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی جگہ پر پہنچ کر ان کی قربانی کی سنّت کو تازہ کرنا درحقیقت اپنی زندگی کو از سر نو خدا کی نذر کرنا ہے کیوں کہ قربانی کی اصلی حقیقت اپنے آپ کو خدا کی حوالگی اور سپردگی میں دے دینا ہے اور یہی حقیقت اسلام کی بھی ہے۔ اسلام کے معنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کے ہیں یعنی خدا کی مرضی اور اس کی پسند کے آگے آدمی کی

اپنی کوئی مرضی اور اپنی کوئی پسند باقی نہ رہ جائے۔ آدمی اپنی محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز چیز بھی خدا کے لیے ہر وقت قربان کر دینے کے لیے تیار رہے۔ اس حقیقت کو واقعہ کی شکل میں اور اس فلسفہ کو عمل کے جامہ میں پوری تاریخ انسانی میں جس نے پیش کیا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں انہوں نے اپنے محبوب بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے قربان کر دینے کا عزم بالجزم ظاہر کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فی الواقع انہوں نے اپنا سب کچھ بغیر کسی استثنا اور تحفظ کے خدا کے حوالے کر دیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اقدام اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ اس نے ان کو مسلم کے لقب سے نوازا اور جس بیٹے کو انہوں نے قربان کیا اس کی نسل سے ایک امتِ مسلمہ برپا کی خاص خصوصیت یہ ٹھیرائی کہ وہ دین اسلام کی حامل بنے اور اس اسلام کی اصل حقیقت کو اپنے اندر برابر زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے اس ابراہیمی قربانی کی یادگار مناتے ہیں اور ان کی طرف سے ان کے اس عمل سے اس بات کا اظہار بھی ہیں شامل کیا گیا ہے جو اللہ کے بندے اس مقدس قربان گاہ تک پہنچ پاتے ہیں وہ وہاں پہنچ کر اس قربانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو مشکلات اور موانع کے سبب سے وہاں نہیں پہنچ پاتے وہ اپنی اپنی بستیوں ہی میں اس قربانی کی یادگار مناتے ہیں تاکہ ان کے اندر اسلام کی اصل حقیقت کا شعور بھی زندہ رہے اور ان کی طرف سے ان کے اس عمل سے اس بات کا اظہار بھی ہوتا رہے کہ وہ اصل قربان گاہ پہ پہنچ کر اس قربانی کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

اس قربانی کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں جان کی قربانی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل اور اپنی مہربانی سے ہمیں اس کا موقعہ دیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کسی جانور کی قربانی کر کے اپنی جان کا فدیہ ادا کر دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے ایک بہت بڑی رعایت ہے اور اس نے جو جانور ہماری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں جب وہ خدا کی راہ میں ہمارے بدل کی حیثیت سے قربان ہوتے ہیں تو یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو ہماری وہ انجام دیتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ اشرف مقصد ہے جس میں ہم ان کو استعمال کرتے ہیں۔ جو لوگ ہر چیز کو صرف معاشی پیمانوں سے ناپتے ہیں وہ ان چیزوں کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے، اس وجہ سے ان پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھیڑوں بکریوں کی قدر و قیمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے

زیادہ سے ہے۔

غرض حج کے موقع پر ان میں سے ایک ایک چیز سے بندہ اپنے آپ کو اس حیثیت میں پیش کرتا ہے کہ گویا وہ ایک مفرور غلام تھا اور اب پھر وہ اپنے مالک و آقا کے دروازے پر از خود حاضر ہوا ہے تاکہ اس کے ساتھ اپنے عہدِ غلامی کو از سرِ نو استوار کرے اور ہمیشہ اس کی فرماں برداری اور اطاعت کرتے رہنے کا اقرار کرے۔

اُمّت کی وحدت کا مظاہرہ

اوپر ہم نے حج کی جو برکتیں بیان کی ہیں۔ یہ افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں حاصل ہوتی ہیں لیکن حج کے اندر بعض نہایت اہم اجتماعی برکتیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ صرف حج ہی کا ایک موقع ایسا موقع ہے جس میں یہ حقیقت سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر ہر شخص کے سامنے آجاتی ہے کہ اس امت کے مختلف اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والی اور ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز دراصل کیا ہے؟ زبانیں مختلف، قومیتیں اور جنسیتیں مختلف، امصار و بلاد مختلف، ذوق اور طبائع مختلف، لباس مختلف، حد یہ ہے کہ نمازیں ادا کرنے کے طریقے بھی بعض ظواہر میں ایک دوسرے سے مختلف لیکن لبیک لبیک کی صدا سب کی زبانوں پر، احرام کی چادریں سب کے جسموں پر، بیت اللہ پر نثار، سب پروانہ وار، ایک ہی امام کی اقتداء میں بیت اللہ کے ارد گرد سب مصروفِ رکوع و سجود۔ اختلاف کے اندر وحدت کا اور گوناگونی و بوقلمونی کے ساتھ ہم آہنگی و ہم رنگی کا جو مظاہرہ حج میں ہوتا ہے وہ صرف حج کے ساتھ مخصوص ہے جس کو حج کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آفاتِ حج اور ان کا علاج

لیکن حج کی برکتیں جس طرح نہایت عظیم الشان ہیں اسی طرح اس کے لیے آفتیں بھی نہایت خطرناک ہیں۔ جو شخص اس کی برکتوں سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان آفتوں سے اچھی طرح واقف ہو اور ان سے اپنے حج کو محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ جو شخص اپنے حج کو ان آفتوں سے محفوظ نہ رکھ سکے اس کا حج کی برکتوں سے بہرہ مند ہونا تو درکنار، اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ وہ روحانی و اخلاقی اعتبار سے پہلے سے بھی زیادہ مریض ہو جاتا ہے اور چونکہ حج کی حیثیت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، آخری علاج کی ہے، اس وجہ سے اس علاج کے ناکام ہو جانے کے بعد ایسے شخص کو دوسرا علاج مفید بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔

ہم یہاں اختصار کے ساتھ حج کی آفتوں اور ان کے علاج پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

شہوانی باتیں قرآن مجید میں جہاں حج کی آفات کا ذکر ہوا ہے وہاں سب سے پہلے شہوانی باتوں سے متنبہ کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ	پس جو حج کے مہینوں میں اپنے اوپر حج کو
فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا	واجب کرے تو اس کے لیے حج کے

جِدَالَ فِی الْحَجِّ ۔ (۱۹۷۔بقرہ) دوران میں شہوانی باتیں، خدا کی نافرمانی کی باتیں اور لڑنا جھگڑنا جائز نہیں ہے۔

قرآن نے یہاں حج کی تین آفتوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں رفث یعنی شہوانی باتوں کو مقدم رکھا ہے اس وجہ سے ہم بھی سب سے پہلے اسی پر گفتگو کریں گے۔

قرآن مجید نے اس خطرہ سے سب سے پہلے غالباً اس وجہ سے آگاہ کیا ہے کہ سفر حج و حج میں شہوانی فتنوں میں پڑ جانے کے آدمی کے لیے بہت سے محرکات جمع ہو جاتے ہیں۔ اوّل تو سفر میں ہوتے کے وجہ سے آدمی کی طبیعت کا وہ اعتدال باقی نہیں رہتا جو اسے حضر کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے ثانیاً جس چیز سے آدمی کو روک دیا جائے۔ آدمی کی طبیعت کے اندر اس چیز کے لیے اکساہٹ بڑھ جاتی ہے اور شیطان آدمی کی طبیعت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے ثالثاً سفر کی وجہ سے اور اس سے زیادہ احرام کی وجہ سے عورتوں کے پردے کا وہ رکھ رکھاؤ قائم نہیں رہتا جو عام حالات میں قائم رکھا جاتا ہے۔ رابعاً بسوں میں، راستوں میں، نکلنے اور داخل ہونے کے دروازوں میں، مطاف میں، مسعیٰ میں، حرم میں، زمزم پر، غرض کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی ہے جہاں سخت اژدحام اور کشمکش کی حالت میں غیر محرم عورتوں سے تصادم نہ ہوتا ہو۔ خامساً اس زمانہ میں تقریباً اکثر ممالک میں مسلمان عورتیں پردے کی قیود سے آزاد ہو گئی ہیں۔ اس وجہ سے صرف احرام ہی کی حالت میں نہیں بلکہ عام حالات میں بھی ہر سن و سال کی عورتیں ہر جگہ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور بعض حالات میں صرف پردے ہی کے حدود نہیں بلکہ شرم و حیا کے حدود بھی توڑ تاڑ کے رکھ دیتی ہیں

ان حالات کے اندر اگر کوئی شخص پوری طرح متنبہ اور ہوشیار نہ رہے تو بڑی آسانی کے ساتھ اور کچھ نہیں تو قدم قدم پر اپنی نگاہ کو ضرور آلودہ کر سکتا ہے، اور جب نگاہ آلودہ ہو گئی تو وہ اپنے دل کو آلودہ ہونے سے کس طرح بچا سکتا ہے ؟

اس آفت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب سفر حج پر نکلے تو جس مقدار میں مادی زادِ راہ کا انتظام کرے اس سے زیادہ مقدار میں روحانی زادِ راہ یعنی تقویٰ کا اہتمام کرے۔ آدمی گھر سے یہ عزم بالجزم کر کے اٹھے کہ اس پورے سفر میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہر چھوٹی بڑی حد کی پابندی کرنی ہے۔ اس عزم کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذکر کو لازم کرے اور کسی

وقت بھی اس سے غافل نہ ہو تاکہ شیطان کو اس کے اندر اپنی وسوسہ اندازیوں کے لیے گھسنے کا کوئی وقت نہ ملے۔ اپنی نگاہ حتی الامکان نیچی رکھنے کی کوشش کرے اس لیے کہ نگاہ ہی دل میں اترنے کا راستہ ہے۔ اگر آدمی اس دروازے کو چوپٹ کھلا نہ چھوڑے رکھے تو بہت سی آفتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ حدودِ حرم میں داخل ہونے کے بعد آدمی کو بار بار اس بات کا دھیان کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کا شہر ہے یہ اللہ کا حرم ہے اور یہ محترم مہینہ ہے، ان میں ہر چیز کی حرمت کا تقاضا ہے کہ نہ دل بھٹکے، نہ نگاہ اور اگر محسوس کرے کہ طبیعت پر قابو نہیں پا رہا ہے تو اس پر روزے کا بھی اضافہ کرے تاکہ فاسد رجحانات کا زور ٹوٹے اور طبیعت پر تبتل اور میلان الی اللہ غالب آجائے۔ عرفات میں میدانِ حشر کا تصور غالب رہنا چاہیے جس طرح میدانِ حشر کے متعلق احادیث میں وارد ہے کہ لوگ ننگے اٹھیں گے لیکن حالت ایسی ہو گی کہ کسی کو کسی کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ہو گی۔ اسی طرح عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں اس طرح اپنے آپ کو دعا اور مناجات میں مشغول رکھنا چاہیے کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی آدمی کو فرصت ہی نہ ملے۔

اس بات کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ عالتِ احرام میں عورتوں کو چہرے کھلے رکھنے کا جو حکم ہے وہ حج اور ایامِ حج کے اس مزاج کے لحاظ سے ہے جو اس کا فی الواقع ہونا چاہیے۔ حج کا حقیقی مزاج درویشی اور زہد کا ہے، اس وجہ سے جو شخص حج کے لیے نکلے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنے مزاج کو بھی حج کے مزاج کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ بناؤ سنگار، نمود و نمائش اور دوسروں پر اثر انداز ہونے کی ہر خواہش اور ہر کوشش سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ عورتوں کو بالخصوص اس چیز کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔ ان کا کوئی غلط انداز صرف انہی کے حج کو نہیں بلکہ دوسروں کے حج کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔

جو مواقع تصادم اور کش مکش کے ہیں مثلاً حجرِ اسود پر یا مطاف میں، یا قبرِ نبوی پر یا رمی جمرہ کے وقت وہاں ہر مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے ساتھ تصادم سے بچائے اور اس تصادم سے بچنے کے لیے اگر اولیٰ کو چھوڑ کر وہ شریعت کے ادنیٰ پر عمل کرے تو ان شاء اللہ اس کو فتنہ اور تصادم سے بچنے کی کوشش کی وجہ سے اولیٰ کا ہی ثواب ملے گا۔ مردوں کے مقابل میں اس بات کا خیال و اہتمام عورتوں کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ عورتوں کے لیے بہتر

یہ ہے کہ ان تمام مواقع پر حاضری کے لیے وہ اوقات منتخب کریں جن میں وہ مردوں کے ساتھ تصادم سے اپنے آپ کو بچا سکیں اور اگر کسی مجبوری کے سبب سے اس تصادم سے سابقہ پیش آہی جائے تو انہیں ان رخصتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو عورتوں کے لیے شریعت میں ہیں۔ بہت سے لوگ جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہیں، شریعت کے اولیٰ و افضل پر عمل کرنے کے جوش میں دھکم پیل کو بھی ایک نیکی کا کام سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس نیکی کے کمانے کے شوق میں بہت سی دوسری نیکیوں کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

حدود اللہ اور شعائر الٰہی کی بے حرمتی

حج کے سلسلہ کی دوسری آفت حدود اللہ اور شعائر الٰہی کی بے حرمتی ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں شریعت کی جو پابندیاں ہیں حج ان پر مزید بہت سے اضافے کر دیتا ہے۔ حج کا مہینہ محترم، حج کے مقامات محترم، حالتِ احرام کی پابندیاں محترم، حد یہ ہے کہ حالتِ احرام میں آپ اپنے بال اور ناخن بھی اگر ترشوا دیں تو اس سے بھی حج کی حرمت کو بٹہ لگتا ہے جس عبادت کی نزاکتوں کا یہ حال ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں دین کے دوسرے احکام و آداب کا اہتمام کس درجہ مطلوب ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں شریعت کے احکام و آداب پابندی کے عادی نہیں ہوتے، وہ حج کے موقع پر کچھ اور زیادہ ڈھیلے ڈھالے ہو جاتے ہیں اور قدم قدم پر ان سے ایسی باتیں صادر ہوتی ہیں جو اس فسوق کے تحت آتی ہیں جسے قرآن نے حج کے سلسلہ کی دوسری آفت قرار دیا ہے۔

بہت سے لوگ بات بات پر لڑتے جھگڑتے ہیں، آزادی کے ساتھ گالم گلوچ کرتے ہیں۔ لین دین میں بدمعاملگیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، اپنے ساتھیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

بہت سے لوگ شرم و حیا کے تمام حدود بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ عین حرم کے پاس ہزاروں گزرنے والوں کے سامنے ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں۔ نہ انہیں حرم کی پرواہ ہوتی ہے، نہ آنے جانے والوں کی، بعض لوگ جن میں خواتین بھی شامل ہیں، احترام بیت اللہ اور حیا کے احساس سے اس قدر عاری ہوتے ہیں کہ زمزم کی ٹونٹیوں کے نیچے ننگے ہو کر نہاتے ہیں بہت سے لوگ حرم کے ہر حصے میں اس بے تکلفی کے ساتھ تھوکتے اور ناک صاف کرتے ہیں

کہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حرم اور غیر حرم میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہیں ہے، بالخصوص جن خواتین کے ساتھ بچے ہوتے ہیں، وہ تو حرم کے احترام کے معاملہ میں بالکل ہی بے پروا ہوتی ہیں۔

اس طرح کی باتیں زیادہ تر دو چیزوں کا نتیجہ ہیں: ایک ناواقفیت کا، دوسری تہذیب و تربیت سے محرومی کا۔

ان دونوں چیزوں میں سے جہاں تک علم و واقفیت کی کمی کا تعلق ہے، یہ مسئلہ کچھ بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ تقریباً تمام مسلمان ممالک میں حج کے سرکاری ادارے موجود ہیں۔ اگر یہ ادارے اپنے سامنے حجاج کو آداب حج اور آداب حرمین شریفین سے واقف کرنا بھی رکھ لیں اور سعودی حکومت بھی اپنے تمام متعلق شعبوں کے ساتھ دوران حج میں اس کے لیے مستعد ہو جائے تو بڑی آسانی کے ساتھ ہر طبقے اور ہر درجے کے حجاج کو ساری ضروری باتوں سے واقف کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی حکومت اگر اس امر کا اہتمام کرے کہ جس وقت سے کوئی پاکستانی حج کے لیے درخواست دیتا ہے اس وقت سے لے کر اس وقت تک جب تک وہ پاکستان کے ساحل کو چھوڑتا ہے، برابر کسی نہ کسی نوعیت سے ان باتوں سے واقف ہوتا رہے جو باتیں اس کے پیش نظر مقصد کے لیے ضروری ہیں تو یہ اہتمام ایک اسلامی حکومت کے پہلو سے اپنے حجاج کے لیے اس پر ضروری بھی ہے اور اس کا اہتمام بغیر کسی خاص زحمت اور بغیر کسی خاص بڑے خرچ کے وہ کر بھی سکتی ہے۔ مختلف شکلیں ایسی اختیار کی جا سکتی ہیں جن سے عازمین حج کے کانوں اور ان کی نگاہوں سے وہ ساری چیزیں گزر جائیں جن کا اہتمام عازمین حج کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے پمفلٹ بھی چھاپے جا سکتے ہیں، ٹیکہ کے دفتروں سے لے کر حاجی کیمپ اور کسٹم تک ہر جگہ دیواروں اور تختیوں پر ضروری ہدایات بھی لکھی جا سکتی ہیں، حاجی کیمپ میں مذہبی انجمنوں کے تعاون سے آداب حج سے متعلق تقریروں کا بھی اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ حج کے زمانے میں ریڈیو سے حج اور شعائر حج کے مقاصد اور ان کے آداب و احکام پر علماء سے تقریریں بھی نشر کرائی جا سکتی ہیں اور بڑی آسانی سے کم از کم حاجی کیمپ میں ٹھہرنے والے حجاج کے لیے ایک ریڈیو لگا کر ان تقریروں کے سننے کی آسانی بھی بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ جہازوں پر ایک امیر حج مقرر کرنے کا دستور موجود ہی ہے۔ یہ دستور بھی نہایت اچھا ہے البتہ اس امر کے اہتمام کی ضرورت ہے کہ ہر جہاز کے لیے امیر حج ایسا منتخب کیا جائے جو ذی علم ہو اور

اس کے لیے وہ ضروری سہولتیں حکومت اور جہازی کمپنیوں کی طرف سے بہم پہنچائی جائیں جو جہاز کے دوران سفر میں عازمین حج کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت معمولی سہولتیں بہم پہنچا دینے سے اس مقصد کے لیے موزوں اشخاص میسر آسکتے ہیں۔

یہ کام جس طرح حکومت کے کرنے کے ہیں، اسی طرح دینی و مذہبی انجمنوں کے بھی کرنے کے ہیں۔ ان انجمنوں کو کم از کم حج کے مہینوں میں اس بات کے لیے فکر مند ہونا چاہیے کہ ہمارے جو بھائی سفر حج کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور اس کے لیے کثیر مصارف کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ان کا یہ سفر ہر پہلو سے نتیجہ خیز اور بابرکت ہو اور وہ اپنی بے علمی اور عدم تربیت کے سبب سے اپنی اس عظیم محنت کو ضائع نہ کر بیٹھیں۔ اگر ہمارے ملک کی انجمنیں اس کی حقیقی اہمیت محسوس کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح وہ اپنے ملک کے عوام کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتی ہیں اور اس کا ان کو آخرت میں بڑا اجر ملے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی ذمہ داری سعودی حکومت کی ہے لیکن میں نے ذاتی تجربہ سے محسوس کیا ہے کہ سعودی حکومت کی ساری سرگرمیاں حجاج کے حمل و نقل تک محدود ہیں، ان کی تعلیم و تربیت کے معاملے سے یا تو وہ کوئی خاص دلچسپی رکھتی ہی نہیں یا ایام حج میں اس کے اوپر انتظامی معاملات کا اتنا بوجھ آپڑتا ہے کہ وہ اس پہلو کی طرف کوئی توجہ دے ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ اگر وہ اس پہلو کی طرف توجہ دے تو اس سلسلہ میں بہت کچھ کرسکتی ہے۔ اس کے پاس معلمین کا وسیع نظام ہے۔ یہ معلمین جس طرح مناسک حج کی ادائیگی میں حجاج کی راہنمائی کرتے ہیں، دوسری ضروری باتوں کی تعلیم کے لیے بھی ذریعہ بن سکتے ہیں۔ سعودی حکومت کا شعبۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی اگر مستعد ہو کر کام کرے تو بڑی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ روزانہ حرم میں لاؤڈ سپیکر سے ضروری ہدایات نشر بھی کی جاسکتی ہیں، مختلف زبانوں میں پمفلٹ چھاپ کر بھی تقسیم کیے جاسکتے ہیں اور حرم کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے سیاہ بورڈوں پر ضروری باتیں مختلف زبانوں میں لکھی جاسکتی ہیں۔

اگر اپنے اپنے ملکوں سے لے کر حج کے تمام مقامات و مناسک تک حجاج کے سامنے سے ضروری ہدایات گزرتی رہیں تو یہ بے اثر نہیں رہ سکتیں۔ ان سے صرف وقتی ہی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ کم و بیش تین مہینوں کے اندر اندر (جو ایک حاجی اس سفر میں گزارتا ہے) اس کورس سے گزر کر ایک

حاجی وہ ساری باتیں سیکھ سکتا ہے جن کا سیکھنا ضروری ہے۔

رہا عملی تربیت کا معاملہ تو یہ معاملہ بہت مشکل ہے۔ حج کے موقع پر فی الواقع صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارے مسلم معاشرہ کا تہذیب و تمدن، تربیت اور اخلاق و آداب کے لحاظ سے کیا حال ہے۔ اس پہلو سے تقریباً تمام مسلم ممالک کا حال یکساں ہی معلوم ہوتا ہے اگر فرق ہوگا تو بس کچھ درجے اور ڈگری کا فرق ہوگا۔ صاف نظر آتا ہے کہ مسلم معاشرے کے ذمہ داروں نے خواہ وہ حکمرانوں کے قبضہ سے تعلق رکھتے ہوں یا عام علماء و مصلحین کے طبقہ سے، اپنے اپنے ملکوں کے عوام کو اسلامی مفہوم میں مہذب بنانے میں بہت کم حصہ لیا ہے۔ حالاں کہ یہ ذمہ داری انہی کی ہے۔ عوام میں تربیت خود تو کرنے سے رہے۔ یہ کام بہر حال حکومتوں اور قائدوں ہی کے کرنے کا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بڑی باتوں سے لے کر آداب طہارت و استنجا تک کی چھوٹی چھوٹی باتیں لوگوں کو بتائیں اور عربوں جیسے اکھڑ لوگوں کو تہذیب و شائستگی کا نمونہ بنا دیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کا لوگوں کو شائستہ اور مہذب بنانے میں جو حصہ رہا ہے، اس کی داد ایرانی سپہ سالار رستم نے ان لفظوں میں دی تھی کہ

اکل عمر کبدی یعلم الکلاب الاداب۔

عمر میرا کلیجہ کھا گیا کہ اس نے وحشیوں کو تہذیب و آداب کا نمونہ بنا دیا۔

انہی حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص کو زمزم پر کشمکش کرتے دیکھ لیا تو اس کو تنبیہ فرمائی۔ کاش ہمارے حکمران، ہمارے قائدین اور ہمارے علماء بھی اس ذمہ داری کا احساس کریں عام اس سے کہ وہ حجاز، شام، مصر، عراق، ترکی، ایران اور افغانستان کے ہوں یا پاکستان کے۔

جنگ و جدال

حج کے سلسلہ کی ایک بہت بڑی آفت جنگ و جدال بھی ہے۔ کچھ تو یہ سفر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں ہجوم اور اژدحام کے سبب سے ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے قدم قدم پر ٹکراتا ہے۔ کچھ ملک کی گرم آب و ہوا کا لوگوں کے مزاجوں خاص طور پر باہر سے آنے والوں کے مزاجوں، پر اثر پڑتا ہے اور سب سے زیادہ دخل اس میں شیطان کی وسوسہ اندازیوں اور فتنہ انگیزیوں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ عرفات کا دن شیطان کی سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کا دن ہے۔ اس وجہ سے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی کے اس سفر کے دوران میں اس کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھلائے اور اپنی کامیابی اور سرخروئی کے زیادہ

سے زیادہ مواقع پیدا کرے۔ چنانچہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سفر میں لوگ جدال کے فتنے میں بہت مبتلا ہوتے ہیں۔ صرف گاڑیوں اور بسوں میں سوار ہونے وقت ہی نہیں بلکہ حرم میں، طواف میں حجر اسود پر، زمزم پر، ہر جگہ اس فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ مجھے نہایت افسوس اور صدمے کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ میں نے عین بیت اللہ کے دروازے کے اندر اور روضۂ نبوی کی جالیوں کے سامنے لوگوں کو لڑتے جھگڑتے اور چیختے چلاتے دیکھا ہے۔

اس آفت کا عام علاج تو اوپر بیان ہو چکا ہے لیکن ایک خاص چیز جو ہر عازم حج کو ہر قدم پر پیش نظر رکھنی چاہیے اور جو اس فتنے سے محفوظ رکھنے میں بہت زیادہ مددگار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی جس وقت اس سفر کے لیے گھر سے قدم نکالے، اسی وقت سے دل میں یہ ٹھان لے کہ اس سفر کا اصل مزاج ترکِ دنیا اور درویشی ہے اپنی شان اور اپنے وقار و احترام کا خیال بالکل دل سے نکال دے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اس راہ میں اس کو جو ذلت اور تکلیف بھی پیش آئے گی وہ اس کے گناہوں کے لیے کفارہ بنے گی۔ اپنے لیے آرام حاصل کرنے کی کوشش کی بجائے حتی الامکان دوسروں کو آرام پہنچانے کی فکر کرے۔ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے اور شیطان کے فتنوں سے خدا کی پناہ مانگتا رہے۔ جن مواقع پر اس کو تصادم اور جنگ و جدال کا اندیشہ ہو ان سے حتی الامکان دور رہے۔ یہاں تک کہ اگر اس جنگ و جدال سے بچنے کے لیے اس کو شریعت کے افضل سے محروم ہو کر ادنیٰ پر قناعت کرنی پڑے تو اس ادنیٰ پر قناعت کر لے لیکن شیطان کو اپنے اوپر قابو پانے کی راہ نہ دے۔

فسادِ نیت

فسادِ نیت کا فتنہ جس طرح ہر کام کے ساتھ لگا ہوا ہے اسی طرح بلکہ دوسرے کاموں کی نسبت سے کہیں زیادہ وہ اس عبادت کے ساتھ لگا ہوا ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس کی چھوت جہاں بھی پائی گئی یہ آدمی کی ساری عبادت کو چوپٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔

عام طور پر فسادِ نیت سے متعلق لوگوں کے سامنے صرف یہ چیز ہے کہ آدمی حج کے لیے اس ارادے سے نکلے کہ لوگ اس کو حاجی کہیں یا یہ کہ لوگ اس پر اس پہلو سے نکتہ چینی نہ کریں کہ اس نے مالدار ہو کر یا ایک لیڈر اور مذہبی پیشوا ہوتے ہوئے حج کا فریضہ ادا نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کوئی شخص محض اس طرح کے محرکات کے تحت حج کے لیے نکلے تو اس کا یہ نکلنا حج کے لیے نہیں ہوگا بلکہ

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لکل امری ما نوی اس کا حج اسی مقصد کے لیے ہوگا جس مقصد کے لیے وہ گھر سے نکلا ہے۔ لیکن اس زمانے میں چوں کہ کسی شخص کا حاجی ہونا لوگوں کی نگاہوں میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے اس محرک کی بھی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہی۔ اس زمانہ میں بعض دوسری چیزیں اس سے زیادہ قابلِ لحاظ ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

بہت سے لوگ جس طرح درگاہوں اور مزاروں پر مختلف قسم کی منتیں اور مرادیں مانگنے کے لیے جاتے ہیں، اسی طرح کے اغراض کے ساتھ حج کے لیے بھی جاتے ہیں ـــــ کسی کو اولاد کی تمنا ہے، کسی کو جائداد کی تمنا ہے، کسی کو کسی پر فتح پانے کی آرزو ہے، کسی کو کسی خاص رشتے کی تمنا ہے بالخصوص عورتوں کے طبقہ میں تو ایک بڑی تعداد ایسی ہی خواتین کی ہوتی ہے جن کے لیے بیت اللہ اور مسجدِ نبویؐ کی اگر کوئی اہمیت ہے تو اسی پہلو سے ہے کہ وہاں وہ اپنی مخصوص قسم کی مرادیں پوری ہونے کی توقع رکھتی ہیں۔

اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ یہ مقدس مقامات ہر قسم کی جائز دعا کے لیے نہایت بابرکت مقامات ہیں۔ لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ کوئی شخص اسی طرح کی مرادیں دل میں لے کر حج کے لیے جائے اور اس بات میں کہ ایک شخص نکلے تو حج کے مقصد سے لیکن وہاں وہ اخروی بھلائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے جائز دنیوی اغراض کے لیے بھی دعائیں کرے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ جو لوگ حج کے لیے محض اپنے مخصوص قسم کے دنیوی مقاصد ہی کے لیے نکلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے حج کی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ اس زمانے میں حج محض کاروباری مقصد کے کرتے ہیں۔ حجاز میں چونکہ باہر سے آنے والی چیزوں پر ڈیوٹی نہیں ہے اس وجہ سے بہت سی چیزیں بالخصوص تمدنی چیزیں ہمارے بازاروں کی نسبت سے وہاں کے بازاروں میں بہت سستی ملتی ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو حجاز کا سفر تو فی الحقیقت وہاں کی اس ارزانی سے نفع کمانے کے لیے کرتے ہیں لیکن اس کے لیے حج کو ایک بہانہ بناتے ہیں۔ جن لوگوں کے پیشِ نظر اس طرح کا مقصد ہو وہ اس زمانے میں جب کہ زرِ مبادلہ، کسٹم اور سمگلنگ کی روک تھام کے قوانین کی گوناگوں پابندیاں ہیں۔ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ خدا کے بہت سے قوانین کی بھی نافرمانیاں کریں اور اپنی حکومت اور حجاز کی حکومت کے

بہت سے قوانین کو بھی توڑ دیں۔ علاوہ ازیں اس طرح کے لوگ اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے بہت سے دوسرے حاجیوں کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح ان کے فتنہ کا دائرہ صرف انہی تک یا ان کے ایجنٹوں تک ہی محدود نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اپنی ہوشیاری سے بہت سے دوسرے بے گناہ لوگوں کو بھی اپنے دام میں پھنسا لیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اغراض کے تحت حج کے لیے نکلتے ہیں ان کا حج، حج نہیں بلکہ محض ایک تجارت ہے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ سفر حج کے دوران میں آدمی کوئی تجارت کر سکتا ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے اس بات کی اجازت دی ہے لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے اس تجارت میں جس کی قرآن نے اجازت دی ہے اور اس اسمگلنگ میں جس کے لیے بہت سے لوگوں نے حج کو ایک بہانہ بنا لیا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا فتنہ حج بدل کا فتنہ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں نے حج بدل کو بھی ایک کاروبار بنا رکھا ہے جو اہل ثروت خود سفر حج کی مشقت نہیں اٹھانا چاہتے اور دینداری کے تقاضے کے تحت حج کے ثواب کے بھی متمنی ہیں وہ کسی دوسرے شخص کو حج کے مصارف دے کر اپنے قائم مقام کی حیثیت سے بھیج دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کی طرف سے روپے لے جاتے ہیں اور مکہ معظمہ میں وہ کسی معلم کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ وہ یا تو خود ان کے قائم مقام کی حیثیت سے حج کر دے یا اپنے کسی آدمی سے کرا دے اور عرفات کے دن وہ ان میں سے ہر ایک کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ احرام جو انہوں نے باندھ رکھا ہے، انہی کے عزیز کی طرف سے ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ شریعت میں بعض حالات میں حج بدل کی اجازت ہے لیکن وہ حج بدل بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کاروبار سے جو آج کل حج بدل کے نام سے ہو رہا ہے

شعائر کی حقیقت سے بے خبری حج کے سلسلے کی ایک بہت بڑی آفت یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو حج کے شعائر اور مناسک کی روح اور حقیقت سے بالکل بے خبری ہے، بس لوگ عقیدت کے جذبے کے ساتھ جاتے ہیں اور معلم حضرات ان سے جو

رسوم ادا کرا دیتے ہیں، آنکھ بند کر کے ان کو ادا کرکے چلے آتے ہیں سعی اور عمرہ کا فرق معلوم، مطاف کی حقیقت کا پتہ، نہ حجر اسود کو بوسہ دینے کا مدعا کسی پر واضح، نہ یہ معلوم کہ سعی کیوں کی جاتی ہے، قربانی کی اصلی روح کیا ہے۔ رمی جمرات سے ہمارے اندر کس روح کو زندہ اور بیدار رکھنا مقصود ہے۔ اجتماعِ عرفات کی کیا حقیقت ہے۔ الغرض جتنے بھی شعائر ہیں، عام طور پر لوگ ان کو محض رسوم کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ نہ ان کی معنویت کا کسی کو کچھ پتہ ہوتا ہے، نہ اس چیز سے لوگوں کو آگاہ کرنے کا کوئی معقول انتظام و اہتمام ہے اور نہ بظاہر اس چیز کے لیے لوگوں کے اندر کوئی طلب ہی پائی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عبادت محض رسم کی خانہ پری بن کر رہ جائے گی وہ روحوں اور دلوں پر کیا اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اسی وجہ سے حج کا حقیقی فائدہ بہت کم لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے اہلِ علم کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن مجید اور احادیث میں حج کے شعائر کے لیے شعائر کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے تو یہ لفظ ہی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ ان شعائر سے مقصود اصل وہ معانی اور حقائق ہیں جو ان شعائر کے ذریعے سے ہمیں سمجھائے گئے ہیں۔ شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی معنوی اور روحانی حقیقت کو محسوس کرانے اور یاد دلانے کے لیے مقرر کی گئی ہو۔ حج کے سلسلہ کی ہر چیز کسی نہ کسی معنوی حقیقت کی ایک محسوس تعبیر ہے۔ اس وجہ سے اس کی حقیقی برکت اسی صورت میں آدمی کو حاصل ہو سکتی ہے جب کسی شعیرہ کی ادائیگی کے وقت آدمی اس معنویت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے جو اس کے اندر مضمر ہے۔

افسوس ہے کہ اب تک حجاج کو حج کی حقیقت سمجھانے کے سلسلہ میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ عام طور پر حج پر جو رسائل لکھے گئے ہیں، ان میں بھی مناسکِ حج کے طریقے اور ان کے احکام بیان کر دیے گئے ہیں کہ طواف کس طرح کرنا چاہیے اور سعی کا کیا طریقہ ہے؟ ان مناسک کی حکمت اور ان کے فلسفہ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ حرم میں حج سے متعلق جو تقریریں ہوتی ہیں وہ بھی زیادہ تر حج کے ظاہری احکام و آداب ہی سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان احکام کی روح اور ان کی غایت سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ اہلِ علم اس شدید کمی کا احساس کریں اور حج کے اسرار و فلسفہ پر ایسی کتابیں لکھیں جو لوگوں کو حج کے باطن کی طرف متوجہ کر سکیں۔ اس چیز کی ضرورت

یوں تو ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن اس زمانے میں اس چیز کی اہمیت خاص طور پر اس وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے کہ یہ دور غفلت کا دور ہے۔ موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ لوگ اول تو دین کی طرف مائل ہی بہت کم ہوتے ہیں اور اگر مائل ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کے اندر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دین کے ہر حکم کی علت اور فلسفہ کو سمجھیں۔ دین کے خادموں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کی اس تشنگی کو دور کرنے کا سامان کریں۔